مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن ـ عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ ۱۵ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

جلد ۱۲۰ ماہ جنوری ۱۹۷۷ء مطابق محرّم الحرام ۱۳۹۷ھ عدد ۱

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

آہ! مولانا عبدالماجد دریابادی

معارف کے زیرِ نظر شمارہ کی کتابت ہو چکی تھی کہ فخرِ روزگار، یگانۂ وقت، مجاہد العلم، رئیس القلم اور دار المصنفین کی مجلسِ ارکان کے صدر نشین مولانا عبدالماجد دریابادی کی رحلت کی اچانک خبر ریڈیو سے سنی تو ع عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

ان کی زندگی کی شاندار کتاب ختم ہو گئی جس کا ہر ورق اپنی گوناگوں خوبیوں سے مزین رہا، یہ عاجز راقم گذشتہ ۴۴ سال سے ایک ادنیٰ خورد کی حیثیت سے انکی بزرگانہ شفقت اور علمی جلالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا رہا، اس مدت میں انکی زندگی کی جو سرگرمیاں رہیں وہ متحرک تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے گھوم گئیں

گل و آئینہ کیا، خورشید و مہ کیا   جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

کیننگ کالج لکھنؤ سے بی، اے کرنے کے بعد ان کی زندگی کا آغاز الحاد و بے دینی کی وادی کی سیر سے ہوا، مگر یہیں ان کی نظر شعلۂ طور بنکر چمکی جس کے بعد وہ توحید اور رسالت کے ایسے داعی اور مبلغ بنے کہ سند یافتہ عالم نہ ہونے کے باوجود باوقار عالم تسلیم کیے گئے، اچھے اچھے علماء انکے سامنے جھکے، کبھی علماء کی مجلس کے سرخیل بھی منتخب ہوئے اور ان کا خاتمہ بالخیر کلام پاک کے مفسر اور شارح کی حیثیت سے ہوا، انھوں نے اردو اور انگریزی میں جو تفسیر لکھی ہے اس میں اسرائیلیات کی فتنہ سامانیوں اور توریت و انجیل کی تحریفات کی شر انگیزیوں کی رازکشائی میں جو دیدہ وری اور نکتہ وری دکھائی ہے، اس سے کلام پاک کے مفسروں میں اُن کا مقام ہمیشہ نمایاں رہے گا، ان کی یہ تفسیر گنجینۂ معارف و تحقیق بھی سمجھی جاتی رہے گی

وہ کچھ دنوں تک فلسفی بھی رہے، اُن کی فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع انکی ابتدائی دور کی تصانیف ہیں، جن کے بعد انکی مبادی فلسفہ کی دو جلدیں فلسفہ اور اسکی تعلیم، ہم اور آپ بھی نکلیں،

ان کے فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا، اور جب اردو کا خالی دامن انکے فلسفیانہ خیالات سے پُر ہو رہا تھا تو انھوں نے فلسفہ کے چناں و چنیں سے منہ موڑ کر اقبال ہی کی طرح پیر رومؒ کو اپنا معنوی مرشد قرار دیا، اسلامی تصوف اور فیہ ما فیہ لکھکر راہ سلوک کے ایک پُر جوش سالک بن گئے، مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت بھی ہوئے، مگر حکیم الامت لکھکر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تعلیمات کے اسرار و رموز کے شارح بنے جس کے بعد ع جس طرف کو لے چلا رہبر چلے۔

وہ بڑے اچھے مترجم بھی تھے، انگریزی سے اردو میں برکلے کے مکالمات، لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ بکل کی تاریخ تمدن، سیوپال کی پیام امن کے ترجمے کیے، انکے ترجمے میں اصل کتاب ہی کی لذت اور کیفیت محسوس ہوتی ہے، ان کتابوں سے یورپ کے تہذیب تمدن سے واقف ہوئے تو ان سے متاثر ہونے کے بجائے ان کو یاجوجی تمدن اور دجالی فتنہ قرار دیا، وہاں کی فحاشی، عریانی، رندی اور بے راہ روی پر اپنی مختلف تحریروں سے ایسی کاری ضربیں لگاتے رہے کہ جن لوگوں نے ہندستان کو یورپ کی تمدنی فریب کاریوں سے بچایا ہے ان میں ان کا نام بھی نمایاں طور پر لیا جائے گا۔

وہ اردو تنقید نگاری کے ایک خاص رنگ کے امام بھی رہے، اردو شعر و ادب کی رمز شناسی میں ان سے شاید ہی کوئی سبقت لیجا سکا، لکھنوی تہذیب کے ساتھ لکھنؤ کی شاعری اور اسکے نثری اسلوب کے بڑے دلدادہ تھے، زہر عشق، مرزا رسوا اور گل بکاؤلی پر ان کے تبصرے انکے نقادانہ دقت نظر کے شاہکار ہیں، غالب کو ایک فلسفی کے بجائے ہر بات کو حکیمانہ انداز میں کہنے والا شاعر، مرزا شوق کو ایک بدنام شاعر حالی کو ایک واعظ شاعر، اکبر الہ آبادی کی شوخی اور دل لگی کو ایک نیا آئین اکبری، شکوہ والے اقبال کو صاحب حال اور سالک اور جواب شکوہ کے اقبال کو صاحب مقام اور عارف لکھکر نقادوں کے ذہن کے لیے نئے دریچے کھول دیے۔

وہ اپنے زمانہ میں اردو کی انشا پردازی کے بھی امام رہے، وہ اپنے طرز کے موجد اور خاتم تھے

شبلی، مہدی افادی اور سید سلیمانؒ کے انداز بیان کے بڑے پرستار اور قدردان تھے، مگر اپنے طرز نگارش میں کسی کی تقلید پسند نہیں کی، بالکل منفرد اور غیر مقلد رہے۔ ان کی تحریروں میں جہاں تندی صہبا، موجِ خرام یار، نکہتِ بادِ بہاری، اور فکری لالہ کاری ملے گی وہاں کج رو حریفوں کے مقابلہ میں سانپ کی پھنکار، بچھو کا ڈنک اور خنجر کا وار بھی ہے، وہ اپنے مخالفوں کے خلاف اپنے قلم سے صف شکن یلغار اور مرد افگن یورش کرکے اپنی انشا پردازی کا جوہر دکھاتے، اپنے عزیز دوستوں اور محبوب معاصروں کی موت پر ماتم کرتے تو اس میں دلسوزی، عقیدتمندی اور وفاکیشی کے ساتھ انکے قلم کی رعنائی، شگفتگی اور رنگینی کی پوری بہار آفریں قوس قزح نظر آتی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالماجد بدایونی، نواب بہادر یار جنگ، سید سلیمان ندوی اور حکیم عبدالحمید لکھنوی پر انکی ماتمی تحریروں میں انکے زور بیان کے ساتھ اثر، تاثیر، اخلاص، محبت اور درد کے جھلملاتے جواہر ریزے نظر آتے ہیں، انکے مضامین کے مجموعے انشائے ماجدی میں جمع کردیے گئے ہیں جو ہر زمانہ میں بلاغت کی سحرکاری، فصاحت کی تازگی اور سلاست کی پرکاری کے لحاظ سے اردو ادب کے شہ پارے بنے رہیں گے، یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی زبان کا بانکپن اور رسیلا پن دکھانے والا سفر حجاز اور تفسیر کی زبان لکھنے میں کس قدر باوقار، باوزن اور متین ہوگیا ہے۔

انھوں نے سچ اور صدق نکالکر اپنے کو شیر دل بلکہ کفن بر دوش صحافی بھی ثابت کیا، حکومت کا دبدبہ، قانون کا شکنجہ، انقلاب کا کوئی ہچکولا ان کے قلم کی آزادی کو نہ روک سکا، مسلمانوں کے غمخوار، غمگسار اور دمساز بنکر انکے سیاسی المناک حوادث پر خون کے آنسو روئے، انکی سیاسی کامیابی اور فتح پر اپنی مسرت وشادمانی کا اظہار دل کھولکر کیا، خواہ انکی یہ تحریریں حکومت کی پالیسی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتیں، سچ اور صدق جدید میں سچی باتیں لکھکر ایمان، ایقان اور عرفان کے موتی بکھیرتے رہے، اس انداز کی تحریر اب مدت مدید تک کوئی اور نہ لکھ سکے گا، اسی کے ساتھ اسلامی طرز فکر کی راہ چھوڑنے والوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اترتے، کردار کو نیلام کی بولی پر بھینٹ چڑھانے

والوں کے نہاں خانے میں پہنچکر شبخوں مارتے، اپنی تحریروں کی ناوک فگنی سے تجدد پسندوں کے کلیجوں کو چھلنی کرتے رہے، انکے اخبار کا ایک شعر، ایک جلی سرخی، ایک زہریلا فقرہ انکے حریفوں کیلئے پورے مضمون پر بھاری پڑ جاتا۔

ان کا چھوٹے سائز کا ہفتہ وار اخبار سچ یا صدق جدید کل آٹھ صفحے پر مشتمل ہوتا، اسکو شروع سے آخر تک خود ہی لکھتے جو انکے قلم کی صاعقہ پاشی کی دلیل ہوتی، اس میں کبھی تو واعظ کبھی فقیہ کبھی مجتہد، کبھی مرد مومن کبھی مفسر قرآن کبھی متکلم اسلام کبھی نقاد کبھی سیاسی مبصر اور ہاں کبھی قلم کے افراسیاب، کبھی اسلوب کے جمشید اور کبھی زور بیان کے رستم بنجاتے، وہ اپنی آخر عمر میں خوش ہوں گے کہ علم، ادب اور فن کا ایک انبار نہیں بلکہ گل و گلزار لگا کر زندگی ختم کر رہے ہیں۔

وہ خلافت تحریک میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا محمد علیؒ کے اصرار سے شریک ہوئے، مگر کبھی سیاسی رہنما ہونے کے دعویدار نہیں ہوئے، البتہ علی برادران کی طرح جو کھدر کا کرتہ اور پائجامہ اور جبہ پہنا تو آخر عمر تک پہنتے رہے، مولانا محمد علی کے نام پر جان چھڑکتے رہے، انکی یاد میں محمد علی کی ڈائری کے نام سے جو دو جلدیں لکھی ہیں ان میں انکے نہ صرف دل و جگر کے ٹکڑے بلکہ انشا پردازانہ کمالات کے سارے جلوے نظر آتے ہیں، مولانا محمد علی پر ان دونوں جلدوں سے بہتر ابتک کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی،

دارالمصنفین کی اکسٹھ سالہ زندگی کے ہر نشیب و فراز میں اسکے ہمدم اور ہمراز بنے رہے، شروع میں اسکی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، پھر اسکی مجلس ارکان کے صدر بھی ہوگئے، اسکا شاید ہی کوئی ایسا جلسہ ہوا ہو جس میں انکی شرکت نہ ہوئی ہو، آخری بار گذشتہ نومبر میں انکی علالت کے زمانہ میں ملنے گیا تو رخصت کرتے وقت فرمایا کہ خدا کرے دارالمصنفین کے آیندہ جلسہ میں پھر حاضری کا موقع ملجائے، وہ یہاں تشریف لاتے تو تمام لوگ انکے سامنے مودب بیٹھتے، سید صاحب سے وہ عمر میں بہت چھوٹے تھے، مگر وہ انکا بڑا احترام کرتے، ان کو کوئی خط لکھتے تو اس احترام کو برقرار رکھتے، خود وہ سید صاحب کی بڑی عزت بلکہ ان سے بڑی محبت کرتے، جب کبھی ان پر کوئی مضمون لکھا، انکا قلم بہت ہی رواں اور شگفتہ ہوگیا، مولوی مسعود علی ندوی سے انکی بڑی

بے تکلفی رہتی، وہ طبعاً بہت ہی متین، سنجیدہ اور خاموش تھے، کسی مجلس میں مشکل سے کچھ بولتے، مگر مولوی مسعود علی ندوی سے باتیں کرتے تو عندلیب شیوا بیان بن جاتے، صدق میں ان سے کسی سے قلمی جنگ شروع ہو جاتی تو سید صاحب فرماتے کہ ان کے گوریلا جنگ کے خلاف کسی کا کامیاب ہونا آسان نہیں، سید صاحب کے بعد وہ دارالمصنفین کے علمی محتسب بھی بن گئے تھے، معارف اور یہاں کی نئی تصانیف ان کی خدمت میں ضرور بھیجی جاتیں، زبان اور انداز بیان میں کوئی فروگذاشت ہو جاتی تو اسکی طرف توجہ ضرور دلاتے اور جو چیز پسند آجاتی اسکی تعریف دل کھولکر کرتے، افسوس دارالمصنفین اپنے ایک بڑے علمی محتسب سے محروم ہو گیا۔

ان تمام اوصاف کے ساتھ ان کا ایک بہت بڑا وصف یہ بھی تھا کہ انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ اسلامی حمیت کی دیدبانی، اسلامی شعار کی پاسبانی اور ملی غیرت کی رجز خوانی کی، انکی تفسیر کیساتھ ان کا وہ سوز نہاں اور درد پنہاں جو انکے دل میں اسلام کیلیے رہا، انکا توشۂ آخرت بنے گا، ان ہی کی بدولت جنت کے رضوان نے انکا خیر مقدم کیا ہوگا اور حوریں پیشوائی میں شراب طہور کا مینا و ساغر لے کر بڑھی ہوں گی،

ان سطروں کے لکھتے وقت اخبار سے معلوم ہوا کہ ان کے جنازہ کی نماز ندوۃ العلماء کے احاطہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، مولانا علی میاں سے تو وہ محبت نہیں بلکہ عشق کرتے، ندوہ سے بھی انکو غیر معمولی لگاؤ رہا، ندوہ میں مولانا علی میاں نے انکے جنازہ کی نماز پڑھا کر اپنا فرض اور قرض دونوں ادا کیا، یہ راقم بخار میں مبتلا تھا، اسلیے تعزیت میں نہیں پہنچ سکا لیکن جنازہ کی شرکت کیلیے ایک سہ رکنی وفد دارالمصنفین کی طرف سے بھی گیا، دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ سطریں بستر علالت ہی پر سے قلمبند کیجا رہی ہیں۔ ؏ اے نالہ! نشان جگر سوختہ کہاں ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے، مگر مولانا سپرد خاک ہوئے تو انکے سینہ میں علم کی جو ہمہ گیری، قلم کی جو صناعی، تحریر کی جو برق وشی، علم و عرفان کی جو فرمانروائی، اور اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر جو قلمی سرفروشی اور جانبازی تھی، وہ بھی ان کے ساتھ تہ خاک ہو گئی، عالم بقا کے مسافر! تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت، اسلامی روایات کی تیری حدی خوانی پر رحمت، تیرے قلم کی اس گوہر گنی پر رحمت جس سے جوئے تفسیر اسلامیہ بہتی نظر آتی، الوداع، السلام، تو جا چکا، مگر تو زبان حال سے کہتا گیا ؎

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مقالات

شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی

از
پروفیسر سید حسن پٹنہ

(۲)

جب خواجۂ انصار پھر وطن واپس آئے تو دشمنوں کی دسیسہ کاری پھر تیز ہوگئی، سلجوقی ہرات پر قابض ہو چکے تھے اور جنگ و جدل کے ہنگامے بھی سرد پڑ چکے تھے، خواجہ کے دشمنوں نے اس مرتبہ ان کے خلاف علانیہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ ان کا ہرات میں موجود رہنا فتنہ کا سبب ہوگا، لہٰذا انھیں شہر سے باہر چلا جانا چاہئے، دشمنوں کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی اور خواجہ کو پھر وطن ترک کرنا پڑا، اس مرتبہ بھی وہ تسکیوان چلے گئے لیکن چند ماہ کے بعد ہی سال ۴۳۶ھ کے آغاز میں ہرات کو مراجعت کی اور پھر تدریس و تعلیم میں مشغول ہو گئے، لیکن اس دفعہ انھوں نے اپنا موضوعِ تدریس بدل دیا، اس سے قبل وہ حدیث کا درس دیا کرتے تھے لیکن اب انھوں نے پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کو اپنے درس کا موضوع بنایا، جس طرح وہ حدیث کی تدریس میں شریعت کی باتیں بتایا کرتے تھے، تدریس تفسیر کلام اللہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا، اس کے علاوہ انھوں نے اپنی مجلسوں میں اہلِ بدعت کے خلاف تقریر کرنا ترک نہیں کیا تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ معتزلہ اور اشاعرہ نے باہم متفق و متحد ہو کر ان کو آزار پہنچانے کی کوشش شروع کی اور اپنے

مقصد میں وہ اس حد تک کامیاب ہو گئے کہ خواجہ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر انھیں پوشنگ کے نزدیک ایک زندان میں مقید کر دیا۔

خواجہ ہرات میں ایک سال تک زندانی رہے، اس مدت میں انھیں اپنی زندگی اور اعمال کے بارے میں غور و فکر کرنے کی مہلت ملی، اس دوران میں انھیں اپنے والد، اپنے استاد خواجہ طاقی اور شیخ ابوالحسن خرقانی کی برابر یاد آتی رہی جنھوں نے ان کے افکار و عقائد کو زبردست طریقے پر متاثر کیا تھا، ان تینوں بزرگوں کی یادیں اور باتیں ان کے دل و دماغ پر اس طرح چھائی ہوئی تھیں کہ جن محدثین، مفسرین، فقہا اور علما سے ان کی ملاقاتیں ہوئی تھیں وہ سب اُن کی یاد سے تقریباً محو ہو گئے تھے، انھوں نے اس بات کا عزم کر لیا کہ وہ آیندہ اپنے اعمال اور تدریس و ارشاد میں اصل کی طرف متوجہ رہیں گے، اگرچہ انھیں یہ بھی خیال بار بار آتا تھا کہ ان کے تلامذہ اسرار تصوف کو سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے، لیکن انھوں نے اپنے سے سوال کیا کہ آیا شاگردوں اور مریدوں کی خامی کا خیال کر کے صرف شریعت کی تدریس پر اکتفا کرنا درست ہوگا؟ اس کے جواب میں وہ اپنے دل کو سمجھا لیتے تھے کہ قرآن بندہ کی رہنمائی محبت کی طرف کرتا ہے اور ایمان سنت اور رسول کی پیروی اس محبت میں شامل ہے، لہذا جب وہ ۴۳۹ھ میں پوشنگ کے قید خانہ سے رہائی پا کر ہرات واپس آئے اور تفسیر کا درس دینا شروع کیا تو بہت جلد اس آیت کریمہ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ کی تفسیر تک پہنچ گئے، انھوں نے اپنی عمر کا خاصا حصہ اس آیت کی تفسیر میں گزارا، وہ نئے طرز تقریر و تفسیر میں اس قدر سرگرم ہوئے کہ مدت تک مخالفین سے مناظرہ کرنا ترک کر دیا اور اس وجہ سے وہ بھی مخالفت سے باز رہے۔

ملک ہنوز سیاسی استحکام اور امن سے کوسوں دور تھا، سلطان مسعود کا فرزند اور جانشین سلطان مودود غزنوی اس کوشش میں تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی شہنشاہیت واپس لے لے،

لیکن وہ عین شباب میں جبکہ اس کا سن انتیس ۲۹ سال تھا، ۴۲۱ھ میں فوت ہوگیا، اس کے بعد کئی بادشاہ غزنین کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے، لیکن ہر ایک مختصر مدت کے لیے حکمرانی کرکے یا تو وفات پاگئے یا قتل ہوئے، غزنوی بادشاہوں کی طاقت زائل ہوچکی تھی، اُدھر سلجوقیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، ان کی پیش قدمی کو روکنا محال تھا، ان کے سرداروں میں سے ایک نے بنام داؤد سلجوقی بلخ کو مسخر کیا اور دوسرے نے بنام بیغو ہرات پر تسلط حاصل کرلیا۔

اس دوران میں اگرچہ مخالفین کی طرف سے پیرِ ہرات کو کچھ اطمینان ہوگیا تھا لیکن انھیں دوسری قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، ۴۲۱ھ میں شیخ عمو کی وفات ہوگئی جنھوں نے بچپن سے ان کی نگرانی و پرورش کی تھی، اور خواجہ کے والد ابومنصور کے بلخ کو چلے جانے کے بعد انھیں سہارا دیا تھا، شیخ عمو کی موت سے خواجہ ہرات بے یار و مددگار ہوگئے، ان کی مالی حالت نہایت خراب تھی، شیخ عمو ان کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے، ان کے نہ رہنے کی وجہ سے خواجۂ ہرات کو فقر و فاقہ کی نوبت آگئی، گھر کا اثاثہ فروخت کرکے غذا مہیا کرتے تھے، یہاں تک کہ دروازوں کی میخوں اور زنجیروں کو بھی بیچنا پڑا، بعض دن فاقہ میں گذر جاتا تھا، ان کی تنگدستی و بینوائی کی یہ حالت تھی کہ سخت سردیوں میں بھی ان کے پاس پہننے کو کپڑا نہیں ہوتا تھا، جامی نے نفحات الانس میں ان کی اس حالت کو خواجہ کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے:۔

"من بہ زمستان جُبہ نداشتم، و سرما می عظیم بود، و در ہمہ خانۂ من بوریائی بود کہ بر آن خفتمی و نمد پارہ کہ بر خود پوشیدمی و اگر پای را پوشیدمی سر برہنہ شدی خشتیکہ بر زیر سر نہادمی و میخنکیہ کہ جامۂ مجلس بر دو کردمی و بیاویختمی!"

فقر و فاقہ کی اس حالت میں بھی وہ کسی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے، جامی نے

اس طرح کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے :۔

"شیخ الاسلام گفت، من بمرد بودم وہیچ چیز نداشتم، سائلی چیزی خواست اندیشیدم کردی را چہ دہم؟ مرا ہیچ چیز نبود، از دنیا مگر کاروکی کہ بدآں قلم می تراشیدم بیاوردم و بہ وی دادم"

حالانکہ شیخ انصار کے کئی دوست مالدار و ثروتمند تھے، لیکن انھوں نے اپنے دوستوں پہ اپنی بینوائی و محتاجی ظاہر نہیں کی، خود ان کو بھی خواجۂ ہرات کی حاجتمندی کی خبر نہ ہوئی، البتہ ایک دن ان کا ایک دوست ان کے یہاں آیا تو خواجہ کی حالت دیکھ کر بہت متعجب ہوا اور رونے لگا، پھر سر سے دستار اتار کر ان کے سامنے رکھ دیا اور چلا گیا،

شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ کو دین کی شوکت و وقار کا بہت خیال رہتا تھا، عُسرت اور مفلسی کے زمانے میں بھی وہ تدریس و تعلیم کے وقت اچھا لباس پہننا ضروری سمجھتے تھے، مجلس سے واپس آکر وہ اس "جامۂ مجلس" کو دیوار پر میخ سے لٹکا دیتے تھے، اگر کبھی اچھا لباس خود اپنے پاس نہیں ہوتا تو کسی دوست سے عاریتًہ لے لیتے تھے،

اگرچہ خواجۂ ہرات نے تقریبًا دس سال بڑے مصائب میں گذارے، ہرات سے جلاوطنی، قید زنداں، مخالفین کی دسیسہ کاریاں، اس کے بعد بینوائی و محتاجی لیکن انھوں نے غم واندوہ کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا، اور برابر تذکیر و تقریر میں مشغول رہے، البتہ کبھی کبھی اندوہ گیں ہو جاتے تھے لیکن خداوند تعالیٰ پھر ان میں جرأت و ہمت پیدا کر دیتا تھا، ایک بار وہ اپنے گھر کے دروازے پر کسی امر کے متعلق اندیشناک بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک تیز ہوا چلنے لگی، اور کاغذ کا ایک ٹکڑا دروازے کے پاس آگرا جس پر سرخ روشنائی سے تحریر تھا "فرج، فرج" یعنی کشائش، کشائش۔

سال ۴۴۵ ہجری کی ابتدا میں سلطان طغرل بیگ سلجوقی نے یہ فرمان جاری کیا کہ اہل بدعت کو جن میں اشاعرہ بھی شامل تھے، تعلیم و تدریس سے روک دیا جائے، ان کے مکتبوں پر پابندی لگا دی جائے اور مساجد کے منبروں سے ان کی گمراہی کا اعلان کیا جائے، اس فرمان کے جاری کرانے میں درحقیقت سلطان طغرل بیگ کے وزیر عمید الملک ابو نصر کندری کا ہاتھ تھا، جو شخصاً اشعریوں کا مخالف تھا، اس کے علاوہ کرسی وزارت حاصل کرنے میں ایک اشعری ابو سہل ابن الموفق سے رقابت وچشمک رکھتا تھا، سلطان کے اس فرمان سے بہت سے لوگوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا، حتیٰ کہ بہت سے ایسے لوگ بھی جو اپنے کو اہل سنت کہتے تھے اور معتزلیوں اور حنبلیوں سے اختلاف رکھتے تھے (کیونکہ بعض حنبلیوں پر خداوند تعالیٰ کو صفاتِ بشری سے مجسم کرنے کا الزام عاید کیا گیا تھا) اس فرمان کی زد میں آگئے، سرکاری حلقے شوافع کو بھی سزا دینے لگے تھے، اور انھیں تدریس سے روک دیتے تھے، ابو سہل ابن الموفق نے سلطان سے چارہ جوئی کی کوشش کی لیکن بے سود، نیشاپور کے مکتبوں کے بہت سے معلمین قید کر دیے گئے، عوام الناس نے ابو القاسم قشیری کے مکان پر حملہ کیا اور انھیں پکڑ کر قلعہ میں بند کرا دیا، خود ابن الموفق نے رے جا کر سلطان کے پاس اشعریوں کی بیگناہی ثابت کرنا چاہی لیکن اس کا اثر الٹا ہوا، اسے قید کر دیا اور اس کا مال ضبط کر لیا گیا، اشعریوں نے جب یہ دیکھا کہ سلطان کو وہ ارادے سے بدل نہیں سکتے، تو انھوں نے قلم کا سہارا لیا، ابو القاسم قشیری نے اشاعرہ پر جو الزامات تھے ان کی تردید میں ایک رسالہ بنام "الشکایۃ اھل السنۃ بحکایۃ ما نالھم من المحنۃ[1]" لکھا جو سارے اسلامی ممالک میں نشر کیا گیا،

---

[1] ابن عساکر نے تبیین جلد ہشتم میں اس رسالے کے متعلق یہ لکھا ہے کہ قشیری نے اشعریوں کے عقائد کی شرح کرتے ہوئے اس الزام کو رد کیا ہے کہ اشعریوں کا پانچ عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر موت کے بعد پیمبر نہیں رہتا، مکافات و مجازات خداوندی بندوں کے فرمانبر ونافرمان ہونے پر موقوف نہیں ہے، موسیٰ علیہ السلام نے ندائے ربانی

(باقی ص ۱۰ پر)

امام ابوبکر بیہقی نے بھی اسی قسم کے خطا بونصر کندری کو لکھے لیکن ان کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں، آخر وہ تھک کر آیندہ موقع کے انتظار میں خاموش ہو گئے۔

اہل بدعت خصوصاً اشاعرہ کے خلاف جو اقدامات عمل میں آئے، ان سے پیر ہرات کو بڑی خوشی اور تسکین ہوئی کہ ان کے دشمنوں کو جلا وطن اور قید کیا گیا، اب وہ پورے سکون کے ساتھ مجلس تدریس میں ذکر و تفسیر میں مشغول رہنے لگے، ان کی بزرگی کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیل گئی تھی، ۴۵۰ھ میں جو اہل علم اصحاب ہرات سے گزرتے تھے وہ ان کی ملاقات کو آتے تھے، منجملہ ان کے دو شخص تو ان کی دیدار کے بہت ہی مشتاق تھے، ایک تو ابو الحسن باخرزی جو ایک ادیب شہر ابو عاصم فضیلی کی رہبری میں خواجہ کی ملاقات کو گئے اور ان کی قوت تقریر اور انداز تفسیر سے بہت متحیر ہوئے، دوسرے شخص جو خواجۂ ہرات کے دلدادہ و فریفتہ ہوئے وہ تھے ابو القاسم زوزنی جو بارع[1] کے نام سے مشہور تھے، باخرزی کی عمید الملک ابو نصر کندری سے دوستی تھی، اس واسطے سے خواجۂ ہرات سے بھی ارتباط پیدا ہو گیا تھا۔ ۴۶۴ھ میں ابو العلا صاعد ابن سیار کو ہرات کا منصب قضا تفویض ہوا، یہ شخص حنبلی مسلک کا پیرو تھا، اس وجہ سے خواجہ ہرات سے دوستی پیدا ہو گئی، ایک دن قاضی ابن سیار نے خواجۂ ہرات کو دعوت دی تھی اور اپنے بائیں جانب بٹھایا، جو مقام احترام ہوتا ہے، داہنی طرف ایک دوسرا مہمان تھا، جو بو سعد نیشاپوری کا شاگرد تھا، یہ شخص کچھ متکبر و خود پسند تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۹) سنی تھی، کلام اللہ وہ نہیں ہے، جس کی وقایہ مصحف میں شیرازہ بندی کی گئی ہے، عوام کا فر ہیں۔ یہ پانچوں عقیدے ناحق اشاعرہ کے سر تھوپ دیے گئے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ابو القاسم البارع محدث بھی تھے، نیشاپور اور بغداد میں زندگی بسر کی۔ پیری میں ۴۵۲ھ میں فوت ہوئے۔

اور بدتمیزی سے باتیں کرتا تھا، خواجہ کو اس کی بات بری لگی، وہ الگ ہٹ گئے اور بولے:۔

"پیاز خوردن را چشم تیز باید، چوب شکستن را بازوی قوی گر در صدر مجلس نشستن

را جز دانش چیزے نباید!"

قاضی ابن سیار کو بھی اس مہمان کی بات پسند نہ ہوئی اور کہا "کس چیز سے تمھیں انکار ہے، یہی نا کہ ان کے پاس لباس اور گھوڑا نہیں ہے" یہ کہکر انھوں نے خواجہ ہرات کو قبا اور گھوڑا عطا کیا اور مسجد جامع ہرات میں ایک کرسی[1] و مقام بھی مقرر کر دیا، اس دن سے خواجہ ہرات کی مجلسیں اسی مقام پر منعقد ہوتی تھیں اور وہ اس کرسی پر بیٹھ کر تقریر کرتے تھے،

خواجۂ ہرات کے مجالس تذکیر و ارشاد کی روز افزوں شہرت اور ابونصر گسندری وقاضی ابن سیار سے ان کے ارتباط و دوستی کو دیکھ کر خواجۂ انصاری کے دشمنوں کو بڑی پریشانی لاحق ہو گئی تھی، حالات ایسے تھے کہ ان کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے تھے، اس لیے ان کے دلوں میں غم و غصہ و بغض و عداوت کی آگ سلگتی رہتی تھی، حالات کے مساعد ہونے کے منتظر تھے، اتفاقاً سیاست میں ایسا الٹ پھیر واقع ہوا کہ انھیں خواجۂ ہرات سے انتقام لینے کا موقع مل ہی گیا، سنہ ۴۵۰ھ کے اواخر میں داؤد سلجوقی کا بیٹا الپ ارسلان ہرات سے گذرا، وہ سلطان طغرل بیگ کی طلب پر اس کی مدد کو جا رہا تھا، کیونکہ طغرل بیگ کے بھائی ابراہیم انیال نے بغاوت کر دی تھی، الپ ارسلان ان لوگوں کا سخت مخالف تھا، جو خدای تعالیٰ کو صفاتِ انسانی سے مجسم بتاتے ہیں، مخالفین خواجہ نے کوشش کی کہ ان کی مجلس کو بند کرا دینے کا ایک فرمان الپ ارسلان سے حاصل کر لیں، لیکن اس وقت الپ ارسلان ایک مہم پر جا رہا تھا، اور اس قسم کی مذہبی جنگ میں مشغول ہونے کی اسے فرصت نہیں تھی،

---

[1] یہ کرسی جو بہت اونچی نہ تھی اور جس پر خواجہ ہرات بیٹھکر وعظ کہتے تھے، محفوظ کر دی گئی تھی اور لوگ اسکی زیارت کو آتے تھے۔

اس لیے خواجہ کے دشمنوں کی کوشش اس وقت رائگاں گئی، لیکن ۴۵۵ھ میں طغرل بیگ کی موت ہوگئی اور الپ ارسلان اس کا جانشین ہوا، ایک بات پر ابونصر کندری وزیر سے ناراض ہوکر اسے معزول کرکے نظام الملک طوسی کو منصبِ وزارت پر فائز کردیا، جو شافعی مسلک کا پیرو تھا، قلمدانِ وزارت سنبھالتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اشعریوں کے خلاف کندری نے جو فرمان صادر کیا تھا اسے فسخ کرنے کا حکم جاری کردیا، چنانچہ جو اشعری اپنے وطن سے دور کردیے گئے تھے وہ واپس آگئے اور تبلیغ و تدریس میں پھر مشغول ہوگئے۔ نظام الملک نے دوسرا کام یہ کیا کہ ۴۵۷ھ میں بغداد میں مدرسۂ نظامیہ قائم کردیا، جہاں اصولِ اشعری کے مطابق مذہب شافعی کی تدریس ہونے لگی، اسی قسم کے اور مدارس بھی بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان بصرہ، مرو، آمل، موصل وغیرہ میں قائم ہوئے، غرض یہ کہ اشعریوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع نصیب ہوگیا، یہ سمجھ کر کہ نظام الملک اشعری عقیدے کا حامی ہے، انھوں نے یہ کوشش کی کہ خواجۂ انصاری کی مجلسوں پر پابندی لگا دی جائے، لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہوئے، ۴۵۶ھ میں الپ ارسلان مرو جاتے ہوئے راستے میں ہرات بھی آیا، نظام الملک طوسی بھی ساتھ تھا، مخالفین خواجہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس سے خواجۂ انصاری کی شکایت کی اور یہ درخواست کی کہ وزیر کے سامنے ایک مناظرہ ہو، انھیں اپنی کامیابی کا اسقدر یقین تھا کہ یہ شرط باندھی کہ اگر خواجہ عبداللہ مناظرہ میں غالب آجائیں تو یہ لوگ انکی پیروی کریں گے اور اگر غلبہ انھیں حاصل ہو تو خواجہ کے لیے ان کے عقائد کو تسلیم کرلینا ضروری نہیں ہوگا، البتہ آیندہ وہ مخالفت ترک کردیں گے اور خاموشی اختیار کرلیں گے جب خواجہ عبداللہ وزیر کے سامنے حاضر ہوئے اور انھیں اس مناظرہ اور شرائط کی اطلاع ملی تو جوش میں آکر بولے "میں مناظرہ ان چیزوں کے ذریعے کروں گا جو میری آستینوں میں ہیں"

نظام الملک نے پوچھا "آخر آپ کی آستینوں میں کیا چیزیں ہیں؟" خواجہ انصاری نے اپنی داہنی آستین کی طرف اشارہ کرکے جواب دیا "کتاب اللہ"، پھر بائیں آستین کیجانب اشارہ کیا اور کہا اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!" ان کی داہنی آستین میں قرآن اور بائیں آستین میں صحیحین تھیں، جواب دیکر خواجہ نے اپنے مخالفین کی طرف نظر ڈالی، مطلب یہ تھا کہ بتاؤ کہ تمھارے پاس کیا ہے؟ یہ لوگ خاموش رہے، کیونکہ ان میں سے کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ قرآن و حدیث کے ذریعے خواجہ انصاری کے ساتھ مناظرہ کرے،

مخالفینِ خواجہ بر وقت تو خاموش و لاجواب ہو رہے لیکن ان کی ریشہ دوانیاں کم نہ ہوئیں اور خواجہ انصاری کو ان سے مقابلہ و مدافعت کرنے کے لیے اور زیادہ سرگرم و آمادہ ہونا پڑا، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مخالفین کی ترقی سے دین اسلام کو سخت خطرہ پیدا ہوگیا تھا، وہ اپنی مجلسوں میں مخالفین کے عقائد کے خلاف اور زیادہ جوش سے تقریریں کرنے لگے، اور اس کے علاوہ ان کے رد میں متعدد رسالے بھی لکھ ڈالے، اشعریوں نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر حکومت کی طرف رجوع کیا اور خود نظام الملک نے جب وہ مرو میں تھا خواجہ انصاری کے بارہ میں غلط بیانی کرکے اس سے خواجہ انصاری کے ہرات سے اخراج کا فرمان حاصل کرلیا، انھیں یہ حکم ہوا کہ ہرات سے بلخ چلے جائیں۔ ہرات سے بلخ کا سفر بڑی تکلیف میں طے ہوا کیونکہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں لیکن ان کے لیے اطمینان و خوشی کی بات یہ ہوئی کہ ان کے شاگردوں اور مریدوں نے اس سفر میں ان کا اس طرح ساتھ دیا کہ انھیں گھوڑے پر سوار کرنے کی بجائے ان کے لیے ایک محمل تیار کیا اور اسی میں انھیں بٹھا کر اپنے کاندھوں پر اٹھا کر لے چلے، بلخ تک اسی طرح چار چار نفر باری باری سے محمل اپنے کاندھوں پر اٹھا کر چلتے رہے۔ بلخ میں ایک دوسری مصیبت

نازل ہوئی، وہ یہ کہ وہاں کے معتزلیوں نے خواجہ انصاری کو سنگسار کرنے کے واسطے سنگریزے جمع کر لیے تھے، اس زمانے میں نظام الملک کا بیٹا جمال الملک بلخ کا عامل تھا، جب اس کو معتزلیوں کے اس ارادے کی خبر ملی تو وہ فوراً ان کے درمیان آگیا اور انھیں بہت ملامت کی کہ ایک دانشمند کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنا مناسب نہیں ہے، ان لوگوں نے کہا کہ خواجہ انصاری کو کچھ بولنے کو کہیئے، خواجہ انصاری نے ان کے کہنے سے لب کشائی کی اور یہ آیت تلاوت کی:۔

اللہ نزّل احسن الحدیث کتابا متشابھا (سورۂ زمر آیت ۲۳)

اور اس کی تفسیر بیان کی جس میں انھوں نے غورچہ، غرجستان وفلانہ وتالقان کے معتزلیوں پر لعن وطعن کیا لیکن بلخ کے لوگوں کا تذکرہ اس مصلحت کی بنا پر نہیں کیا کہ عوام کے ہاتھ فضول مارا جانا بیسود ہوگا۔

بلخ کے بعض نامور لوگوں نے خواجہ انصاری کی موافقت کی اور ان سے عزت واحترام کا سلوک کیا، ان قدر دانوں میں ابو القاسم تمیمی بھی تھے، جن کو نظام الملک نے مدرسۂ نظامیہ بلخ میں تدریس کے لیے مامور کیا تھا، وہ بہت ہی با اثر اور مالدار شخص تھے، انھوں نے خواجہ انصاری کو ہزار دینار جو ایک خاصی رقم تھی، تقدیم کیا،

ایک صوفی بزرگ بنام شیخ معمر لبنانی کو جو خواجہ انصاری سے عقیدت رکھتے تھے، جب معلوم ہوا کہ نظام الملک نے خواجہ انصاری کی تبعید کا فرمان جاری کیا ہے تو وہ فوراً وزیر کی خدمت میں پہنچے اور خواجہ انصاری کی شفاعت کی اور ان کو معاف کرنے کی درخواست کی، نظام الملک نے شیخ لبنانی کی خوش روئی سے پذیرائی کی اور ان کی درخواست قبول کرکے فرمان جاری کر دیا کہ خواجہ انصاری کو ہرات واپس بھیج دیا جائے، چنانچہ صرف چند ما

کی دوری کے بعد سال ۴۵۸ھ کے اختتام سے قبل خواجہ اپنے وطن واپس آگئے۔

سال ۴۵۹ھ کے آغاز میں الپ ارسلان کو پھر ہرات آنے کا اتفاق ہوا اور مخالفین خواجہ کو سازش کا ایک بار پھر موقع مل گیا، خواجہ انصاری کے دوستوں نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ نظام الملک کے پاس جاکر جلا وطنی سے جلد رہائی دینے کے بارے میں اپنے امتنان کا اظہار کریں۔ خواجہ انصاری نے ان کے مشورے کو قبول کیا اور ایک دن وزیر کے دربار میں حاضر ہوئے، مخالفین خواجہ نے ان کو ذلیل کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ برسر دربار ان سے ایک سوال کریں، اگر وہ جواب دینے میں تشدد ظاہر کریں تو نظام الملک کے روبرو ذلیل ہوں گے اور اگر انکا جواب سست ہوا تو اپنے شاگردوں کے درمیان رسوا ہوں گے، چنانچہ سلام وغیرہ کے بعد ایک استاد شافعی بنام ابوالقاسم علی دبوسی نے جو بعد میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں مدرس بھی مقرر ہوا، خواجہ انصاری سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ سے ایک بات پوچھوں"، خواجہ انصاری نے جواب دیا "کہو کیا کہتے ہو"۔ اس نے کہا "آپ ابوالحسن اشعری پر لعن کیوں کرتے ہیں؟" دشمنوں نے جو جال بچھایا تھا اس کی انھیں خبر نہ تھی، وہ چپ ہو رہے، نظام الملک نے نگاہ نیچی کر لی، اسے خوب معلوم تھا کہ خواجہ انصاری کیا جواب دیں گے، جب وہ کچھ دیر تک خاموش رہے اور تمام اہل مجلس ان کا جواب سننے کا انتظار کر رہے تھے، آخر نظام الملک نے کہا "سوال کا جواب دیجئے"۔ خواجہ انصاری کو اب جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، بولے "میں اشعری کو نہیں جانتا، میں تو اس پر لعنت بھیجتا ہوں جو خدا کے آسمان پر ہونے اور قرآن کے مصحف میں ہونے سے انکار کرے اور جو پیغمبر زماں کے پیغمبر ہونے کو نہ مانے۔" یہ کہکر خواجہ انصاری اٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت کی اجازت مانگی، اب کسی کی مجال نہ تھی کہ ان سے کچھ کہے، وہ چلے گئے تو نظام الملک نے دبوسی اور اس کے ساتھیوں پر ناراضگی کا اظہار کیا اور خواجہ انصاری کے ساتھ جو بے ادبی

نازل ہوئی، وہ یہ کہ وہاں کے معتزلیوں نے خواجہ انصاری کو سنگسار کرنے کے واسطے سنگریزے جمع کر لیے تھے، اس زمانے میں نظام الملک کا بیٹا جمال الملک بلخ کا عامل تھا، جب اس کو معتزلیوں کے اس ارادے کی خبر ملی تو وہ فوراً ان کے درمیان آگیا اور انھیں بہت ملامت کی کہ ایک دانشمند کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنا مناسب نہیں ہے، ان لوگوں نے کہا کہ خواجہ انصاری کو کچھ بولنے کو کہیئے، خواجہ انصاری نے ان کے کہنے سے لب کشائی کی اور یہ آیت تلاوت کی:۔

اللہ نزّل احسن الحدیث کتاباً متشابھا (سورۂ زمر آیت ۲۳)

اور اس کی تفسیر بیان کی جس میں انھوں نے غورجہ، غرجستان و فلانہ و تالقان کے معتزلیوں پر لعن وطعن کیا لیکن بلخ کے لوگوں کا تذکرہ اس مصلحت کی بنا پر نہیں کیا کہ عوام کے ہاتھ فضول مارا جانا بیسود ہوگا۔

بلخ کے بعض نامور لوگوں نے خواجہ انصاری کی موافقت کی اور ان سے عزت و احترام کا سلوک کیا، ان قدر دانوں میں ابوالقاسم تمیمی بلخی تھے، جن کو نظام الملک نے مدرسۂ نظامیہ بلخ میں تدریس کے لیے مامور کیا تھا، وہ بہت ہی بااثر اور مالدار شخص تھے، انھوں نے خواجہ انصاری کو ہزار دینار جو ایک خاصی رقم تھی، تقدیم کیا،

ایک صوفی بزرگ بنام شیخ معمر لبنانی کو جو خواجہ انصاری سے عقیدت رکھتے تھے، جب معلوم ہوا کہ نظام الملک نے خواجہ انصاری کی تبعید کا فرمان جاری کیا ہے تو وہ فوراً وزیر کی خدمت میں پہنچے اور خواجہ انصاری کی شفاعت کی اور ان کو معاف کرنے کی درخواست کی، نظام الملک نے شیخ لبنانی کی خوش روئی سے پذیرائی کی اور ان کی درخواست قبول کر کے فرمان جاری کر دیا کہ خواجہ انصاری کو ہرات واپس بھیج دیا جائے، چنانچہ صرف چند ماہ

کی دوری کے بعد سال ۴۷۵ھ کے اختتام سے قبل خواجہ اپنے وطن واپس آگئے۔

سال ۴۷۹ھ کے آغاز میں الپ ارسلان کو پھر ہرات آنے کا اتفاق ہوا اور مخالفین خواجہ کو سازش کا ایک بار پھر موقع مل گیا، خواجہ انصاری کے دوستوں نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ نظام الملک کے پاس جاکر جلاوطنی سے جلد رہائی دینے کے بارے میں اپنے امتنان کا اظہار کریں خواجہ انصاری نے ان کے مشورے کو قبول کیا اور ایک دن وزیر کے دربار میں حاضر ہوئے، مخالفین خواجہ نے ان کو ذلیل کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ برسر دربار ان سے ایک سوال کریں، اگر وہ جواب دینے میں تشدد ظاہر کریں تو نظام الملک کے روبرو ذلیل ہوں گے اور اگر انکا جواب سست ہوا تو اپنے شاگردوں کے درمیان رسوا ہوں گے، چنانچہ سلام وغیرہ کے بعد ایک استاد شافعی بنام ابوالقاسم علی دبوسی نے جو بعد میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں مدرس بھی مقرر ہوا، خواجہ انصاری سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ سے ایک بات پوچھوں"، خواجہ انصاری نے جواب دیا "کہو کیا کہتے ہو"، اس نے کہا "آپ ابوالحسن اشعری پر لعن کیوں کرتے ہیں؟" دشمنوں نے جو جال بچھایا تھا اس کی انھیں خبر نہ تھی، وہ چپ ہو رہے، نظام الملک نے نگاہ نیچی کر لی، اسے خوب معلوم تھا کہ خواجہ انصاری کیا جواب دیں گے، جب وہ کچھ دیر تک خاموش رہے اور تمام اہل مجلس ان کا جواب سننے کا انتظار کر رہے تھے، آخر نظام الملک نے کہا "سوال کا جواب دیجئے"۔ خواجہ انصاری کو اب جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، بولے "میں اشعری کو نہیں جانتا، میں تو اس پر لعنت بھیجتا ہوں جو خدا کے آسمان پر ہونے اور قرآن کے مصحف میں ہونے سے انکار کرے اور جو پیغمبر زماں کے پیغمبر ہونے کو نہ مانے"۔ یہ کہکر خواجہ انصاری اٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت کی اجازت مانگی، اب کسی کی مجال نہ تھی کہ ان سے کچھ کہے، وہ چلے گئے تو نظام الملک نے دبوسی اور اس کے ساتھیوں پر ناراضگی کا اظہار کیا اور خواجہ انصاری کے ساتھ جو بے ادبی

ہوئی تھی، اس کی تلافی کے لیے قبا لے کر ایک آدمی کو ان کے پیچھے دوڑایا کہ وہ انھیں ہدیہ پیش و دیدے
لیکن خواجہ نے قبول نہیں کیا اور وہ خیمۂ وزیر سے نکل کر شہر چلے گئے۔

مخالفین خواجہ انصاری کو نظام الملک کی طرف سے جسے وہ اشاعرہ کا حامی سمجھتے تھے سخت ناامیدی ہوگئی اور وہ اس فکر میں رہے کہ اب سلطان الپ ارسلان کی طرف رجوع کریں، اتفاق سے انھیں پھر یہ موقع مل گیا۔ سلطان ۴۶۲ھ کے آغاز میں پھر ہرات آیا، اس مرتبہ مخالفین خواجہ انصاری کو بت پرست ثابت کرنے کی ایک ترکیب سوچ کر وہ ان کے پاس گئے، اور کہا کہ ہم لوگ سلطان کو سلام کرنے جا رہے ہیں لیکن پہلے آپ کی خدمت میں سلام کرلیں، پھر سلطان کے پاس جائیں گے، انھیں ان باتوں میں الجھا کر پوشیدہ طور پر ایک بت خواجہ انصاری کے سجادہ کے نیچے رکھ دیا اور ان سے رخصت ہو کر چلے گئے، خواجہ کو انکی سازش کی کوئی خبر نہ تھی، وہ اپنے حجرہ میں چلے گئے، ادھر وہ لوگ جنھوں نے خواجہ انصاری کی ذلت و رسوائی کا نقشہ تیار کیا تھا، سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام و کلام کے بعد ان کی شکایت کی اور یہ تہمت لگائی کہ خواجہ انصاری خدا تعالیٰ کو صفاتِ بشری سے متصف کرتے ہیں اور اس کا بت بنا کر اپنے محراب میں رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدائے عز و جل اس بت کی شکل کا ہے، چنانچہ اس وقت بھی وہ بت ان کے سجادہ کے نیچے موجود ہے، کسی آدمی کو بھیج کر تحقیق کرلیا جائے، سلطان نے ان کی بات کا یقین کرلیا اور چند آدمیوں کو بھیجا کہ وہ بت لے آئیں، چنانچہ وہ مخفی طور پر خواجہ انصاری کے گھر پہنچے اور سجادہ کے نیچے سے نکال کر وہ بت لے آئے، سلطان بت دیکھکر بہت خشمگین ہوا اور خواجہ انصاری کو فوراً طلب کیا، خواجہ جب سلطان کے پاس حاضر ہوئے تو لوگوں کو جمع اور بادشاہ کے سامنے ایک بت دیکھ کر انھیں سخت تعجب ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ الپ ارسلان نے غصے سے پوچھا " یہ کیا ہے "؟ خواجہ نے جواب دیا یہ ایک بت ہے جو لعبت کی طرح

مس کا بنا ہوا ہے"، سلطان نے کہا میں نے تو تم سے دوسرا سوال کیا تھا، خواجہ انصاری نے جواب دیا "سلطان مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں"، سلطان نے کہا "یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم بت پرست ہو اور کہتے ہو کہ خدا اس بت کی شکل کا ہے"۔ خواجہ انصاری نے رعب دار آواز میں کہا "کتنا عظیم بہتان ہے!" سلطان الپ ارسلان نے خواجہ انصاری کے صادقانہ لہجے اور ان کے پُر وقار انداز سے سمجھ لیا کہ ان پر بہتان باندھا گیا ہے، حکم دیا کہ خواجہ ہرات کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے گھر پہنچا دیا جائے، پھر مخالفین خواجہ کی طرف رخ کر کے کہا کہ "سچ سچ بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کیا، ورنہ سخت سزا دی جائے گی"، انھوں نے جواب دیا کہ "ہم لوگ خواجہ انصاری کے ہاتھوں پریشان ہیں، سوچا تھا کہ اس طریقے سے ان کے شر سے نجات حاصل کرلیں گے"۔ الپ ارسلان نے ان سے تحریری معاہدہ لے لیا کہ "وہ جرمانہ کے طور پر خزانۂ سرکاری میں رقم دیں گے اور اس ذلت کے ساتھ موت سے رہائی پائیں گے"۔

دشمنوں پر اس طرح فتح حاصل کرنے سے خواجہ انصاری کی عزت و حرمت میں اور اضافہ ہوا، کچھ دنوں کے بعد خلیفۂ بغداد القائم بامر اللہ نے ان کی قدر افزائی کے لیے ایک قبا بطور خلعت بھیجا، جسے پہن کر وہ مجلسِ تدریس میں شاگردوں اور مریدوں کے درمیان برسر منبر جلوہ افروز ہوتے تھے۔

۴۷۳ھ میں خواجہ انصاری کی عمر تقریباً ستر سال کی ہوگئی تھی، یہ زمانہ اُن کے عروج کا تھا، ان کی استادی و بزرگی اوج پر آگئی تھی، بار بار مخالفین کی سازشوں اور کینہ پروری اور دسیسہ کاری کی وجہ سے وہ آزمائشوں میں مبتلا ہوئے تھے، لیکن ہر بار انکے دشمنوں کو شکست نصیب ہوئی تھی، اور ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا گیا تھا، انکے ارادتمندوں اور احترام گزاروں کی تعداد بڑھتی گئی، خواجہ نظام الملک طوسی وزیر سلطان

اور قاضی صاعد ابن سیار ایسے ارباب اقتدار سے ان کے خوشگوار تعلقات کی وجہ سے ان کے اثر و نفوذ میں بھی ترقی ہوئی، مفلسی و ناداری کا دور بھی ختم ہو چکا تھا، ان کے شاگرد و مرید ان کے پاس نذرانے اور ہدیے بھیجتے تھے، جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہوتے تھے، ان میں سے بقدر حاجت اپنے پاس رکھ کر دوسرے محتاجوں میں تقسیم کر دیتے تھے، مخالفوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے باعث سکون خاطر کے ساتھ مجالس و محافل میں تذکیر و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔

سلطان الپ ارسلان ماوراء النہر میں قتل کر دیا گیا تھا اور اس کا بیٹا ملک شاہ تخت نشین ہوا تھا، اس کے عہد سلطنت میں نظام الملک طوسی کی قوت و اقتدار میں زیادتی ہوئی، وہ صوفیوں کا عقیدتمند تھا، یہی سبب تھا کہ وہ خواجہ انصاری کا احترام کرتا تھا، اور اسکے سامنے جو ان کو رنج پہنچا تھا اس کی تلافی کی کوشش اپنی ملاقاتوں اور نذرانوں سے کرتا رہا، مذہبی معاملات میں وہ کسی خاص فرقے کا حامی نہ تھا، تمام معاملات کو تدبر اور اصول سیاست سے حل و فصل کرتا تھا، مدرسۂ نظامیۂ بغداد قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ طریق سنت کو تقویت پہنچے، اس مدرسے کے امور کو وہ مصلحت کی بنا پر انجام دیتا تھا، جس مدرس کو چاہتا مامور کرتا اور جسے چاہتا معزول کر دیتا تھا، وہ سلطنت میں استحکام اور ملک میں امن و امان کا خواہاں تھا، تنازعات کو جلد طے کر دیتا تھا، بغداد میں شافعی مسلک کے لوگوں کی کثرت تھی، اس لیے وہ ان لوگوں کی طرفداری کرتا تھا، لیکن ہرات میں خواجہ انصاری کے عقیدتمندوں کی تعداد بیشتر تھی اس سبب سے بھی وہ ان کی تعظیم کرتا اور ان کے مخالفین کی کوششوں کو ناکام بنا دیتا تھا، خواجہ انصاری ارباب سلطنت اور ارکان دولت سے جہانتک ممکن تھا دور رہتے تھے، اور کسی کی مدح سرائی نہیں کرتے تھے، لیکن نظام الملک نے ان پر احسانات کیے تھے جن کی وجہ سے خواجہ نے اس کی ستایش میں چند اشعار عربی میں کہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ اسے نصیحت بھی کی تھی،

اسی سال یعنی ۴۶۴ھ میں خواجہ انصاری ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے، انکی آنکھوں کی بصارت یک بیک جاتی رہی اور یہ نابینائی اُس وقت واقع ہوئی جب وہ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کر رہے تھے "یکاد سنا برقہ یذھب بالابصار" (سورۂ نور آیت ۴۳) یعنی برق ان آنکھوں کی روشنی لے جاتی ہے۔ اس واقعہ سے ان کو اور ان کے مریدوں کو سخت صدمہ ہوا، بصیرت زائل ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ چراغ کی دھیمی روشنی میں رات رات کو جاگ کر حدیث و تفسیر لکھا کرتے تھے، درحقیقت ان کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا، اور عرصے سے بینائی کم ہوتی جا رہی تھی لیکن اس کے بارے میں نہ کسی کو بتاتے تھے اور نہ علاج ہی کرتے تھے۔ آخر میں جب روشنی بالکل ہی زائل ہو گئی تو لوگوں کو معلوم ہوا، ان کے مرید و عقیدتمند اس افسوسناک حالت پر گریہ و زاری کرتے اور خدا سے بصارت پھر واپس آنے کی دعائیں مانگتے تھے،

بینائی سے محروم ہو جانے کے باوجود خواجہ انصاری نے تدریس و تذکیر کا کام جاری رکھا بلکہ اس معاملے میں زیادہ توجہ و محنت کرنے لگے، وہ اپنے شاگردوں کو حدیثیں لکھواتے اور اسکے بعد مسائلِ طریقت کی شرح اور پھر اشعار املا کراتے، اس سے پہلے یعنی بینائی زائل ہونے سے قبل بھی ان کا دستور یہی تھا کہ وہ اپنے اقوال و اذکار املا کراتے تھے،

خلیفۂ عباسی القائم بامراللہ کا ۴۶۵ھ میں انتقال ہو چکا تھا اور اسکی جگہ المقتدی باللہ کو خلافت ملی تھی، وہ سلطان ملک شاہ کی بیٹی سے بیاہ کرنے کا خواہشمند تھا، چنانچہ بغداد سے وزیر فخرالدولہ اصفہان رشتہ طے کرنے آیا، مذاکرات کے درمیان نظام الملک نے تجویز پیش کی کہ جس طرح خلیفہ القائم بامراللہ نے خواجہ ہرات کی تجلیل و قدر افزائی کی تھی، اس کے جانشین کو بھی پیر ہرات کی بزرگداشت کے لیے اقدام کرنا چاہئے، اس تجویز کو منظور کر کے خلیفہ نے ایک قبائے زریں بنام "شیخ الاسلام شیخ شیوخ، زین العلماء، ابواسمٰعیل عبداللہ بن محمد الانصاری" اور ایک

دوسری قبا اس کے ساتھ خواجہ عبداللہ کے بڑے بیٹے عبدالہادی انصاری کے نام بھیجا، ہرات کے لوگوں اور مریدانِ خواجہ نے قبل ہی احتراماً انھیں شیخ الاسلام لقب دیدیا تھا لیکن اب یہ لقب خلیفۃ المسلمین کی جانب سے عنایت ہونے کی وجہ سے رسمی ہوگیا۔

ماہ رمضان سال ۷۰۸ھ میں خواجہ عبداللہ انصاری بھی ناگہانی طور پر ایک آزمائش میں مبتلا ہوگئے، وہ واقعہ یہ ہے کہ اس ماہ مبارک میں ایک متکلم فلسفی ہرات آکر اپنے عقائد تبلیغ کرنے لگا، جب شیخ الاسلام کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے جلسوں میں اس کے خلاف تقریریں کیں جن کو سنکر ان کے شاگردوں اور مریدوں کو غیرت آئی اور وہ غیظ و غضب میں فوراً اس مکان میں پہنچکر جہاں وہ متکلم فلسفی اقامت گزیں تھا، آگ لگادی اور اسے مارا پیٹا، وہ ہرات سے بھاگ گیا، اہلِ ہرات نے جلسہ کرکے شورش کو فرو کرنے کی کوشش کی لیکن خواجہ انصاری کے دشمنوں کو انھیں نقصان پہنچانے کا اچھا موقع ہاتھ لگ گیا، انھوں نے سارا الزام فتنہ و فساد کا انکے سر تھوپ دیا اور فوراً خواجہ انصاری کو بچوں اور ملازموں کے ساتھ اخراج کرنے کا ارادہ کرلیا، خواجہ مجبوراً سب کے ساتھ پوشنگ چلے گئے جو ہرات سے ایک روز کی مسافت پر مغرب کی طرف واقع ہے، اتفاقاً وہ متکلم فلسفی بھی اسی شہر میں مدرسۂ نظامیہ کے استاد قاضی ابوسعید ابن یوسف کے مکان میں پناہ گزیں تھا، جو لوگ خواجہ انصاری کے ہمراہ گئے تھے، وہ اس مکان پر حملہ آور ہوگئے اور متکلم اور قاضی دونوں کو زدوکوب کیا اور شہر پوشنگ میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، مدرسۂ نظامیہ کا دروازہ بند کردیا گیا کیونکہ اس کا صحن خون آلودہ ہوگیا تھا، خواجہ انصاری کے ہوا خواہ لوگ ہرات واپس آگئے، اور شورش بند ہوگئی، خواجہ انصاری پوشنگ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ اقامت گزیں تھے، اس دوران میں عاملانِ ہرات نے سلطان کے پاس واقعات کی رپورٹ بھیجی، اور یہ رائے ظاہر کی کہ خواجہ انصاری کی موجودگی میں شہر کے نظامِ عامہ کو خطرہ درپیش ہے اور شورش کو فرو کرنے

کے لیے ان کا فوراً شہر سے اخراج ضروری ہے، دو مہینے کے بعد ملک شاہ اور نظام الملک کا
حکم نامہ آیا کہ خواجہ انصاری اور ان کے ساتھیوں کو فوراً ماوراء النہر کی طرف روانہ کر دیا جائے
وزیر کا فرمان جامع مسجد ہرات کے منبر پر سے پڑھ کر سنایا گیا جس سے خواجہ انصاری کے مخالفین
کو بڑی شادمانی حاصل ہوئی اور خواجہ انصاری کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہا کہ
حالت نابینائی میں اپنے دوستوں کے ساتھ ترکِ کوچ کریں، چنانچہ وہ اپنے رفقا کے ساتھ
نیشاپور ہوتے ہوئے آمل کے راستے میں آمو ندی عبور کر کے بخارا جا رہے تھے کہ وزیر سلطان
کا فرمان پہنچا کہ بلخ چلے جائیں، چنانچہ وہ پندرہ روز کی مسافت طے کر کے بلخ پہنچے جہاں انکے
کئی عقیدتمند تھے، جنھوں نے عزت و احترام کے ساتھ انکی پذیرائی کی، زیادہ عرصہ نہیں گزرا
تھا کہ پھر فرمان سرکاری صادر ہوا کہ وہ مروالرود چلے جائیں، اس فرمان سے رفقائے خواجہ کو
قدرے اطمینان ہوا کیونکہ مروالرود ہرات کی راہ میں ایک منزل ہے، یہاں دوسرا حکم
پھر پہنچا کہ وہ ہرات کو لوٹ جائیں، چنانچہ ۴۸۰ھ کے موسم بہار میں جسے خواجہ انصاری بہت
دوست رکھتے تھے، وہ اپنے رفقا کے ساتھ وطن کو واپس آگئے، اور یہاں پھر تدریس و تعلیم
میں معروف ہو گئے، لیکن اب پیری ان پر غالب آگئی تھی، مسلسل حالتِ نابینائی میں مشقت
نے انھیں خستہ و ماندہ کر دیا تھا، جسمانی طاقت بھی کم ہوتی جا رہی تھی، صحت خراب ہونے لگی
تھی، ہر روز کسی نہ کسی مرض کا غلبہ ہوتا تھا، ان کے شاگرد و مرید و خویشاوند اور خود خواجہ انصاری
کو یقین ہو چکا تھا کہ آخری وقت نزدیک آچکا ہے، آخر تاریخ ۲۲ ذی الحجہ روز جمعہ کو دوپہر
سے قبل پچاسی سال کی عمر میں ۴۸۱ھ میں دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رحلت کر گئے،
اور نوروز سے چند دن قبل ایک دن جبکہ سخت بارش ہوئی تھی، ان کے جسدِ خاکی کو ہرات سے
۳ کیلومیٹر اتر کی جانب قریۂ گازرگاہ میں زیرِ زمین دفن کر دیا گیا۔

شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کا مزار گازرگاہ میں زیارت گاہ عوام و خواص ہے، ان کی تربت کے قریب سب سے پہلے سلطان غیاث الدین محمد بن سام غوری (۵۵۸ - ۵۹۹ھ) کے عہد میں ایک عمارت مدرسہ کی صورت میں تعمیر ہوئی تھی لیکن چنگیز کے حملوں کے زمانے میں یہ عمارت ویران ہوگئی، شاہرخ میرزا کے زمانے میں اسے از سرِ نو تعمیر کیا گیا اور کاشی کاری اور کتبوں سے اس کی تزئین کی گئی، شاہرخ میرزا کے نامور وزیر امیر علی شیر نوائی نے جب وہ درگاہ کے متولی اور یہاں گوشہ گیر تھے، ایک باغ لگوایا اور اس میں دو عمارتیں نمکدان کی شکل کی بنوائیں جن میں سے مغرب کی عمارت سیلاب سے برباد ہوگئی، دوسری باقی ہے، یہ ایک ہشت پہل عمارت ہے، اس عمارت کے علاوہ مزار کے دکھن پورب طرف خانقاہ ہے جس کی سقف زرِ محلول اور لاجورد سے مزین ہے، اور اس کی دیواروں پر آیات کلام اللہ خوشخط میں منقوش ہیں، مزار سے کچھ نیچے صحن میں خواجہ انصاری کے دو بیٹوں اور شاہزادگانِ تیموری کی قبریں ہیں، جن کے لوحِ مزار میں نہایت خوشخط کتبے ہیں، راقم الحروف نے ہرات میں مزار خواجہ انصاری کی زیارت اور خانقاہ میں ایک مجلس سماع میں شرکت کی ہے۔

سطور صدر میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے قارئین کو شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری کی شخصیت و سیرت کا خاصا اندازہ ہوگیا ہوگا، پیر ہرات قرن پنجم ہجری میں جسے "دورِ تفتیش" کہا جاتا ہے زبردست و نمایاں شخصیت کے مالک تھے، ذہنی صلاحیتوں کے علاوہ وہ اپنی طبیعت و مزاج کے اعتبار سے بھی منفرد تھے، وہ محقق و مفسر و مفکر، حق آگاہ و حق پرست تھے، اور انھوں نے دین اسلام کی حقانیت اور اس کی اصلی روح کو عقلیت پرستی اور وسوسہ انگیزی سے آلودہ کرنے کی تمام کوششوں سے ایک سرفروش مجاہد کی طرح محفوظ رکھنے کا عزم کر رکھا تھا اور اس کے لیے انھوں نے جو راہ متعین کی تھی اس میں وہ بار بار مصائب و آزمائشوں میں گرفتار ہوئے، ایک زمانہ ان پر مفلسی و تنگدستی کا بھی گزرا لیکن انھوں نے تمام دشواریوں کا پامردی سے مقابلہ کیا، اور مستقل مزاجی سے اپنے مشن

قائم رہے، اس میں شک نہیں کہ ان کے مزاج میں سخت گیری، تعصب اور اختلاف میں شدت تھی لیکن ان کی بنیاد نیک نیتی پر اور فی سبیل اللہ تھی، ان کا تمسک کلام اللہ، احادیث نبوی اور شریعت اسلام سے تھا، اور وہ آخر دم تک ان کی ترویج و اشاعت کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔

پیر ہرات کی تالیفات | جو تالیفات حضرت خواجہ انصار سے منسوب ہیں اُن میں زیادہ تر وہ ہیں جو انھوں نے خود تحریر نہیں کی تھیں، بلکہ تقریر کے ذریعے اپنے شاگردوں اور مریدوں کو املا کرائی تھیں، ان املا شدہ کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے :۔

(۱) **طبقات الصوفیہ** :۔ یہ کتاب سُلمی کی ہمنام کتاب (طبقات الصوفیہ بزبان عربی) کی توضیح و توسیع ہے، اپنے شاگردوں کو صوفیاے ماقبل کے حالات بیان کرتے وقت پیر ہرات نے اپنے مطالعہ سے بہت سے معلومات کا اضافہ کیا ہے، یہ تالیف لہجۂ ہراتی میں ہے، اسے مولانا جامی نے فارسی میں ترجمہ کر کے اپنی مشہور تالیف نفحات الانس کا ماخذ و اساس بنایا، طبقات الصوفیہ کو افغانستان کے دانشمند جناب عبدالحیٔ حبیبی نے ایڈٹ کر کے انجمن تاریخ افغانستان کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا ہے۔

(۲) **صد میدان** :۔ یہ تصوف و عرفان کے متعلق ہے اور اس میں وہ سو منازل بیان ہوئے ہیں جن سے ایک سالک کو وصول الی اللہ میں گزرنا پڑتا ہے۔

(۳) **منازل السائرین** : یہ کتاب عربی میں ہے اور صد میدان کی توسیع ہے اس میں بھی وہی منازل سلوک زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، یہ کتاب اپنے موضوع و مطالب کے لحاظ سے بہت اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے علماء و عرفاء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں، ان شارحین میں سے چند کے نام یہ ہیں، عفیف الدین تلمسانی، عبدالرزاق کاشانی، جمال الدین یحییٰ بن داؤد بن سلیمان الفارسی، شمس الدین محمد تستری،

محمد بن الحسن القادری، علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم الجوزیہ، ہزار سالہ جشن سالگرہ کے موقع پر یہ کتاب فارسی ترجمے اور حواشی کے ساتھ وزارتِ اطلاعات و کلتور جمہوریہ افغانستان کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

(۴) **علل مقامات**: اس رسالے کا پورا نام یہ ہے، ذکر شئ من العلل التی تدخل المقامات۔ یہ رسالہ بھی عربی ہے اور اس میں اُن علل کا بیان ہے جو مقاماتِ سلوک میں داخل ہو کر سالک کی راہ کھوٹی کرتے ہیں۔

(۵) **رسالہ ذم الکلام واہلہ**: اس میں پیر ہرات نے آیاتِ قرآنی واحادیثِ نبوی سے علم کلام اور اہل کلام کو سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف ثابت کیا ہے،

(۶) **کشف الاسرار وعدۃ الابرار**: یہ وہ تفسیر کلام اللہ ہے جو خواجہ نے اپنے شاگردوں اور مریدوں کے درمیان تقریر کے ذریعے بتائی تھی، ان کے شاگرد ابی الفضل رشید الدین المیبذی نے اسے اپنی تفسیر کی اساس بنائی، حضرت خواجہ نے اس تفسیر کے لیے ایک سو سات تفاسیر کا مطالعہ اور ان سے استفادہ کیا تھا، اس تفسیر میں تین "نوبت" ہیں، نوبت اول میں خالص ترجمہ ہے، نوبت دوم میں تفسیر اور نوبت سوم میں توجیہ و تاویل ہے، جس میں معرفت کے نہایت جالب نکتے بیان کئے گئے ہیں، یہ تفسیر بھی ہراتی لہجے میں ہے، چند سال قبل دانشگاہ تہران نے اسے طبع و نشر کیا ہے۔

(۷) **انیس المریدین** (۸) **شمس المجالس** (بزبان عربی)، (۹) **واروات** (۱۰) **انوار التحقیق** (۱۱) **الاربعین فی الصفات** (۱۲) **زاد العارفین** (۱۳) **مناقب الامام احمد بن حنبل** (۱۴) **قلندر نامہ** (۱۵) **محبت نامہ** (۱۶) **نصیحت نامہ** (۱۷) **الٰہی نامہ** (۱۸) **مناجات نامہ** (۱۹) **سوال دل از جان**۔

حضرت خواجہ کے رسائل کا ایک مجموعہ بنیاد فرہنگ ایران، تہران نے چھاپا ہے جس میں مختلف عنوانات پر بیالیس ۴۲ فصول ہیں۔

الٰہی نامہ اور مناجات بہت مشہور رہیں، ان میں حضرت خواجہ کی عارفانہ شان اور روحانی مزاج پورے طور پر آشکارا ہے، اپنے خالق کے حضور میں جس صدق دل اور خلوص سے اپنی تمنائیں اور آرزوئیں پیش کی ہیں وہ اس گفتگو کے مشابہ ہے جو عاشق و معشوق کے درمیان ہو سکتی ہے، راز و نیاز کا انداز اور والہانہ سرشاری کی کیفیت قاری کے دل کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی، حضرت خواجہ کی یہ تالیفات صرف عارفانہ و صوفیانہ نقطۂ نظر سے ہی اہم نہیں ہیں بلکہ ادبی اعتبار سے بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے، انھوں نے نثر میں ایک خاص اسلوب اختیار کیا جس کی مثال بہت کم ملے گی، اس میں سادگی کے ساتھ پُرکاری بھی ہے، چھوٹے جملے اور فقرے ہیں جو مسجع و مقفی ہیں، اور ان سے ایک ایسا آہنگ پیدا ہوتا ہے جو سامع کے لیے لطف و لذت کا سامان پیدا کرتا ہے لیکن قافیہ پیمائی میں تصنع نہیں ہے، بلکہ ایک خاص قسم کی لطافت و شیرینی ہے، خواجہ نے اپنے مریدوں و شاگردوں کا خیال کر کے سادگی کا پیرایہ اختیار کیا تاکہ وہ بھی لطف اندوز ہو سکیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

الٰہی
اگر کار نہ از خدمت خاستی
پسر عمران بطلب ارنی کی برخاستی
و اگر نہ ترا ایں معنی بایستی
محمد مصطفیٰ قاب قوسین را نشایستی
بوجہل از کعبہ و ابراہیم از بتخانہ
کار عنایت دارد باقی ہمہ بہانہ

ابراہیم را چہ زیان کہ پدر او آذر است؟
آذر را چہ سود کہ ابراہیم او را پسر است؟
نور در طاعت ست اما کار بعنایت است
آنجا کہ عنایت خدائی باشد
فسق آخر کار پارسائی باشد
و آنجا کہ قہر کبریائی باشد
سجادہ نشیں کلیسائی باشد

الٰہی

اگر با تو سازم گویی کہ دیوانہ است

اگر با خلق در سازم گویی بیگانہ است

الٰہی

فرمایی کہ بجو و می ترسانی کہ بگریز

فرمایی کہ بخواہ و می گوئی بپرہیز

الٰہی

گریختہ بودم تو خواندی

ترسیدہ بودم برخوان تو نشاندی

ابتدا می ترسیدم کہ مرا بگیری بہ عطای خویش

اکنون می ترسم کہ مرا بفریبی بہ عطای خویش

الٰہی

نہ خرسندم نہ صبور

الٰہی

نہ رنجورم نہ مہجور

الٰہی

تا با تو آشنا شدم از خلایق جدا شدہ ام

در جہاں شیدا شدم

نہاں بودم پیدا شدم

الٰہی

بر امید وصل چنداں اشک باریدم

کہ بر آب چشم خویش تخم درد بکاریدم

در سعادت ازلی دریابم

این درد پسندیدم

درد دیدۂ من روزی بہ تو آید

آں محنت ہمہ دولت انگاریدم

الٰہی

از بد سزای خود در دردم

و از ناکسی خود بفغاں!

دردم را درماں ساز!

ای درماں ساز ہمہ دردمنداں!

ای پاک صفت از عیب

ای عالی صفت از شوب

ای بی نیاز از خدمتِ من

الٰہی

در الٰہیت یکتایی

و در احدیت بے ہمتایی

و در ذات و صفات از خلق جدایی

متصف بہ بہایی	درچشم منی وروی بمن تنمایی
متحد بہ کبریایی	وندر دلی وہیچ بمن ننگرایی
مائیٔ ہر بینوا و پناہ ہر گدایی	ای جان و دل و دیدہ وای بینایی!
ہمہ را خدایی	چون از دل و دیدہ درکنارم نایی!
تا دوست کرایی	

لسانی لحاظ سے بھی حضرت پیر ہرات کی تالیفات کی خاصی اہمیت ہے، کیونکہ وہ خالص فارسی (یا دری) میں ہیں، جو پانچویں صدی ہجری میں خراسان کے علاقے میں رائج تھی، ان تالیفات میں کثرت سے پرانے الفاظ و محاورات ہیں جو اب استعمال میں نہیں رہے، حضرت خواجہ نے طبقات صوفیہ اور تفسیر میں خاص طور پر صریح و دقیق الفاظ استعمال کیے ہیں اور جہانتک ممکن ہوا ہے عربی الفاظ و امثال و حکم سے پرہیز کیا ہے۔

خواجہ انصار ذوق شعری سے بھی سرشار تھے، ان کی رباعیاں عرفانی اور اخلاقی مضامین سے لبریز اور شور و حال وجذب وکیف سے مملو ہیں۔

حضرت پیر انصار کے اہل وعیال کے متعلق اطلاعات بہت کم دستیاب ہیں۔ انکے دو بیٹوں کے نام البتہ معلوم ہیں، ایک شیخ اسمٰعیل اور دوسرے شیخ عبدالہادی، ان دونوں کی قبریں گازرگاہ میں خواجہ کے مزار کے پہلو میں واقع ہیں، لیکن حضرت خواجہ کے احفاد اکثر بلاد وامصار میں پھیل گئے تھے، خواجہ الطاف حسین حالی اور خواجہ حیدر علی آتش کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ عبداللہ انصاری سے ملتا ہو، فرنگی محل لکھنؤ کا انصاری خاندان بھی حضرت پیر ہرات سے اپنا سلسلہ ملاتا ہے، ان کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی خاندان ہیں جو حضرت پیر ہرات سے منسوب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، واللہ اعلم۔ افغانستان کے ایک اسکالر جناب آقا سی

علی اصغر بشیر، حضرت خواجہ کے اولاد و احفاد کے متعلق معلومات جمع کر رہے ہیں، چنانچہ جب میں نے کانفرنس میں اپنا مقالہ پڑھا اور اس میں خواجہ حالی کا ذکر آیا تو انھوں نے بڑی دلچسپی ظاہر کی اور مجھ سے فرمائش کی ہو کہ میں ہندوستان کے انصاری خاندانوں کے متعلق انھیں معلومات فراہم کروں۔

کتابیات

(۱) طبقات الصوفیہ (کابل ایڈیشن)

(۲) منازل السائرین (" ")

(۳) نفحات الانس جامی (تہران ایڈیشن)

(۴) مقامات شیخ عبداللہ انصاری۔ جامی (کابل ایڈیشن)

(۵) الٰہی نامہ (کابل ایڈیشن)

(۶) مناجات نامہ (" ")

(۷) رسائل خواجہ عبداللہ انصاری (تہران ایڈیشن)

(۸) ریاض العارفین (تہران ایڈیشن)

(۹) رسالہ ادب۔ دانشگاہ کابل (شمارہ ۱ جلد ۲۴۔ مارچ، مئی ۱۹۷۶ء)

(۱۰) رسالہ افغانستان (انگریزی) شمارہ ۱ جلد ۲۸ بابت جون ۱۹۷۵ء)

بہمنیوں سے پہلے دکن کی ایک اہم فارسی تصنیف

فرہنگ دستور الافاضل

از پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دکن کے فارسی ادب سے متعلق نئے مخطوطات کی بازیافت سے یہ بات مسلّم ہو جاتی ہے کہ ابھی اس سلسلے کی تحقیق اپنی آخری منزل تک نہیں پہنچی ہے (History of medieval Decan) کی دوسری جلد میں "دکنی فارسی ادب" کے عنوان سے راقم کا مقالہ شامل ہے، ابھی اس حصے کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ مجھے دو نئی تصانیف کا سراغ ملا، اول فارسی زبان میں موسیقی پر ایک رسالہ توضیح الحان نامی تھا جو محمود شاہ بہمنی کے نام معنون تھا، بظن قوی سلطان مذکور بہمنی دور کا آخری بادشاہ تھا، جو ۸۸۷ھ میں تخت نشین ہوا تھا، اس رسالے کا مخطوطہ تہران میں آقای نصیری کے کتابخانے میں ہے جس کو ہمایوں فرخ نے مجلۂ ہنر و مردم کے دو شمارے ج ۴۹ اور ج ۵۹ میں متعارف کرا دیا ہے، راقم نے اس کتاب پر ایک مختصر یادداشت تیار کی جو بعد میں تاریخ دکن والے مضمون میں شامل کر دی گئی، دوسری تصنیف شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی (م: ۸۳۴) کی سوانح حیات سے متعلق تھی، اس کا مؤلف عبد العزیز بن شیر ملک واعظی تھا جس نے بہمنی سلطان علاء الدین احمد (۸۳۸ - ۸۶۲) کے نام یہ رسالہ معنون کیا تھا، اس رسالے پر راقم نے ایک یادداشت تو تیار کر لی تھی لیکن اس وقت تک تاریخ دکن

چھپ چکی تھی، چنانچہ مکمل یادداشت تو میرے مضمون میں شامل نہیں ہو سکی، البتہ اسکا چند سطروں میں خلاصہ بطور ضمیمہ تاریخ مذکور میں شامل ہو گیا جس میں غلطی سے عبدالعزیز کے بجائے مصنف کا نام عبداللہ درج ہو گیا ہے، البتہ مکمل مضمون رسالہ اسلامک کلچر جولائی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ہے، اس کے بعد مجھے چند اور نسخوں تک رسائی ہوئی جن کے ذکر سے تاریخ دکن والا مضمون خالی ہے، ان میں سے ایک دیوان عیانی، دوسرا فتح نامۂ محمود شاہی ہے جو آخری بہمنی سلطان محمود شاہ کے دور سے تعلق رکھتا ہے، یہ ایک منظوم رسالہ ہے جس کا مصنف بھی نعمت اللہ عیانی ہی ہے، یہ دونوں نسخے Govt. Oriental Mss. Lib مدراس میں زیر شمار ۹۲ محفوظ ہیں، تیسری کتاب "تاریخ حبیبی و تذکرۂ مرشدی" ہے، اس کا بھی مولف عبدالعزیز ابن شیر ملک واعظی صاحب "رسالہ در سیر شاہ نعمت اللہ ولی" ہے، تاریخ حبیبی علاء الدین احمد شاہ بہمنی (م: ۸۶۲) کے عہد میں اس کے وزیر ملک راجا رستم کی فرمائش پر ۸۴۹ھ میں مرتب ہوئی، یہ تاریخ حضرت گیسو دراز کے حالات کا مفصل تذکرہ ہے، مصنف نے اس کے تمام مندرجات سید سدید الدین حسینی کی سند سے لکھے ہیں،

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجا رستم جو سلطان علاء الدین احمد کے زمانے میں نظام الملک کے لقب سے ملقب تھا، سادات اور غیر ملکیوں کا سخت مخالف تھا، چنانچہ اس بادشاہ کے دور میں چاکنہ میں جو قتل عام ہوا اور جس میں بقول برہان مآثر ص ۸۴ بارہ سو صحیح النسب سادات اور ایک ہزار غیر ملکی قتل ہوئے، راجا رستم کا ہاتھ تھا، اس کے باوجود راجا رستم سید گیسو دراز کا معتقد تھا، چنانچہ تاریخ حبیبی و تذکرۂ مرشدی کی تالیف اسی کے اسی اعتقاد کا نتیجہ ہے۔

تاریخ حبیبی حسب ذیل دس ابواب پر مشتمل ہے[۵]:-

---

[۵] ابواب کی تفصیل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے پر مبنی ہے جس کو اسکے فہرست نگار، ایوانوف نے درج کی ہے۔
(باقی ص ۱۳۱ پر)

باب اول مبالغت کرامات و خوارق ،

باب دوم مواظبت دینداری ،

باب سوم معالجت مرض قلوب ،

باب چہارم موافقت عقیدۂ پاک با احکام سنت و جماعت ،

باب پنجم معاملات در عطف خلافت و اجازت ،

باب ششم مناسبت فضائل بنا مخدوم ،

باب ہفتم مباحثت و ارادت در علوم و نویسانیدن تصانیف ،

باب ہشتم ملاحظت در عرایس و ضیافات ،

باب نہم مداخلت در سماع طریقت و سماع بحالات ،

باب دہم مداومت بورد و ظاہر آن عارف حق الحقیقہ ،

اس کتاب کے تین نسخے دریافت ہوئے ہیں، ایک بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں جس کا تعارف ایوانوف نے اپنی فہرست میں کرایا ہے، دوسرا نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتابخانہ میں حبیب گنج کے ذخیرہ میں زیر شمارہ ۲۲/۳۸ موجود ہے، یہ چھوٹے سائز کے ۱۵۳ ورق پر مشتمل ہے، آخری ورق اور مقدمے کا ایک ورق غائب ہے، تیسرا نسخہ سید عطا حسین صاحب کے پاس تھا، چنانچہ اس سلسلے سے سید صاحب موصوف نے مولانا حبیب الرحمن نواب صدر یار جنگ کو دو خط حیدر آباد لنگم پلی سے ۱۶ر جنوری ۱۹۴۶ء اور ۱۶ر مارچ ۱۹۴۶ء کو لکھے، اول الذکر خط سے معلوم ہوا کہ سید عطا حسین نے اپنے نسخے کا مقابلہ نواب صدر یار جنگ کے نسخے سے (جو اب مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہی) کرلیا تھا، پھر ان کو کلکتے کے نسخے کا علم ہوا تو اس کی نقل کی فکر ہوئی، دوسرے خط سے ظاہر

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰) مسلم یونیورسٹی کا نسخہ اس تفصیل کا حامل نہیں، البتہ اسکے اردو ترجمے میں یہی ابواب ملتے ہیں۔

ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان کو عکس مل گیا تھا، چنانچہ اس کی رو سے انھوں نے حبیب گنج کے نسخہ کے لیے آخری صفحہ کی نقل بھیجکر اس کا ایک بڑا نقص پورا کردیا، لیکن مقدمہ میں جو کمی تھی وہ ہنوز باقی ہے، ایسا خیال ہوتا ہے کہ سید عطا حسین صاحب تاریخ حبیبی کے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، مگر نہ جانے کن وجوہ سے یہ کتاب شائع نہ ہوسکی، البتہ نواب معشوق یار جنگ نے اس کو اردو میں منتقل کر دیا تھا، چنانچہ یہ ترجمہ حیدر آباد سے ۱۳۶۸ ہجری میں شائع ہوا، اس کے دیباچہ سے معلوم ہوا کہ شیخ علاء الدین جنیدی سجادہ نشین روضۂ شیخ سراج الدین رکن الدین تاریخ حبیبی کے متن کی تصحیح کر کے چھاپ رہے تھے، مگر معلوم نہ ہوسکا کہ اس کی طباعت مکمل ہوئی یا نہیں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ شیخ مذکور کے نسخے کی بنیاد کس نسخے پر تھی، خیال یہی ہے کہ شیخ علاء الدین اور سید عطا حسین دونوں کا بنیادی نسخہ ایک ہی ہوگا۔

راقم نے تاریخ دکن والے مضمون میں ایک فارسی شاعر نظیری طوسی کا ذکر کیا ہے، لیکن اس وقت تک اس کے دیوان کا سراغ نہیں ملا تھا، اب اس کے ایک نسخے کا علم ہو گیا ہے، یہ نسخہ ایک مختصر دیوان کی شکل میں برٹش میوزیم کے ایک فارسی مجموعہ زیر شمارہ ۳۰۰۹ .Add موجود ہے، جس کا تعارف ریو نے فارسی مخطوطات کی فہرست ج ۲ ص ۶۴۱ - ۶۴۲ پر کرا دیا ہے، دیوان مذکور اس مجموعے کے ۱۸۱ تا ۲۲۱ اوراق پر مشتمل ہے، جس کے اجزاء حسب ذیل ہیں:-

قصائد ورق ۱۸۱ ب بعد - غزل ورق ۲۰۴ ب بعد - مقطعات ۲۱۲ ب بعد - رباعیات ورق ۲۱۶ ب بعد

اس دیوان کے قصائد شاہ خلیل اللہ[1] اور ان کے دو فرزند شاہ حبیب اللہ اور شاہ محب اللہ کی مدح میں ہیں۔

---

[1] شاہ خلیل اللہ شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی (م: ۸۳۴) کے بیٹے تھے، باپ کی وفات کے بعد دکن آئے اور احمد شاہ بہمنی (م: ۸۳۸) اور علاء الدین بہمنی (م: ۸۶۲) کے دور میں ان کی اور ان کے دو بیٹوں کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، لیکن ہمایوں شاہ کے دور میں ۸۶۴ میں شاہ حبیب اللہ قتل کر دیے گئے۔

ادھر کافی عرصے سے راقم حروف کے زیر مطالعہ فارسی لغت کا ایک مخطوطہ دستورالافاضل کا رہا ہے، اس کے غائر مطالعے سے اس راز کی عقدہ کشائی ہوئی کہ یہ فرہنگ بہمنی دور سے قبل دکن میں مرتب ہوئی، اس کتاب کا واحد اور کسی قدر ناقص مخطوطہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتاب خانے میں محفوظ ہے، راقم نے اس کا انتقادی متن مع ایک مفصل مقدمے کے دو سال قبل ۱۳۵۲ شمسی میں بنیاد فرہنگ ایران تہران سے شائع کر دیا ہے لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ باوجود اس علم کے کہ دستورالافاضل قصبہ استادآباد میں مرتب ہوئی ہیں اس امر کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ ان چند قدیم کتابوں میں ہے جو سلطنت بہمنی کی تاسیس سے قبل خطۂ دکن میں لکھی گئی تھیں، اسی وجہ سے اس فرہنگ کا ذکر تاریخ دکن والے مضمون میں نہیں ہوا تھا، اس نقص کی تلافی کا خیال ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا،

اس تمہید کے بعد اب میں دستورالافاضل کے بارے میں ایک مختصر گذارش پیش کر رہا ہوں۔

دستورالافاضل فارسی لغت کی ابتدائی کتابوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، قدامت کے لحاظ سے ہندوستان میں صرف فرہنگ قواس (تالیف بعد ۶۹۵)، اس سے پہلی کی تالیف ملتی ہے، اور ایران میں بھی صرف دو فرہنگیں اس سے قدیم موجود ہیں، یعنی لغت فرس تالیف اسدی (بعد ۴۶۵) اور صحاح الفرس تالیف محمد بن ہندوشاہ نخجوانی (۷۲۷)، معیار جمالی اسی کی ہم عصر ہے۔

دستورالافاضل کے مولف کا اصل نام رفیع تھا لیکن وہ حاجب خیرات کے نام سے معروف تھا۔ اس کی زندگی کے بارے میں کوئی معلومات نہیں، البتہ اس نے خود دستورالافاضل کے مقدمے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی کا باشندہ تھا یہیں اس کی نشو و نما ہوئی لیکن کچھ ایسے حادثات پیش آئے کہ اس کو وطن چھوڑنا پڑا، اسی پریشانی

کے عالم میں وہ دکن کی طرف روانہ ہوا، اور قصبہ بیر پہنچا، یہاں اس خطے کے صدر شمس الدین محمد کی آمد آمد تھی، حاجب خیرات اس کے دربار میں پہنچا، صدر مذکور نے توجہ فرمائی اور دہیں کو اپنے مستقر استاد آباد آنے کی فرمایش کی، مولف صدر کے ہمرکاب روانہ ہوا اور استاد آباد پہنچ گیا، اس طرح صدر کے دربار میں اس کی باقاعدہ رسائی ہوئی، اور وہ اسکی عنایات سے مخصوص ہوا، ایک روز صدر نے اس سے ایک فرہنگ لکھنے کی فرمایش کی، مولف نے فرہنگ قواس کا ذکر کیا لیکن صدر نے اس کے اختصار کے پیش نظر اصرار سے فرہنگ مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ حاجب خیرات نے ۷۴۳ھ میں اپنا لغت دستور الافاضل کے عنوان سے مرتب کرکے صدر شمس الدین محمد کے نام معنون کیا،

مولف کا نام اس عبارت میں پایا جاتا ہے :-

اما بعد می گوید مولف این تالیف و مصنف این تصنیف بندۂ ضعیف رفیع کمن اندوہ و بلیات معروف بہ حاجب خیرات -

حسب ذیل بیت میں مشہور نام اس طرح آیا ہے :-

کسی کاین عین نسخہ باز جوید		دعای حاجب خیرات گوید (ص ۲۵۶)

بظاہر حاجب خیرات میں اضافت ابنی ہے -

کتاب کا عنوان اور سنہ تاریخ اس بیت میں شامل ہے:

زہجرت بود ہفصد با سہ و چہل		مرتب گشتہ دستور افاضل

مولف کے سفر میں دو قصبوں کا نام آیا ہے، ایک "بیر" دوسرا "استاد آباد (دستور ص مقدمہ)

ان دونوں مقامات کے تعین ہی پر اس گفتگو کے عنوان کی صحت کا مدار ہے، دراصل ان ہی جگہوں سے راقم نے قیاس کیا ہے کہ حاجب خیرات نے تلاش معاش میں دہلی سے دکن کا رخ

گیا تھا اور اس طرح کی یہ واحد مثال نہیں، بہمنی سلطنت کے قیام کے پہلے اور دورانِ قیام میں شمالی ہند کے علما و فضلا برابر دکن جایا کرتے تھے۔ شیخ زاجو قبال، شیخ حسن دہلوی، سید گیسو دراز کا نام اس سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے، بہرحال حاجب خیرات قصبۂ "بیر" پہنچا، جو ہندوستانی تلفظ میں بیڑ ہے، لیکن حاجب نے اس کا عربی و ایرانی قاعدے سے "بیر" بمعنی چاہ کیا ہے، جیسا کہ حسب ذیل فقرے سے واضح ہے:

"و چند روز چوں یوسف خود را بدان چاہ [یعنی بیر] زنداں بی داد داد" (ص ۴)

اگرچہ آفتاب در چاہ نیفتد در منزل بیر فرود آمد [ص ۵۰]

"بیڑ[۱]" نام کے دو قصبے اس وقت بھی نواحِ دکن میں موجود ہیں، ایک ضلع نبار میں ہے جو کھنڈوا سے بطرف آبارسی ۴۳ کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے، دوسرا "بیڑ" جو ریاست حیدرآباد میں شامل تھا اور اب صوبہ مہاراشٹر کا جزء ہے، قیاس یہی ہے کہ حاجب خیرات ریاست حیدرآباد میں شامل بیڑ میں پہنچا ہوگا، اس لیے کہ یہ قصبہ استادآباد کے نواح میں تھا، اور استادآباد اس خطے کا صدر مقام تھا، یہ قصبہ بہمنیوں کے دور میں دارالملک کی حیثیت رکھتا تھا، کئی واقعات اس خطے سے منسوب تاریخوں میں ملتے ہیں، منجملہ ان کے ایک مشہور واقعہ جو برہان مآثر (ص ۹۲-۹۳) میں درج ہے، یہ ہے کہ سلطان ہمایوں شاہ کے زمانے میں شاہ حبیب اللہ مع چند اکابر امرا کے بیدر میں محبوس تھے، شاہ مذکور کے مریدوں کی وجہ سے شورش ہوئی اور ہزاروں آدمیوں نے قلعہ کا دروازہ توڑ کر انھیں آزاد کرا دیا، آزادی کے بعد یہ جماعت دارالملک بیڑ کی طرف متوجہ ہوئی۔

حاجب خیرات کے سفر کے سلسلے کا دوسرا مقام استادآباد ہے۔ یہ نام اب مفقود ہے۔

---

[۱] بیڑ بہمنیوں کے زمانے میں ایک دارالملک تھا۔ چنانچہ جب سلطان ہمایوں شاہ کے زمانے میں شاہ حبیب اللہ مع تمام امرا کے قید سے رہائی پائی تو یہ جماعت ولایت بیڑ کی طرف متوجہ ہوئی (تاریخ برہان مآثر ص ۹۲-۹۳)

کے عالم میں وہ دکن کی طرف روانہ ہوا، اور قصبہ بیر پہنچا، یہاں اس خطے کے صدر شمس الدین محمد کی آمد آمد تھی، حاجب خیرات اس کے دربار میں پہنچا، صدر مذکور نے توجہ فرمائی اور اس کو اپنے مستقر استا وآباد آنے کی فرمائش کی، مولف صدر کے ہمرکاب روانہ ہوا اور استادآباد پہنچ گیا، اس طرح صدر کے دربار میں اس کی باقاعدہ رسائی ہوئی، اور وہ اسکی عنایات سے مخصوص ہوا، ایک روز صدر نے اس سے ایک فرہنگ لکھنے کی فرمائش کی، مولف نے فرہنگ قواس کا ذکر کیا لیکن صدر نے اس کے اختصار کے پیش نظر اصرار سے فرہنگ مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ حاجب خیرات نے ۷۴۳ھ میں اپنا لغت دستورالافاضل کے عنوان سے مرتب کرکے صدر شمس الدین محمد کے نام معنون کیا،

مولف کا نام اس عبارت میں پایا جاتا ہے :۔

اما بعد می گوید مولف این تالیف و مصنف این تصنیف بندۂ ضعیف رفیع کمن اندوہ و بلیات معروف بہ حاجب خیرات ۔

حسب ذیل بیت میں مشہور نام اس طرح آیا ہے :۔

کسی کاین عین نسخہ باز جوید دعای حاجب خیرات گوید (ص ۲۵۶)

بظاہر حاجب خیرات میں اضافت ابنی ہے ۔

کتاب کا عنوان اور سنہ تاریخ اس بیت میں شامل ہے :

زہجرت بود ہفصد باسہ و چہل مرتب گشتہ دستور افاضل

مولف کے سفر میں دو قصبوں کا نام آیا ہے، ایک "بیر" دوسرا "استادآباد (ملاحظہ ہو دستور مقدمہ)" ان دونوں مقامات کے تعین ہی پر اس گفتگو کے عنوان کی صحت کا مدار ہے، در اصل ان ہی جگہوں سے راقم نے قیاس کیا ہے کہ حاجب خیرات نے تلاش معاش میں دہلی سے دکن کا رخ

کیا تھا اور اس طرح کی یہ واحد مثال نہیں بہمنی سلطنت کے قیام کے پہلے اور دوران قیام میں شمالی ہند کے علماء و فضلا برابر دکن جایا کرتے تھے۔ شیخ راجو قتال، شیخ حسن دہلوی، سید گیسو دراز کا نام اس سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال حاجب خیرات قصبہ "بیر" پہنچا، جو ہندوستانی تلفظ میں بیڑ ہے، لیکن حاجب نے اس کا عربی و ایرانی قاعدے سے "بیر" بمعنی چاہ کیا ہے، جیسا کہ حسب ذیل فقرے سے واضح ہے:

"و چند روز چوں یوسف خود را بداں چاہ [یعنی بیر] زنداں بی داد داد" (ص ۴)

اگرچہ آفتاب در چاہ نیفتد در منزل بیر فرود آمد [ص ۵۰]

"بیڑ"[۱] نام کے دو قصبے اس وقت بھی نواح دکن میں موجود ہیں، ایک ضلع نیاڑ میں ہے جو کھنڈوا سے بطرف آنارسی ۳۳ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، دوسرا "بیڑ" جو ریاست حیدرآباد میں شامل تھا اور اب صوبہ مہاراشٹر کا جز ہے، قیاس یہی ہے کہ حاجب خیرات ریاست حیدرآباد میں شامل بیڑ میں پہنچا ہوگا، اس لیے کہ یہ قصبہ استادآباد کے نواحی میں تھا، اور استادآباد اس خطے کا صدر مقام تھا، یہ قصبہ بہمنیوں کے دور میں دارالملک کی حیثیت رکھتا تھا، کئی واقعات اس خطے سے منسوب تاریخوں میں ملتے ہیں، منجملہ ان کے ایک مشہور واقعہ جو برہان مآثر (ص ۹۲-۹۳) میں درج ہے، یہ ہے کہ سلطان ہمایوں شاہ کے زمانے میں شاہ حبیب اللہ مع چند اکابر امرا کے بیدر میں محبوس تھے، شاہ مذکور کے مریدوں کی وجہ سے شورش ہوئی اور ہزاروں آدمیوں نے قلعہ کا دروازہ توڑ کر انھیں آزاد کرا دیا، آزادی کے بعد یہ جماعت دارالملک بیڑ کی طرف متوجہ ہوئی۔

حاجب خیرات کے سفر کے سلسلے کا دوسرا مقام استادآباد ہے۔ یہ نام اب مفقود ہے۔

---

[۱] بیڑ بہمنیوں کے زمانے میں ایک دارالملک تھا، چنانچہ جب سلطان ہمایوں شاہ کے زمانے میں شاہ حبیب اللہ مع تمام امرا کے قید سے رہائی پائی تو یہ جماعت ولایت بیڑ کی طرف متوجہ ہوئی (تاریخ برہان مآثر ص ۹۲-۹۳)

لیکن یہ قصبہ گلبرگہ کے نواحی میں تھا، مرحوم ڈاکٹر غلام یزدانی کا خیال ہے کہ استادآباد شاہ پور کا پرانا نام تھا، لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے نزدیک گوگی کا پرانا نام استادآباد تھا، در اصل گوگی میں ایک کتبہ برآمد ہوا ہے، یہ کتبہ قصبہ استادآباد کے ایک قلعہ سے تعلق رکھتا ہے جس کی بنیاد محمد بن تغلق شاہ (۷۲۵ - ۷۵۲) کے دور میں ۷۳۸ ہجری رکھی گئی تھی، یہ کتبہ ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب نے ۳۲ - ۱۹۳۱ کے Epigraphic Muslimee میں شائع کیا ہے، اس کتبے کے جو اجزا پڑھے جا سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہیں:

۱۔ حصن حصین و شکر متین مرخدا یرا کی در عہد پادشاہ آفتاب آثار و ماہ انوار و زحل اقتدار عطارد شعار قطب فلک مملکت .... [محمد] بن تغلقشاہ شید اللہ ..... دولتہ بنوالہ توفیق بنا رحصار خطۂ استادآباد کی کوکبۂ کنگرۂ بلند او با برج فلک

۲۔ ہم پہلوست و برج اثبات او باسیارات گردوں ہم باز و ہمشل کوہی است کہ تیغ خرشید کمر گیر [د] ...... [آب] دریا رفعت و اساس خاک ریز ...... [شش] دروازہ او مفاتح ابواب جنان دربارہ کی درباب بانی او معاد

۳۔ قلعۂ دین و ایمان فرمود من بنیٰ حصناً للہ للاسلام بنی لہ قصوراً [خا]ن اعظم خاقان معظم ...... معالیا وجعل لہ اکرام موالیا گردانید بتاریخ الغرۃ

۴۔ من ذی الحجہ سنہ ثمان وثلاثین وسبع مایۃ بکار فرمائی ضیا.. .... خطۂ مذکورہ مدت اعمار [با] عمارت شد

اس کتبے سے ظاہر ہے کہ ۷۳۰ھ میں استاد آباد ایک قصبے کی حیثیت رکھتا تھا، خلاصہ یہ کہ استاد آباد جو صدر شمس الدین محمد کا مستقر تھا اور جہاں صاحب خیرات نے اپنی فرہنگ دستور الافاضل مرتب کی تھی، وہ موجودہ گوگی یا شاہ پور کا قدیمی نام تھا، جو گلبرگہ سے ۵۰ کلومیٹر جنوب غرب میں واقع تھا۔ فاضل معاصر ڈاکٹر ڈیسائی کا خیال ہے کہ دیوگیر کا اس دور کا صوبہ دار ملک الشرق قوام الدین قتلغ خاں محمد بن تغلق شاہ کا استاد رہ چکا تھا۔ قصبہ استاد آباد کا یہ نام اسی مناسبت سے تجویز ہوا ہوگا۔

بہر حال یہ مسلم ہے کہ استاد آباد محمد تغلق کے دور میں دکن میں سیاسی اہمیت کا قصبہ تھا جس کی حیثیت خطے کے صدر مقام کی تھی، اسی قصبے میں فارسی کا مشہور لغت دستور الافاضل تالیف ہوا، اس بنا پر دکن کی ان چند فارسی کتابوں میں جو بہمنیوں کے اقتدار میں آنے کے قبل تالیف ہوئی تھیں، اس کو سب سے زیادہ اہمیت و شہرت حاصل رہی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحب خیرات کے ممدوح صدر شمس الدین محمد کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے، یہ بات واضح ہے کہ اس صدر کا ذکر کسی تاریخ میں موجود نہیں، جو کچھ دستور الافاضل کے مقدمے میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل صدر کا نام محمد اور لقب شمس الدین تھا، اس کا باپ احمد بن علی تھا اور وہ جنیدی تھا خود مولف کے بیان کے چند جملے ملاحظہ ہوں

تا سواد یار یک قصبۂ بیر کہ فی غیابت الجب عبارت از آنست نزول افتاد و چند روز چوں یوسف خود را بداں چاہ زنداں بی داد وداد ..... : ناگاہ صبح اجلال از مطلع اقبال طالع شد و صدر صدور الشرق شمس الدولۃ والدین ..... صدر باقدر، افضل فضلا، روی زمین، اکمل شعرا ہند وچین، منفق نفقۂ غربا،

مربی علماء و بلغاء، مکرم کرماء عصر، منشی نظم و نثر۔ شمس الدولہ والدین عزالاسلام والمسلمین قرۃ عین الوزراء المتقدمین ضیاء الملوک والسلاطین مخصوص بعنایت باری محمد احمد جنیزی۔

گوہر پاک احمد بن علی	صدر آفاق شمس دولت و دین
نثر طبوت ہمہ در منثور	نظم الفاظ تست در ثمین
ہمہ اشعار تو پر آبِ زلال	ہمہ ابیات تست ماء معین
رشک در ہای لفظ تو ہر سال	در پس پردہ می شود پروین
تیر گردوں مسخر قلمت	باد دائم ز فضلِ حق آمین

بظاہر شمس الدین محمد صدر استاد آباد محترم خانوادے کا رکن تھا، اس کے باپ احمد ابن علی کا شمار اس دور کے بڑے امراء میں تھا، حال ہی میں ایک کتبہ ملا ہے جو احمد بن علی جنیزی کے توسط سے ۷۲۰ ہجری میں تیار ہوا تھا، یہ کتبہ فی الکال ضلع بیدر کے قصبہ کلیانی میں موجود ہے۔ اس کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد بن علی نے محمد بن تغلق شاہ کے دور میں ملک الشرق قوام الدین قتلغ خاں کے عہد وزارت میں ایک مسجد بنوائی تھی۔ یہ کتبہ Indian EPigrhhy annual Rep. کے ۱۹۶۵ کے صفحہ ۱۰، ۲ پر شائع ہوا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

۱۔ یا اللہ امر ہذہ العمارۃ المسجد المبارکۃ المیمونۃ الشریف فی عہد سلطان السلاطین

۲۔ یا اللہ ظل اللہ فی العالمین ابو المجاہد فی سبیل اللہ محمد بن تغلقشاہ

۳۔ یا اللہ السلطان خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و اعلی امرہ و شانہ و در نوبت اقطاع ملک

۴۔ یا اللہ الشرق قوام الدولۃ والدین وزیر اقلیم دیوگیر مکنہ اللہ بندہ الضعیف النحیف الراجی الی رحمۃ

۵۔ یا اللہ تعالیٰ والغفران احمد علی جھنیری بتاریخ الغرۃ من صفر ختم اللہ بالخیر والظفر سنۃ ست وعشرین وسبعمایہ

قطعہ

ہستی ہمہ در راہ تو خواہم کردن
آنرا کہ تو ہستی چہ کم آید ہستی

یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ مسجد کا بانی احمد علی شمس الدین محمد صدر کا باپ تھا۔ اس کے قرائن حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ دستور الافاضل میں شمس الدین کے باپ کا نام ایک بار احمد بن علی لکھا ہے، اور دوسری بار خود صدر کے نام کے ساتھ محمد احمد کی شکل میں ملتا ہے، اور کتبہ میں بانی مسجد کا نام احمد علی بطور اضافت ابنی نقل ہے یعنی احمد بن علی، پس دونوں ناموں کی یکسانی دونوں کے ایک ہونے کا قوی قرینہ ہے۔

۲۔ دونوں کا زمانہ ایک ہے، شمس الدین ۷۴۳ھ، میں استادآباد کا صدر تھا۔ اگر ۱۶ سال قبل ۷۲۷ھ، میں اس کا باپ کلیانی یا اس کے نواح میں مسجد کی بنیاد ڈال رہا ہو تو عین قرین قیاس ہے۔

۳۔ دستور الافاضل میں صدر کی وطنی نسبت جھنیر درج ہے اور یہی نسبت خود

کتب میں موجود ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دستور الافاضل کے بارے میں کچھ تفصیل درج کر دی جائے۔

فارسی کی اس فرہنگ کی ترتیب الفبائی ہے، ہر حرف ایک باب قرار دیا گیا ہے، اس میں عربی کے الفاظ بھی شامل ہیں، اور اس لحاظ سے اس کو فارسی کے دوسرے قدیم فرہنگوں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے، اس لیے ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق کے ابواب بھی موجود ہیں لیکن یہ ابواب بہت مختصر ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اعراب کا التزام ہے، لیکن پورے اصول کی پابندی نہیں، شواہد شعری بالکل نہیں، اس وجہ سے مولف کا دعوی کہ یہ لغت فرہنگ قواس سے ضخیم ہے، بے بنیاد ہے۔

دستور الافاضل کی بنیاد پر فارسی زبان میں تصحیف کے بعض مسائل روشن ہو جاتے ہیں، مثلاً انگدان کے معنی لباس کے علاوہ نسناس ملتے ہیں، دستور میں اس کے معنی لباس درج ہیں، مگر موید الفضلاء میں اس کی تفصیل اس طرح آئی ہے[1]:-

انگدان بتازیش لباس خوانند؛ در فرہنگی است خلاف، و نوعی از عطر این ہر دو معنی اخیر از دستور الافاضل است جامع این لغات در دستور نذکور دید۔ در آں ورای آں مسطور است و درادات نیز ہمچنین است زیرا چہ گفتہ است کہ آنرا لباس خوانند و ورای آں نسناس را گویند یعنی دیو مردم و آں جانوری باشد وحشی شبیہ بہ آدمی۔

دستور میں انگدان کی تشریح اس طرح پر ہے:-

"انگدان لباس یعنی جا تری دراق"

دراصل راق، ران کی تصحیف ہے، اور صحیح لفظ ران فرہنگ قواس میں موجود ہے

---

[1] یہ بحث مقدمہ دستور الافاضل ص ۱۶ - ۱۷ پر درج ہے۔

صاحب مؤید الفضلا نے "دران" کو ورای آن پڑھا، اس سے قیاس کیا ہے کہ اس سے مراد ناشناس ہے۔

دستورالافاضل میں الفاظ کی تشریح کے دوران ہندوستانی کلمات درج ہوگئے ہیں، ہندوستانی الفاظ کی ساڑھے چھ سو سالہ قدیم شکلیں علم صوت شناسی کے لیے بطور خام مواد استعمال ہوسکتی ہیں، راقم نے پروفیسر شیرانی مرحوم کی پیروی میں دستور کے علاوہ تین اور فرہنگوں سے ہندوستانی الفاظ منتخب کرکے الگ مضامین کی شکل میں شائع کردیے ہیں، قواس اور دستورالافاضل پر مشتمل مضمون "نذر مالک رام" میں اور زفان گویا اور ادات الفضلا پر دو مضمون رسالۂ اردو کراچی میں شائع کیے ہیں، واضح ہو کہ (دستورالافاضل کی طرح فرہنگ قواس اور زفان گویا کے ایک ہی ایک مخطوطے ہیں، فرہنگ قواس راقم کی اعتنا سے بنگاہ ترجمہ ونشر کتاب تہران سے شائع ہو گئی ہے، اور زفان گویا بھی زیر ترتیب ہے)

دستورالافاضل اپنی اہمیت کی وجہ سے جہانگیری عہد تک کی اکثر فرہنگوں کے ماخذ میں شامل رہی ہے، یہاں تک کہ محمد بن قوام بن رستم نے ۷۹۵ء میں شرح مخزن اسرار لکھی اور اس میں اس سے کافی استفادہ کیا، بعد میں اس کی اپنی فرہنگ بحر الفضائل کے منابع میں یہ کتاب موجود ہے، اسی طرح بدر دہلوی نے ادات الفضلا، (تالیف ۸۲۲) بدر ابراہیم نے زفان گویا (تالیف قبل ۸۳۰ء) قوام الدین فاروقی نے شرف نامہ منیری کا تالیف قبل اور مولف تحفۃ السعادہ (تالیف ۹۰۴) فیضی سرہندی مولف مدار الافاضل (تالیف ۱۰۰۱) اور شیخ لاد دہلوی مولف مؤید الفضلا (تالیف ۹۳۵) وغیرہ نے دستورالافاضل سے استفادہ کیا ہے، آخری کتاب جس میں دستورالافاضل کا ذکر ملتا ہے، وہ فرہنگ جہانگیری ہے،

اس کا مولف جمال الدین حسین انجو شیرازی ہے، جس نے ۱۰۱۷ ہجری میں یہ فرہنگ جہانگیر کے نام معنون کی تھی، اس کے بعد دستور کا ذکر نہیں ملتا، ایسا گمان ہوتا ہے کہ دستور کا نسخہ نایاب ہوگیا تھا،

دستور الافاضل پر راقم نے ایک مفصل مضمون انگریزی میں مجلہ انڈو ایرانیکا میں شائع کیا تھا، جس میں اس فرہنگ کے خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی تھی، بعد میں جب یہ کتاب ایران سے شائع ہوئی تو اس کے مقدمے میں راقم الحروف نے مولف کتاب اور اس کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی، اس بنا پر اب ان امور کے دہرانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں، لیکن چونکہ ان دونوں جگہوں پر اس کتاب کی دکنی نسبت کا ذکر نہیں ہے، اس لیے اس کا کسی قدر تفصیلی ذکر ضروری قرار پایا،

خلاصۂ کلام یہ کہ دستور الافاضل کا شمار دکن کے فارسی ادب کی تاریخ میں اس لحاظ سے نہایت ضروری ہے کہ اس کی تالیف اسی خطے میں اس وقت ہوئی جب بہمنی حکومت کی داغ بیل نہیں پڑی تھی، اور چونکہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے کافی اہم اور اسی کے نتیجے میں کافی مقبول و متداول رہی ہے، اس لیے تاریخ میں اس کو اہم مقام حاصل ہونا چاہئے۔

اس گفتگو کے نتیجے کے طور پر چند امور قابل توجہ ہیں :۔

۱۔ دستور الافاضل عہد بہمنی سے قبل کی تالیف ہے، اس سے قبل عہد بہمنی کے قلیل فارسی ادب میں قابل توجہ اضافہ ہوا۔

۲۔ فارسی فرہنگوں میں دستور، اپنی قدامت کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس اعتبار سے شاید ہی کوئی ہم عصر تصنیف اس کے ہم پلہ ہو۔

۳۔ اس کتاب سے معلوم ہوا کہ خطۂ دکن کا صدر مقام استاد آباد تھا، یہ نام
ب باقی نہیں، البتہ ایک کتبے سے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے، تصنیف ہذا اس کا دوسرا
ہم ماخذ ہے۔

۴۔ محمد بن تغلق (۲۵ ۔ ۷۵۲) کے دور کے ایک صدر شمس الدین محمد کا ذکر
س کتاب میں ملتا ہے، اس صوبہ دار کا حال کسی اور ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتا،
اس لحاظ سے یہ کتاب ایک اہم ماخذ کا کام دیتی ہے۔

۵۔ دستور الافاضل کے مقدمے سے خاندان تغلق کے دکن میں سیاسی اقتدار
و نفوذ کا پتہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطالعہ دلچسپ اور اہم ہے۔

۶۔ اس کتاب سے اس بات کی مزید توثیق و تصدیق ہوئی کہ اس دور میں علماء
و فضلاء کی آمد و رفت شمالی ہند سے برابر رہتی تھی، حاجب خیرات کی طرح بسا اوقات
لوگ تلاش معاش میں دکن جاتے تھے، تصوف و عرفان کی تبلیغ کیلئے بھی اس سرزمین میں
کافی کشش تھی، شیخ راجو قتال، سید گیسو دراز وغیرہ اسی مقصد کے تحت دکن تشریف لائے تھے،
ضمناً یہ بات قابل ذکر ہے کہ بہمنی حکومت کی تاسیس سے قبل علماء و فضلاء اکثر
شمالی ہند سے آتے تھے، لیکن بہمنی حکومت کے قیام کے بعد اہل دکن کا علمی و ثقافتی
تعلق عرب، ایران اور دوسرے ممالک اسلامیہ سے براہ راست قائم ہو گیا، اس
کے نتیجے میں ہزاروں ایسے افراد ان ممالک سے دکن آئے جو کسی نہ کسی شعبۂ زندگی
میں امتیاز رکھتے تھے، قرون وسطیٰ میں دکن کی علمی و ادبی سرگرمی کے علاوہ سیاسی
تاریخ میں بھی اس تعلق کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، غیر ملکیوں کے اس سیلاب
کی وجہ سے بہمنی دور ہی میں ملکی و غیر ملکی سوال اتنا زور پکڑ گیا تھا کہ ان میں برابر

آویزش ہوتی رہتی تھی، یہاں تک کہ سلطان علاء الدین احمد کے دورحکومت (۸۳۸ - ۸۶۲) میں چاکنہ میں ملکیوں اور خارجیوں میں بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ اس کے نتیجے میں دو ہزار سے زیادہ غیر ملکی مقتول ہوئے، جن میں صاحب برہان مآثر کی روایت کے بموجب بارہ سو صحیح النسب سادات تھے،

اس مختصر گذارش کا اصل مقصد اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ دکن کا فارسی ادب ابھی بہت کچھ محتاج تحقیق و تنقیح ہے۔

یہود اور قرآن مجید

از ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

خلاق و عادات | خدا اور آخرت پر عدم یقین، نسلی فخر و برتری کے احساس اور نبوت و رسالت
پر اپنی خاندانی اجارہ داری سمجھنے کی بنا پر یہود میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں،
اور وہ ذہنی و اخلاقی اعتبار سے نہایت گھٹیا اور پست ہو گئے تھے، گذشتہ مباحث میں انکی
جو تصویر پیش کی گئی ہے اس سے بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ اخلاقی خوبیوں اور محاسن صفات
سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے تھے، اب ان کے معائب اور اخلاقی پستیوں کی مزید کچھ مثالیں تحریر
کی جاتی ہیں۔

کفران نعمت | محسن کی ناشکری اور نعمت کی ناقدری دین و شریعت کی نگاہ ہی میں جرم نہیں ہے
بلکہ دنیا کے عام اصول و دستور کے رو سے بھی اس کو بہت معیوب خیال کیا جاتا ہے، جانوروں
تک میں شکر گذاری اور اظہار ممنونیت کا جذبہ موجود ہوتا ہے، گھوڑے اور کتے بھی اپنے
مالکوں کی وفاداری کا دم بھرتے نظر آتے ہیں، انسان پر خدا نے گوناگوں احسانات کیے ہیں،
وہ اپنی پیدائش سے وفات تک خدا کی نعمتوں میں گھرا رہتا ہے، اسی لیے فرمایا :-

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ | اور تم کو ہر اس چیز میں سے دیا جس کو تم نے
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا | مانگا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ
(ابراہیم : ۳۴)

تو ان کو شمار نہ کر پاؤگے، بے شک انسان بڑا حق تلف ناشکرا ہے۔

یہ زمین و آسمان، چاند، سورج، ستارے، شجر و حجر، سمندر، دریا، پہاڑ، چوپائے، مویشی، پرندے اور مچھلیاں، غرض کائنات کی ہر ہر چیز خدا کی نعمت اور انسان کے تمتع کے لئے بنائی گئی ہے،

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ
مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً
وَّبَاطِنَةً (لقمان : ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اللہ نے اُن سب کو تمہارے نفع کے لیے کر دیا اور تم پر اپنی کھلی اور پوشیدہ (سب طرح کی) نعمتیں پوری کر دیں۔

یہود کو خدا نے اپنی ان عام اور ان گنت نعمتوں کے علاوہ متعدد مخصوص نعمتیں اور فضیلتیں بھی بخشی تھیں، جن کو اس مضمون کے شروع میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، توراۃ ان نعمتوں اور خداوندی احسانات کی یاددہانیوں سے بھری ہوئی ہے، قرآن مجید میں ہے:۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ
مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَنْ يُّبَدِّلْ
نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ
فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ
(بقرہ)

بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے ان کو کتنی کھلی نشانیاں دیں اور جو اللہ کی نعمت پانے کے بعد اس کو بدل ڈالے تو اللہ سخت پاداش والا ہے،

نعمت سے کتاب و شریعت اور ہدایت الٰہی مراد ہے اور اس میں تبدیلی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہود نے اس کو ٹھکرایا، اس کی ناقدری کی اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے اس کو کفر و شرک کا ذریعہ بنایا، نیز انھوں نے خدا کی تعلیم و ہدایت کی اصل حقیقت گم کر کے

اس کو کچھ سے کچھ بنا دیا، اس میں تحریف کرکے اس کے معنی و مطلب کو خبط کر دیا، اس پر بھی مفصل گفتگو ہو چکی ہے، یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے یہود سے سب سے بڑھکر توقع تھی کہ وہ خدا کے شکر گذار ہوں گے اور لوگوں کے احسانات کا بدلہ بھی احسان سے دیں گے مگر انھوں نے سب سے زیادہ ناشکری کا رویہ اختیار کیا، اس لیے قرآن نے جا بجا ان کو تنبیہ و ملامت کے انداز میں مخاطب کیا، صرف سورہ بقرہ میں تین جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

يَا بَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ	(بقرہ: ۴۰-۴۷-۱۲۲)	اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے خدا کی بڑی ناشکری اور اس کی نعمتوں اور احسانات کی سخت ناقدری کی تھی، چنانچہ ان کو یہ یاد دلایا جارہا ہے کہ دیکھو خدا نے تم کو اپنے خاص فضل و کرم سے جو نعمتیں عطا کی تھیں تم نے ان کو بالکل ہی بھلا دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے بھی بار بار ان کو خدا کے احسانات یاد دلائے ہیں اور کفران نعمت پر زجر و توبیخ کی ہے، اس کا بھی پہلے ذکر ہو چکا ہے، خود خداوند قدوس نے بھی ان کو ناشکری کے نتائج سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا، فرمایا:۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (ابراہیم: ۷)	اور یاد کرو جب تمھارے خداوند نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم نے شکر ادا کیا تو میں تمھیں بڑھاؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔

مگر اس آگاہی اور تنبیہ کے بعد بھی وہ کفران نعمت سے باز نہ آئے، اور جب ان کا خدا

اپنے سب سے بڑے محسن کے ساتھ یہ معاملہ تھا جس نے قدم قدم پر ان کی دستگیری کی تھی، اور ان پر انعامات کی بارش کی تھی تو وہ بندگانِ الٰہی کے احسانات کے کب شکر گذار ہو سکتے تھے،

نقضِ عہد قرآن مجید نے یہود کے اس اخلاقی جرم کا بار بار ذکر کیا ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد شکنی اور غداری ان کی مستقل روش اور عادتِ ثانیہ بن گئی تھی، انکی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہے، قرآن مجید میں ہے:

اَوَ كُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا	تو کیا یہ جب جب کوئی عہد کریں گے تو
نَّبَذَهٗ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ	ان کا ایک گروہ اس کو اٹھا پھینکے گا
لَا يُؤْمِنُوْنَ (بقرہ: ۱۰۰)	بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری جگہ ان کے نقض عہد کا ان لفظوں میں ذکر ہے:-

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ	پھر تم برگشتہ ہو گئے، مگر بہت تھوڑے لوگ
وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (بقرہ: ۸۳)	اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود سے جن باتوں کی پابندی کا عہد لیا گیا تھا، ان کو انھوں نے توڑ دینے کی حرکت اتفاقاً نہیں کی تھی بلکہ یہ اُن کی عادت مستمرہ اور مستقل صفت تھی، چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے، تو ان سے غیر جانبدار رہنے کا معاہدہ کیا، آپ خود تو اس معاہدہ کا برابر احترام کرتے رہے، لیکن یہود ایک دن بھی صدق دل سے اس کو نہ نباہ سکے، پہلے تو درپردہ وہ کفار مکہ کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہے اور آخر میں کھل کر ان کے جانبدار اور مسلمانوں کے دشمن ہو گئے، یہی عہد شکنی اور غداری آج بھی یہود کا قومی مزاج بنی ہوئی ہے، حالانکہ ان کے صحیفوں میں ایفائے عہد کی خاص طور پر تلقین کی گئی تھی، توراۃ کے احکام عشرہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی، اسی لیے قرآن نے جہاں یتیم کے مال میں خیانت سے

روکا ہے، وہیں عہد میں خیانت کرنے سے بھی منع کیا ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل: ۳۴)　　اور عہد کو پورا کیا کرو، کیونکہ عہد کی بازپرس ہوگی۔

سب سے مقدم اور اہم عہد وہ ہے جو روز ازل میں توحید اور اطاعتِ الٰہی کا خدا نے اپنے بندوں سے لیا تھا، بنی اسرائیل کو جب اس نے اپنی کتاب و شریعت سے نوازا تو اس فطری عہد کی از سر نو تجدید کی، فرمایا:-

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (بقرہ: ۴۰)　　اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔

توراۃ میں بھی اس کا ذکر ہے:

"تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کی شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کرونگا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا۔" (استثناء ۲۶، ۱۷)

اسی ضمن میں وہ سب عہد بھی آتے ہیں جو توراۃ پر مضبوطی سے قائم رہنے، خدا کے احکام و ہدایات کو بے چون و چرا ماننے، کتبِ الٰہی اور پیغمبروں خصوصاً نبی آخر الزماں اور قرآن مجید پر ایمان لانے کے بارہ میں یہود سے لیے گئے تھے،

دوسرا عہد وہ ہے جو باہم قول و قرار سے ہوتا ہے، اس کی پابندی بھی لازمی ہے، کیونکہ اجتماعی و تمدنی زندگی کا اسی پر دار و مدار ہوتا ہے، اگر باہمی معاہدوں کا احترام نہ کیا جائے تو اجتماعی و تمدنی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

تیسرا وہ عہد ہے جو اہل حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے اور جن کی ادائیگی کا عرفاً و دستوراً

ہر انسان مکلف ہوتا ہے اور خدا نے بھی ان کی ادائیگی کا حکم دیا ہے،

یہ سارے عہد ان سے بڑے اہتمام سے لیے گئے تھے، حضرت موسیٰؑ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سارے بنی اسرائیل یا ان کے سرداروں کو عبادت گاہ میں جمع کرتے، تابوت سامنے ہوتا اور وعظ و تذکیر کے بعد خدا اور لوگوں کو گواہ ٹھہرا کر ہدایت الٰہی کی تعلیم و تلقین کرتے اور نافرمانی اور عہد شکنی کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے، یہود کے بارہ قبیلے تھے، حضرت موسیٰؑ نے ہر قبیلہ کا ایک ایک نقیب (سردار) مقرر کر دیا تھا، تاکہ وہ ان کی نگرانی کر کے ان کو اللہ کے عہد پر استوار رکھیں اور اس سے منحرف نہ ہونے دیں[1]۔

یہود کی مکمل شریعت ان کے اور خدا کے درمیان ایک عہد و میثاق تھی، اسی لیے توراۃ کا نام بھی عہد نامہ پڑ گیا ہے، کیونکہ اس میں خدا کی اطاعت و بندگی کے اقرار، اس کے احکام و قوانین کی پیروی، اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے نیز بندوں سے کیے گئے قول و قرار پر استوار رہنے اور قرابتداروں اور دوسرے اہل حقوق کے حقوق کی ادائیگی کا عہد لیا گیا ہے۔

مگر یہود سے جو عہد اس درجہ اہتمام سے لیے گئے تھے اور جن پر قائم رہنے پر ان سے دنیا و آخرت کی ہر خیر و برکت کا خدا نے وعدہ فرمایا تھا، اس کی انھوں نے دھجیاں اڑا کر رکھ دیں، قرآن نے ان کی اس عہد شکنی پر ان کو اس بیوقوف عورت جیسا بتایا ہے جو اپنا سوت کاتنے کے بعد خود ہی اس کو تار تار کر دیتی ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا	اور اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرو
عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ	جبکہ تم نے اسے باندھا ہے اور قسموں کو
بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ	مؤکد کرنے کے بعد نہ توڑو، درانحالیکہ تم
اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ	اللہ کو اپنے اوپر ضامن اور گواہ بنا چکے ہو،

---

[1] مائدہ: ۱۲

مَا تَفْعَلُوْنَ، وَلَا تَكُوْنُوْا كَا
لَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ
قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (نحل: ۹۱-۹۲)

بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو اور
اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنے
سوت کو خوب مضبوط کاتنے کے بعد تار تار کر کے

یہود عہد شکنی سے آگے بڑھکر عہد فروشی بھی کرنے لگے تھے، دنیا کے معمولی فائدے اور حقیر مفاد کی خاطر ان کو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو فروخت کرنے میں ذرا بھی باک نہ ہوتا، ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ
اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا
اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ
وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ
اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (آل عمران)

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک
حقیر قیمت کے بدلے بیچتے ہیں ان کے لیے
آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے
بات کریگا، نہ انکی طرف قیامت کے دن
دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کریگا، ان کیلیے
دردناک عذاب ہے۔

یہ تو عہد شکنی و عہد فروشی کے اخروی انجام کا ذکر تھا، اس کے نتیجہ میں دنیوی ذلت و خواری بھی ان کے حصہ میں آئی، فرمایا:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ
لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ
قٰسِيَةً (مائدہ: ۱۳)

سو ان کے اپنے عہد کو توڑ دینے کے سبب
ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے
دلوں کو سخت کیا۔

کبر و غرور وہ غرور اور گھمنڈ کے نشہ میں بھی متوالے تھے، حالانکہ ان کو جو احکام دیے گئے تھے ان میں اس کی تاکید کی گئی تھی کہ "زمین پر اکڑ کر نہ چلیں اور تواضع و خاکساری اختیار کریں"[2]۔

---

[1] عام مفسرین کے نزدیک ان آیتوں میں خطاب مشرکین سے ہے لیکن قرینہ اور فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخاطب یہود ہیں۔
[2] بنی اسرائیل ۳۷

اسی بنا پر جب یہود اریحا میں فاتحانہ داخل ہو رہے تھے تو اللہ نے ان کو خاص طور پر حکم دیا کہ عاجزانہ اور سرفگندہ ہو کر جاؤ، مجسم خاکساری اور انکسار بن کر خدا کا شکر بجا لاتے اور استغفار کرتے ہوئے ملک میں داخل ہو اور تمھاری کسی ادا سے رعونت اور تمکنت کا اظہار نہ ہو، مگر اسکے باوجود وہ اکڑتے، اتراتے، شیخیاں کرتے اور فخر و غرور کے نشہ میں سرشار ہو کر داخل ہوئے۔[1]"

یہود کی تمام اعتقادی و عملی گمراہیوں کا سبب ان کا یہی پندار تھا کہ وہ ایک معزز اور برگزیدہ خاندان کے لوگ، انبیاء کی اولاد اور خدا کے لاڈلے اور چہیتے ہیں، اس لیے ان کیلئے ہر چیز روا ہے، انھوں نے اسی گھمنڈ میں آکر اپنے کو ایمان کے تقاضوں اور اطاعت و عمل کی ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش کر لیا تھا، اور اپنے علاوہ ساری دنیا کو حقیر و ذلیل سمجھتے تھے، قرآن نے ان کے اس پندار کا کئی جگہ ذکر کر کے اس پر ضرب لگائی ہے، فرمایا:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ	اور یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم خدا کے
نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (مائدہ: ۱۸)	بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔

توراۃ میں بھی ان کی اس ڈینگ اور شیخی کا ذکر موجود ہے۔

"تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو" (استثناء ۱۴: ۱)

"تو خداوند اپنے خدا کے لیے مقدس قوم ہے، اور خداوند نے تجھکو چن لیا تاکہ سب قوموں کی بہ نسبت جو زمین پر ہیں تو اس کے لیے خاص قوم ہو" (استثناء ۱۴: ۲)

"خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ پلوٹھا ہے" (خروج ۴: ۲۲)

ان کے پاس ایمان و یقین اور اطاعت و عمل کا تو کوئی سرمایہ نہ تھا لیکن دوسروں کو فریب دینے کے لیے اپنی پاکی داماں کی حکایت زور شور سے بیان کرتے اور اپنی خاندانی برتری اور تقدس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے تھے، ارشاد ہے

---

[1] بقرہ: ۵۸ و ۵۹ و اعراف: ۱۶۱ و ۱۶۲

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ	ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا
اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ	پاکیزہ قرار دیتے ہیں بلکہ اللہ ہی ہے جو
يَّشَآءُ (نساء۔ ۴۹)	پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

اسی استکبار نے ان کو سب سے بے نیاز یہاں تک کہ خود خدا سے بھی مستغنی کر کے اس کی نافرمانی ور طغیان پر آمادہ کر دیا تھا، وہ اپنی عظمت و برتری اور خاندانی و دینی فضیلت کو خدا کا فضل و انعام سمجھنے کے بجائے اپنی محنت و کوشش کا ثمرہ سمجھتے تھے، اور اس پر اس قدر نازاں تھے کہ کسی اور دین و شریعت کو تسلیم کرنے کے لیے مطلق تیار نہ تھے، ان کے نزدیک دین بس ان کا دین، کتاب صرف انکی کتاب اور شریعت محض ان کی شریعت تھی، اسی لیے وہی ہدایت یافتہ اور تمام لوگ گمراہ تھے، فرمایا:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى	اور انھوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی
تَهْتَدُوْا (بقرہ: ۱۳۵)	ہو جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

یہی تکبر قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ تھا کہ جب وہ خود حامل شریعت اور مقدس لوگ ہیں تو دینی و مذہبی پیشوائی کا حق ان کے سوا اور کسی کو کیسے مل سکتا ہے۔ اور ان کو کسی نئی کتاب اور نئے نبی پر ایمان لانے کی کیا ضرورت؟ نبوت و رسالت ان کی اجارہ داری ہے، ان کے خاندان کے باہر نہ کوئی نبی ہو سکتا ہے اور نہ ان کو نظر انداز کر کے خدا کسی اور گروہ میں رسول مبعوث کر سکتا ہے۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا	تو کیا جب جب کوئی رسول آیا تمھارے
لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ	پاس وہ باتیں لیکر جو تمھاری خواہشوں کے
فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا	خلاف ہوں گی تو تم تکبر کرو گے؟ سو تم نے
تَقْتُلُوْنَ (بقرہ: ۸۷)	ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگے

اسی زعم باطل میں مبتلا ہو کر وہ آخرت کی فکر اور جزاو سزا سے بالکل غافل اور بے پروا ہو گئے تھے، حد یہ ہے کہ ان کے مقدس صحیفے اور نوشتے بھی حشر و نشر اور جزاو سزا کے ذکر سے تقریباً خالی ہیں، چنانچہ انھوں نے یہ غلط عقیدہ ایجاد کر لیا تھا کہ وہ جو چاہیں کریں ان کے عقائد و اعمال جیسے کچھ بھی ہوں ان سے کوئی مواخذہ اور بازپرس نہ ہوگی، نجاتِ اخروی ان کا مخصوص حق ہے، جنت کا خدا نے ان کو لائسنس دے رکھا ہے۔

وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ — اور کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں داخل ہو سکتے مگر وہی جو یہودی ہیں یا نصرانی۔

نجات کے معاملہ میں ان کا سارا اعتماد اعمال کے بجائے گروہی نسبتوں پر تھا، ان کا خیال تھا کہ ان کو دوزخ کا عذاب سرے سے لاحق ہی نہیں ہو سکتا اور اگر لاحق بھی ہوا تو گئو سالہ پرستی کے جرم میں محض چند روز کے لیے۔ یہی جھوٹے سہارے اور موہوم آرزوئیں اور تمنائیں ان کے لیے دین بن گئی تھیں،

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا	یہ اس وجہ سے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ
النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ	کی آگ بس گنتی کے چند دن چھوئے گی، یہ جو
وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا	کچھ گڑھتے ہیں اس نے ان کو ان کے دین
يَفْتَرُونَ (آل عمران: ۲۴)	کے بارہ میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔

اسی فریب اور خام خیالی کی وجہ سے وہ بھی نصاریٰ کی طرح شفاعت اور کفارہ کا باطل عقیدہ رکھنے لگے تھے، ان کے مذہبی صحیفہ تالمود میں ہے:-

"قیامت کے دن ابراہیم در دوزخ پر تشریف رکھتے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں گرنے نہ دیں گے .... جہنم کی آگ اسرائیلی گنہگاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی"

اور جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے :۔

"بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمال حسنہ کی بنا پر بخش دیے جائیں گے۔"

حسد یہود کو سب سے زیادہ حسد مسلمانوں سے تھا، وہ ان کے خلاف حسد کی آگ میں اس لیے جل بھن رہے تھے کہ اللہ نے انکو ایمان و قرآن کی دولت عطا کی تھی اور عربوں میں اپنے دین اور آخری نبی کو مبعوث کیا تھا، ان کا سارا غصہ اس پر تھا کہ انبیاء تو ہمیشہ بنی اسرائیل میں ہوتے رہے ہیں اور کتاب و شریعت سے ہمیشہ وہی نوازے جاتے رہے ہیں، اب یہ نعمت ان سے چھین کر عربوں اور اسماعیلیوں کو کیوں دی جا رہی ہے، وہ جانتے تھے کہ نبوت کے ان کے خاندان سے نکل جانے کے بعد ان کی دینی پیشوائی اور دنیوی اقتدار باقی نہیں رہے گا، اس لیے وہ آگ بگولہ ہو کر مسلمانوں سے حسد کرنے لگے، قرآن نے ان کو بتایا کہ نبوت کسی کا موروثی حق نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا فضل ہے اور وہ اپنا فضل جس کو بھی چاہے عطا کرے، تم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ	کیا خدا کے اقتدار میں کچھ ان کا بھی دخل ہے
فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا	کہ یہ لوگوں کو کچھ بھی دینے کو تیار نہیں؟
أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ	کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں اس فضل
مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ	پر جو اللہ نے ان کو دیا ہے، سو ہم نے تو
فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ	آل ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت بھی دی ہے
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم	اور ہم نے ان کو ایک عظیم سلطنت بھی
مُّلْكًا عَظِيمًا (نساء: ۵۳-۵۴)	عطا کی ہے۔

ؔ عموماً مفسرین نے آل ابراہیمؑ سے یہاں بنو اسرائیل کو مراد لیا ہے، مگر بنو اسماعیل کو مراد لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اور جب ان کے علی الرغم خدا نے اپنی ہدایت و شریعت اور امامت و سیادت بنی اسماعیل میں منتقل کر دی تو وہ جوشِ حسد میں اس تگ و دو میں لگ گئے کہ مسلمانوں سے یہ نعمت چھین لی جائے ان کی ان کوششوں کو جو وہ مسلمانوں کو اس رحمت خداوندی سے محروم کرنے کے لیے کر رہے تھے بعض سادہ لوح اور نیک دل مسلمان اخلاص اور ہوا خواہی پر محمول کرتے تھے، اس لیے فرمایا کہ یہ ساری سرگرمیاں کسی خلوص اور خیر خواہی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان کے جذبۂ حسد کا کرشمہ ہیں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ	بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ
لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ	تمہارے ایمان کے بعد پھر تم کو کفر کی حالت
كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ	میں لوٹا دیں، محض اپنے حسد کی وجہ سے،
أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ	حق کے اچھی طرح واضح ہو جانے کے
لَهُمُ الْحَقُّ (بقرہ: ۱۰۹)	باوجود۔

ان کو بھلا تم پر خیر و برکت کا نازل کیا جانا کب گوارا ہو سکتا ہے۔ (بقرہ: ۱۰۵)

اسی حسد نے ان کو قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی شدید مخالف بنا دیا تھا حالانکہ قرآن مجید ان کی کتابوں کی پیشین گوئیوں کے مطابق نازل ہوا تھا۔

یہود صرف مسلمانوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حاسد نہ تھے بلکہ ان کا حسد خود اپنے پیغمبروں سے بھی رہا ہے، عہد عتیق کی شہادت ملاحظہ ہو:۔

"انھوں نے خیمہ گاہ میں موسیٰ کے برادر و خداوند کے مقدس مرد ہارون پر حسد کیا۔" (زبور ۱۰۶-۱۶)

اور عہد جدید میں بھی ان کے رشک و حسد کا ذکر ہے:۔

"یہودیوں نے حسد میں آکر بازاری آدمیوں میں سے کئی بدمعاشوں کو اپنے ساتھ لیا اور بھیڑ لگا کر شہر میں فساد کرنے لگے۔" (اعمال - ۱۷: ۵)

"یہودی اتنی بھیڑ دیکھ کر حسد میں بھر گئے" (اعمال - ۱۳ : ۵۱)

تعصب یہود کے کبر و غرور اور رشک و حسد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے انکی ضد، ہٹ دھرمی اور ان کا نسلی و قومی تعصب اور گروہی عصبیت بھی ظاہر ہوتی ہے، وہ قرآن کی مخالفت نہ تو کسی غلط فہمی کی بنا پر کر رہے تھے اور نہ اس میں ان کے خلوص اور حق پسندی کا کوئی دخل تھا، ان کو اس کے حق و ناحق ہونے سے کوئی بحث نہ تھی بلکہ بحث صرف یہ تھی وہ ان کے خاندان اور گروہ کے اندر کیوں نہیں نازل کیا گیا، اسی لیے جب ان کو قرآن پر جسے خدا ہی نے اتارا تھا، ایمان لانے کی دعوت دیجاتی تو وہ کہتے کہ ہم تو اسی چیز کو مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی ہدایت کی محض اس تعصب کی وجہ سے مخالفت کرنا کہ وہ ہمارے خاندان اور گروہ کے بجائے دوسرے خاندان میں کیوں اتاری گئی کھلی ہوئی دھاندلی اور صریح زیادتی ہے، فرمایا:-

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ	کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے
اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	اپنی جانوں کو بیچ ڈالا کہ وہ انکار کر رہے ہیں
بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ	اس چیز کا جو اللہ نے اتارا ہے محض اس ضد
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ	کی بنا پر کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے
(بقرہ : ۹۰)	جس پر چاہا اپنا فضل اتارا۔

ان کے لیڈر اسی قومی تعصب اور گروہی و نسلی عصبیت کی آگ اپنی قوم کے اندر بھڑکا رہے تھے، کہ اپنے دائرہ کے باہر کسی کی بات ماننا اور کسی غیر اسرائیلی کی نبوت کے دعوی کی تصدیق کرنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، ورنہ جو دینی سیادت و پیشوائی ہم کو حاصل ہے وہ انکو حاصل ہو جائے گی اور اگر ہم نے غیر اسرائیلی نبی کے حق میں کوئی بات اپنی زبان سے نکالی تو مسلمان

قیامت کے دن اس کو ہمارے خلاف حجت بنائیں گے، قرآن نے ان کے اس اندھے تعصب پر اس طرح تنبیہ کی کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہے جس کی تم کو پیروی کرنی ہے، خواہ وہ کسی اسرائیلی نبی کے ذریعہ سے آئی ہو یا اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے، نجات و فلاح کی راہ خدا کی ہدایت پر موقوف ہے، نہ کہ یہودیت و نصرانیت پر؟ پھر کیوں ایسی تنگ نظری اور گروہی عصبیت کی باتیں کرتے ہو؟ فرمایا:-

وَلَا تُؤْمِنُوْا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ	اور تم لوگ اپنے دین کو ماننے والوں کے علاوہ
قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ	کسی کی بات کو نہ مانو! کہو کہ ہدایت تو اللہ
يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ	ہی کی ہدایت ہے، ورنہ اس طرح کی چیز کسی
اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ	اور کو بھی مل جائے جس طرح کی چیز تم کو ملی ہے
اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ	یا وہ تم سے تمہارے رب کے حضور حجت
مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	کرسکیں، کہو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے
(آل عمران: ۷۳)	وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ ہی بڑی وسعت والا اور علم والا ہے۔

بغض و عداوت حسد اور تعصب کا لازمی نتیجہ بغض و عداوت ہے، یہ آگ بھی یہود کے دل میں نہایت شدت سے بھڑک رہی تھی، ان کو سب کد تھی یہاں تک کہ باہم بھی جیسا کہ آگے آئیگا ایک دوسرے سے سخت نفرت رکھتے تھے لیکن ان کے غیظ و غضب اور بغض و کینہ کا خاص نشانہ مسلمان تھے، وہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں مشرکین کے ہم پلہ بلکہ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے، فرمایا:-

وَلَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ	تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے
عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ	زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے
وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا - (مائدہ - ۸۲)	

مشرکین کی اسلام دشمنی کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ حامل کتاب و شریعت ہو کر بھی مسلمانوں کی عداوت میں اس قدر سرگرم تھے کہ ان کے خلاف مشرکین سے پینگیں بڑھانے میں ان کو شرم نہ آتی، ارشاد ہے۔

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (مائدہ ۔ ۸۰)	تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔

وہ اس دشمنی میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی حمایت کرتے تھے، اور بے تکلف ان کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ سمجھتے تھے،

وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (نساء)	اور وہ کافروں کے بارہ میں کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہی لوگ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عہد نبویؐ میں غیر جانبداری کے معاہدہ کے باوجود انھوں نے کفار قریش سے سازباز شروع کر دی تھی، قرآن نے ان کے اس انتقام اور دشمنی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ لوگ خود شرک و بت پرستی میں ملوث ہو کر راہ ہدایت ترک کر چکے ہیں، اس لیے ایمان کے بجائے ان کو کفر و فسق زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ (مائدہ ۔ ۵۹)	اے اہل کتاب تم ہم پر بس اس بات کا غصہ نکال رہے ہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی اور اس چیز پر جو پہلے اتاری گئی، اور تم میں اکثر نافرمان ہیں۔

ان کو مسلمانوں کی کامیابی اور ان کے آرام سے رنج ہوتا ہے اور ان کی شکست اور نقصان

سے خوشی ہوتی ہے، اس لیے وہ ان کے اندر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے کے لیے پیش پیش رہتے ہیں ٹھیک یہی کیفیت آج بھی ان کی ہے، وہ سب کو انگیز کر سکتے ہیں، سب سے مصالحت کر سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے خلاف سازش اور ریشہ دوانی سے باز نہیں آسکتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی ان سے ترک موالات کی تلقین کی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی کو
بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ	رازدار نہ بناؤ، یہ لوگ تمہارے اندر فساد
خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ	پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے
الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي	یہ تمہارے دکھ پہنچنے کے آرزومند رہتے ہیں
صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ	انکی عداوت انکے مونہوں سے ظاہر ہو پڑتی
(آل عمران - ۱۱۸)	ہے اور جو کچھ یہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں

وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے

اختلاف اور فرقہ بندی | قرآن مجید نے اہل کتاب خصوصاً یہود کے اختلاف و افتراق میں پڑ جانے کا کئی جگہ ذکر کیا ہے، ایک جگہ فرمایا:-

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	اور نہیں متفرق ہوئے اہل کتاب مگر اسکے بعد
إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (بینہ)	کہ ان کے پاس واضح دلیل آگئی۔

دوسری جگہ ہے:-

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ	بیشک اللہ کا اصل دین اسلام ہے، اہل کتاب
وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	نے تو اس میں اختلاف علم کے آجانے کے بعد
إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ	محض باہمی ضد اور سرکشی کے سبب سے
بَغْيًا بَيْنَهُمْ (آل عمران - ۱۹)	کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے خدا کے دین و شریعت کے بارہ میں اختلاف کیا اور اسکے نتیجہ میں ان کے اندر تحزب اور گروہ بندی پیدا ہوگئی، ان کے مختلف خاندان اور قبیلے بھی باہم گتھم گتھا رہتے تھے، ان کے اختلافات کو رفع کرنے کے لیے اللہ نے اپنی کتابیں اتاریں مگر حق کو جان لینے اور واضح دلائل آجانے کے باوجود ان کے اختلافات اور گروہ بندی ختم نہ ہوئی بلکہ حرب و ضرب اور قتل و خون ریزی تک نوبت پہنچ گئی، اور دوسروں میں فساد و اختلاف پیدا کرنا ان کا قومی مزاج بن گیا ہے، جس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

اپنے بھائیوں کا قتل اور انکی جلاوطنی یہ پہلے گذر چکا ہے کہ انبیاء وصلحا کے خون ناحق سے یہود کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، اب یہ دکھانا مقصود ہے کہ وہ اپنے بھائی بندوں کو بھی قتل کرتے اور جلاوطن کرتے تھے، حالانکہ اس جرم شنیع سے باز رہنے کا ان سے خدا نے عہد لیا تھا، فرمایا:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا	اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ
تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ	اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور نہ اپنوں
أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ	کو اپنی بستیوں سے نکالو گے، پھر تم نے
وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ (البقرہ۔۸۴)	(ان باتوں کا) اقرار کیا اور تم اسکے گواہ ہو

سورۂ مائدہ میں قتل کی مذمت اور قصاص کے حکم کے توراۃ میں بیان کیے جانے کی صراحت کی گئی ہے[1]، موجودہ تورات میں بھی اس کا ذکر ہے:

"تو خون مت کر" (خروج۔ ۲۰ : ۱۳)

"بے گناہ کا لہو تیری زمین پر جسے خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے بہایا نہ جائے کہ خون تجھ پر ہو" (استثنا۔ ۱۹ : ۱۰)

اور قصاص کا ذکر اس طرح ہے:۔

---

[1] آیات ۳۲ – ۴۵

"جو کوئی آدمی کا لہو بہائے آدمی ہی سے اس کا لہو بہایا جائے گا کیونکہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے"۔ (پیدائش ۔ ۹ : ۶)

اور تالمود میں ہے :۔

"جو کوئی کسی ایک اسرائیلی کو بھی مار ڈالے گا اس کے لیے یوں سمجھا جائے گا کہ گویا اس نے ساری نسل اسرائیلی کو قتل کر دیا"۔

اسی طرح اعضاء وجوارح کے قصاص کا بھی ذکر ابواب خروج، احبار اور استثناء میں ملتا ہے اور اس عہد کے اقرار و شہادت کا بھی توراۃ میں ذکر ہے:

"وہ بولے کہ سب کچھ جو خداوند نے فرمایا ہے ہم کریں گے اور تابع رہیں گے" (خروج ۲۴ : ۷)

لیکن انھوں نے اس عہد و میثاق کی دھجیاں نہایت بے دردی سے بکھیر دیں۔ ارشاد ہے

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ	پھر تم ہی لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو
اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا	اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں
مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ	سے نکالتے ہو اور ان کے خلاف حق تلفی
عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ	اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ	کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ	ہو کر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دیکر چھڑاتے ہو
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ	حالانکہ ان کا نکالنا ہی تمہارے اوپر حرام تھا
وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (بقرہ : ۸۵)	تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک

توراۃ کے باب سلاطین میں یہود کی مختلف شرارتوں کے ضمن میں اس کا بھی ذکر ہے، ملاحظہ ہو

"پھر انھوں نے نہ سنا بلکہ اپنے باپ دادوں کی گردن کشی کی مانند جو خداوند اپنے خدا پر ایمان نہ لائے تھے گردن کشی کی"۔ (سلاطین ۔ ۱۷ : ۱۴)

جب یہودیہ اور اسرائیل کی علیحدہ علیحدہ سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان میں سخت کشمکش تھی اور یہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتیں اور ان میں برابر قتل و خون ریزی ہوتی رہتی، عہد نبوی میں بھی ان کے جو قبیلے مدینہ میں آباد تھے، ان میں بھی باہم خانہ جنگی رہتی تھی، اس زمانہ میں انصار کے دو بڑے قبیلے اوس و خزرج بھی مدینہ میں تھے، ان میں برابر قبائلی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، ان کی جنگوں میں یہود کے قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر اوس کے حلیف ہوتے اور بنو قینقاع خزرج کا حلیف ہوتا، اس طرح یہ اپنے حلیفوں کے ساتھ ہوکر اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرتے اور جلا وطن کرتے تھے۔ ایک طرف تو خدا کے حکم اور اس سے باندھے ہوئے عہد کو یوں توڑ تاڑ رہے تھے اور دوسری طرف ان لوگوں کو جنھیں دشمن قید کر لیتے تھے فدیہ دیکر چھڑا بھی لیتے تھے، اور کہتے کہ اس کی ان کو توراۃ نے تعلیم دی ہے، حالانکہ توراۃ میں جس طرح یہ تعلیم تھی اسی طرح اس میں بھائیوں کے قتل کرنے اور جلا وطن کرنے کی ممانعت بھی تھی، اسی کو قرآن نے ایمان ببعض الکتاب اور کفر ببعض الکتاب کہا ہے کہ جو حکم ان کی خواہش کے موافق ہوتا اس کو مان لیتے تھے اور جو خواہش کے خلاف ہوتا اس کو بالائے طاق رکھ دیتے۔

فساد فی الارض | یہود فتنہ و فساد کا سرچشمہ تھے، قرآن نے انکی اس عادتِ بد کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ	اور ہم نے ان کے اندر دشمنی اور کینہ قیامت تک
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا	کے لیے ڈال دیا ہے، جب جب یہ لڑائی کی کوئی
لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ	آگ بھڑکائیں گے اللہ اس کو بجھا دیگا، یہ زمین میں
فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ	فساد کرنے میں سرگرم ہیں اور اللہ فساد برپا
(مائدہ : ۶۴)	کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فساد خدا کے قانون سے انحراف و بغاوت کا نام ہے، جب کوئی قوم حق و عدل کا رویہ ترک

کر کے قانون الٰہی کی خلاف ورزی کرتی ہے تو اس کے اندر فساد رونما ہوتا ہے، اور اس دنیا کا تکوینی و تشریعی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زمین سے صلاح و فلاح اور خیر و برکت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اسی لیے خدا وند تعالیٰ نے قانون الٰہی کو توڑ کر دنیا کے امن و نظام میں خلل نہ پیدا کرنے کی انکو اس طرح ہدایت کی تھی:۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ　　کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور نہ پڑھو

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۱﴾　　زمین میں فساد مچانے والے بن کر۔

لیکن ان کی تاریخ فسادات اور نظام عالم میں خلل پیدا کرنے کے واقعات سے بھری ہوئی ہے، سورہ بنی اسرائیل میں ان کے دو فساد کا ذکر ہے، فرمایا:۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَتُفْسِدُنَّ　　اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں اپنا یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ

فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ﴿۲﴾　　دو مرتبہ زمین میں فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے

اس زمانہ میں بھی انکے اندر زبردست فساد اور بگاڑ پیدا ہو گیا جب فلسطینیوں نے ان کا مقدس تابوت چھین لیا تھا،

دوسروں میں فساد برپا کرنا بھی انکا محبوب مشغلہ تھا، حضرت موسیٰ تورات لینے گئے تو ان لوگوں نے ایک بچھڑے کی پرستش شروع کر کے ان میں اور انکے جانشین اور بھائی حضرت ہارونؑ میں نفرت اور بگاڑ پیدا کرنا چاہا،[۱] اسی طرح جب عہد سلیمان میں خدا کی کتاب کو پس پشت ڈالکر لوگ سحر و شعبدہ اور سفلیات میں پڑے تو دو فرشتوں ہاروت و ماروت سے محبت و نفرت کا علم حاصل کیا تاکہ میاں بیوی میں تفریق اور جدائی پیدا کر کے معاشرت و تمدن کے نظام کی بنیادیں کھوکھلی کر سکیں،[۲] مسلمان انکی مفسدانہ سرگرمیوں کا سب سے زیادہ ہدف تھے اور یہود نے انکے درمیان فساد اور بگاڑ پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا،[۳] عہد نبوت کے مسلمانوں میں نفاق کی تخم ریزی اور عہد عثمانی کے فتنوں کو ہوا دینے والے یہی لوگ تھے، اس زمانہ کا خاص فتنہ اشتراکیت جو قوموں اور حکومتوں میں تصادم پیدا کرنے میں اپنی نظیر آپ ہے، ان ہی کے ذہن کی پیداوار ہے۔　(باقی)

---

[۱] اعراف: ۱۴۲ و طٰہٰ: ۸۵ تا ۹۴　[۲] بقرہ: ۱۰۲　[۳] آل عمران: ۱۱۸

وفیات

نواب علی یاور جنگ بہادر

از سید صباح الدین عبد الرحمن

گذشتہ ماہ دسمبر میں نواب علی یاور جنگ بہادر گورنر بمبئی کا انتقال ہو گیا،
۱۹۴۷ء کے بعد حکومت ہند کی طرف سے ان کو بڑے بڑے عہدے ملتے رہے، وہ امریکہ میں ہندستان
کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجے گئے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بنائے گئے، بمبئی کی گورنری
کے عہدے پر مامور ہوئے، اور اسی ریاست کے گورنر کی حیثیت ہی سے عالمِ بقا کو سدھارے،
اور معلوم نہیں کتنے دوسرے اعزاز ان کو حاصل ہوتے رہے، حکومت ہند کے معتمد ترین حکام
میں ان کا شمار ہوتا رہا،

میں نے ان کو کسی بڑے عہدیدار کی حیثیت سے نہ جانا اور نہ پہچانا، بلکہ ان سے نواب
عماد الملک کے نواسے کی حیثیت سے ملتا رہا، نواب عماد الملک دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ
کے پہلے صدر رہے، جن کا احسان دار المصنفین پر بہت بڑا تھا، ان ہی کی مساعی جمیلہ سے علامہ
شبلیؒ کی وفات کے بعد ان کا ماہانہ وظیفہ دار المصنفین کے نام منتقل ہوا، جس سے اس کی تاسیس
میں بڑی مدد ملی، وہ دار المصنفین کے بڑے قدر داں اور سرپرست رہے، جب انکی وفات
۳ر جون ۱۹۲۶ء کو ہوئی تو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے معارف کے شذرات

میں اپنی غیرمعمولی سوگواری کا اظہار کیا، جس میں اُن کے اور بہت سے فضائل اور محاسن کے ساتھ مولانا شبلی، دارالمصنفین اور خود ان سے جو تعلقات رہے اس کا ذکر بہت ہی خوش عقیدگی سے کیا، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں :-

"آخر عمر میں مولانا شبلی مرحوم کی تحریک سے انھوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا جو سولہ پاروں تک ضعف بصارت و علالت کی وجہ سے رک گیا، اس ترجمہ میں بالکل بائیبل کی زبان اختیار کی ہے۔"

"مولانا شبلی مرحوم سے ان کا تعلق سرسید کے زمانہ سے اور ان ہی کے واسطے سے ہوا تھا، چنانچہ مرحوم ان کی بڑی قدر فرماتے تھے،"

"الفاروق کی تالیف میں ان کی حوصلہ افزائی کو بھی دخل ہے، جامعہ عثمانیہ جس کا پہلا نام حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی پڑا تھا، اس کے نصاب اور خاکہ کی تیاری کے لیے مولانا شبلی مرحوم کا انتخاب ان ہی کے اشارہ سے ہوا تھا، اور ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی مرحوم کی ماہانہ تنخواہ میں دو سو کا اضافہ نواب صاحب ہی کی تحریک سے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے منظور فرمایا۔"

مولانا شبلی مرحوم سے اس تعلق اور دارالعلوم ندوہ کی تعلیم میں مشرقی و مغربی علوم و فنون کی جامعیت کی بنا پر اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے ندوہ کو اپنا قیمتی کتب خانہ عطا فرمایا اور ہر موقع پر طلباے ندوہ کی سرپرستی و قدردانی کرتے رہے۔ مولانا شبلی کی نسبت اور ایک علمی مرکز ہونے کی حیثیت سے انھوں نے دارالمصنفین کے ساتھ ابتدا ہی سے اپنا شغف ظاہر فرمایا اور جس کو آخر زندگی تک قائم رکھا، چنانچہ جب دارالمصنفین قائم ہوا تو ان ہی کی سفارش سے مولانا شبلی مرحوم کی تین سو ماہوار رقم سرکار

آصفیہ نے دارالمصنفین کے نام منتقل کر دی، اس کے ساتھ خاص اپنی جیب سے انھوں نے اس کے لیے سالانہ سو روپے کی رقم مقرر فرمائی اور مجھے لکھا کہ دارالمصنفین پہلا انسٹیٹیوشن ہے جس کیلئے میں یہ مستقل رقم مقرر کرتا ہوں، لیکن یہ رقم ان کے حوصلہ کے مطابق نہ تھی، اس لیے اس پر ہمیشہ تاسف وندامت کا اظہار کرتے رہے۔ وہ دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کے پہلے صدرنشین تھے، اور آخر تک اس تعلق کو قائم رکھا، معارف کا بالاستیعاب مطالعہ فرماتے اور جو مضمون پسند آتا اس پر خوشی ظاہر کرتے، اس کے لکھنے والے کے حالات دریافت فرماتے، مولانا عبدالباری ندوی سے ان کا تعارف اسی طرح ہوا، دارالمصنفین کی تصنیفات جب انکی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں تو ان کو لازمی طور پر پڑھتے تھے۔ اور اگر ضعف وعلالت کی وجہ سے خود نہیں پڑھ سکتے تھے تو دوسروں سے پڑھوا کر سنتے تھے، ان تصنیفات کے پہنچنے پر مجھے جو خط لکھتے اس میں ان کی داد دیتے تھے، اور اپنی مسرت کا اظہار کرتے تھے۔"

خود سید صاحب اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ

"آخر عمر تک نواب صاحب کے علمی تعلقات کا سلسلہ برابر جاری رہا، خصوصاً حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جو نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوئی، انکی شفقتِ بزرگانہ سے یہ تعلقات برابر بڑھتے رہے۔ خط وکتابت کا آغاز اس طرح ہوا کہ استاذ مرحوم کی وفات پر جو اردو مرثیہ میں نے لکھا تھا وہ ان کے پاس بھیجا، جواب میں ایک ایسا نکتہ جو الاقلم فرمایا جو ہمیشہ میرے لیے رہنما ثابت ہوا۔ فرمایا عرض ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہیے جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہ ہو سکے گا، حیدرآباد جب جانا ہوا تو شفقت سے ملتے، دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے، اسلامی علوم وفنون، تمدن و

تاریخ گفتگو کا موضوع ہوتا۔ ہمیشہ اپنے مکتوبات سے ممنون فرماتے۔"

نواب علی یاور جنگ کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ محض اس لیے رہا کہ وہ علامہ شبلیؒ اور سید صاحبؒ کے بہت بڑے قدر دان اور دارالمصنفین کے بہت بڑے مربی کے نواسے تھے،

وہ جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، تو ان کا ایک خط دارالمصنفین آیا کہ بزم صوفیہ ان کے نام سے وی۔پی بھیجی جائے، مجھکو تعجب ہوا کہ ان کو تصوف سے کیسے ذوق پیدا ہو گیا، میری پہلی ملاقات دہلی میں ان سے انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے ایک جلسہ میں ہوئی، میں اس کونسل میں دارالمصنفین کی نمایندگی بارہ سال تک کرتا رہا، جب نواب علی یاور جنگ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تو اس کونسل کے وہ بھی رکن ہوئے، وہ پہلی دفعہ اس کے جلسہ میں شریک ہوئے تو جب ان کو معلوم ہوا کہ میں دارالمصنفین سے آیا ہوں تو جلسہ کے بعد اور تمام معزز اراکین کو نظر انداز کرکے میری طرف بڑھے، دارالمصنفین سے متعلق پوری تفصیلات حاصل کرتے رہے، کہنے لگے کہ ان کو دارالمصنفین سے بڑی دلچسپی رہی ہے، اس لیے کہ جب علامہ شبلی میرے نانا عماد الملک سے ملنے آتے تو وہ مجھکو اپنی گود میں بٹھا لیتے، وہ دونوں کی علمی گفتگو سمجھ تو نہیں سکتے لیکن غیر شعوری طور پر ان کی باتوں کا نقش ان کے ذہن پر رہا، پھر کہنے لگے کہ وہ اب بھی فخر محسوس کرتے ہیں کہ وہ علامہ شبلی کی گود میں بیٹھے، بلکہ وہ اپنے کو ان کی گود کا پروردہ سمجھتے ہیں، وہ علامہ شبلی کی تصانیف، ان کے اسلوب، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے انکی جانشینی کا جو حق ادا کیا ہے اور پھر ان سے جو ملاقاتیں ہوتی رہیں اس پر اتنی دیر تک گفتگو کرتے رہے کہ جائے کی ایک نشست ختم ہو گئی اور ہم دونوں وہاں نہیں پہنچ سکے،

اسی کے دوسرے سال میں کسی کام سے دہلی گیا تو ایک روز اپنے بہت ہی معزز کرم فرما اور دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے اہم رکن کرنل بشیر حسین زیدی کے ساتھ انکی موٹر گاڑی پر کہیں جانا ہوا، انھوں نے

نہ میں کہا کہ وہ ذرا انٹرنیشنل کلب بھی تھوڑی دیر ٹھہریں گے، وہاں پہنچکر وہ کلب کی عمارت میں چلے گئے،
، موٹر ہی میں بیٹھا رہا، وہ باہر آئے تو ان کے ساتھ نواب علی یاور جنگ بہادر بھی تھے، زیدی صاحب نے
یا کہ میں موٹر میں بیٹھا ہوں تو وہ مجھ سے ملنے چلے آئے ہیں، پھر تو ایک خوشگوار شام گذری، جس میں
ب عماد الملک، علامہ شبلی اور سید صاحب پر دیر تک گفتگو رہی، سید صاحب سے حیدر آباد
، جو ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں ان کا ذکر بھی کرتے رہے، پھر فرمایا کہ جب وہ امریکہ میں سفیر تھے تو تذکرۂ
ان مولفہ غلام محمد کا اشتہار دیکھا، کراچی سے خاص طور پر یہ کتاب منگوائی، اور جب یہ کتاب پڑھی
س میں مولانا سید سلیمان ندوی نظر نہیں آئے، میں نے اس پر ان سے عرض کیا کہ یہ کتاب آپ
لیے نہیں لکھی گئی، پھر کہنے لگے کہ وہ سید صاحب کو ایک مصنف، ایک محقق، ایک مورخ اور ایک ادیب
یثیت سے جاننا چاہتے تھے، میں نے اثنائے گفتگو میں عرض کیا کہ آپ کے نانا نواب عماد الملک سید صاحب
ذہن پر برابر چھائے رہے، ان کی زبانی میں نے سنا کہ جب علامہ شبلی کی رحلت ہوئی تو انھوں نے بہت
، اور درد کے ساتھ ان کا نوحہ لکھا جو اخباروں میں چھپا تو ہر طرف سے اس کی تعریف ہوئی، عزیز
نوی نے بھی اس کو پسند کیا، مگر نواب عماد الملک کو شاید پسند نہ آیا، اس لیے انھوں نے سید صاحب
لکھ بھیجا کہ وہ بازار میں اپنی کسی چیز کو اس وقت تک پیش نہ کریں جب تک کہ ان کو یقین کامل نہ ہو
بازار میں اس سے بہتر چیز کوئی اور پیش نہیں کرسکتا، میں نے کہا کہ سید صاحب نے یہ بیان کرکے
یا کہ نواب صاحب کی یہ نصیحت ذہن پر برابر چھائی رہی، اور اپنی تحریر اور تصنیف کی طباعت
ئاعت سے پہلے نواب صاحب برابر ذہن کے سامنے کھڑے رہتے، نواب علی یاور جنگ نے اپنے
لی یہ نصیحت سنی تو بہت محظوظ ہوئے اور بولے کہ دار المصنفین کو یہ نصیحت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے،
، نے عرض کیا" حتی الوسع یہ پیش نظر ہے"۔

ان سے میری یہ دو ملاقاتیں اتفاقیہ ہو گئیں، دسمبر ۱۹۷۲ء میں شاہ صاحب کی وفات ہوئی

تو ان کا یہ مکتوب میرے نام پہنچا :-

راج بھون، ۱۰ جنوری ۱۹۷۵ء

مکرمی !

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کی خبر مجھکو شاق گذری، خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں لے، میری ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی البتہ اپنے نانا کے توسط سے مجھے مولانا سید سلیمان ندوی سے نیاز حاصل تھا، بچپن میں تو مولانا شبلی مرحوم کو بھی اپنے نانا کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا، اور کبھی کبھی ان کی گود میں بیٹھنے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔

علی یاور جنگ

اس کے بعد امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن منایا جانے لگا، تو اس کے وہ روح رواں بن گئے، میرے نام سے بھی ان کے دستخط سے ایک گشتی مراسلہ پہنچا، امیر خسرو سے مجھکو عشق رہا ہے، اس لیے میں نے ان پر انگریزی میں ایک مضمون لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجدیا، فروری ۱۹۷۵ء میں دہلی میں امیر خسرو پر انٹرنیشنل سمینار کی تاریخیں مقرر ہوئیں تو ان ہی کے دستخط سے میرے نام سے بھی شرکت کے لیے ایک دعوت نامہ پہنچا، میں ان ہی دنوں دارالمصنفین کے کام سے پاکستان جانے والا تھا، اس لیے میں نے اس دعوت نامہ کی رسید نہیں بھیجی، جب سمینار کا وقت قریب آیا تو ایک روز نواب علی یاور جنگ صاحب کا ایک لمبا تار میرے نام سے پہنچا کہ میری شرکت ضروری ہے،

اس تار پر اس میں شرکت کے لیے آمادہ ہو گیا، وہاں پہنچا تو نواب علی یاور جنگ اس طرح ملے جیسے میری اور ان کی ملاقاتیں برابر ہوتی رہی ہیں، ملتے ہی کہا کہ حیات سلیمان چھپ گئی ہے، مجھکو اس کے پڑھنے کا بہت اشتیاق ہے، میں نے عرض کیا کہ یہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گی،

سیمینار میں انگلستان، روس، شام، ترکی، مصر، عراق اور بنگلہ دیش کے بھی نمایندے آئے ہوئے تھے، ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے عربی اور فارسی کے اساتذہ بھی موجود تھے، بڑا اچھا اجتماع تھا، صدر جمہوریۂ ہند نے اس کا افتتاح کیا، اس کے بعد ایک علحدہ کمرہ میں سیمینار شروع ہوا، تو یہ بھر گیا، جگہ کی تنگی محسوس ہونے لگی، شام کے نمایندے کی صدارت میں کارروائی شروع ہوئی، مگر اس میں نواب علی یاور جنگ بہادر ہی پورے طور پر چھائے رہے، انھوں نے جب یہ کہا کہ عماد الملک کے نواسے کی تقریب میں عماد الملک کا نواسہ موجود ہے، تو بہت پسند کیا گیا،

انھوں نے کمرے کو ضرورت سے زیادہ لوگوں سے بھرا ہوا دیکھا تو ذرا جھلاہٹ کے لہجہ میں مجمع کو مخاطب کرکے کہا "جن کے پاس دعوت نامے نہیں ہیں وہ باہر نکل جائیں"، اس سے مجمع میں کھلبلی سی مچ گئی، نواب صاحب نے ایک صاحب کو مخاطب کرکے کہا کہ وہ کیسے آ گئے ہیں، باہر چلے جائیں"، اس سے اور بھی تکدر بڑھا، مگر پھر فضا خوشگوار ہوگئی، جلسہ ختم ہوا تو نواب صاحب کے لب لہجہ پر تنقیدیں ہورہی تھیں، مگر پوری تقریبات نواب صاحب کی وجہ سے بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام پائیں، انھوں نے ہر مقرر اور مقالہ نگار پر اچھے اچھے تبصرے کیے، اسی لیے میں نے معارف کے شذرات میں جب اس سیمینار کا ذکر کیا تو نواب صاحب کی ابتدائی ڈانٹ پھٹکار کو دیا دہ نمایاں نہیں کیا، جس سے بعض دوست میرے شاکی بھی ہوئے،

اس سیمینار میں امیر خسرو کے کچھ مخالفین اور ناقدین بھی جمع ہوگئے تھے، جنھوں نے ان پر یہ کہہ کر اعتراضات کیے کہ وہ صوفی کسی معنے میں نہ تھے، خواجہ نظام الدینؒ اولیاء سے ان کی ارادت نہ تھی، وہ ایک چالاک آدمی تھے، اس لیے وہ بار سے، ہر حکمراں سے تعلقات رکھتے رہے وہ موسیقی کے ماہر نہ تھے، ان کی ہندو دشمنی سے متعلق بھی کچھ باتیں بیان کی گئیں، وغیرہ وغیرہ، سیمینار

میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ کے جناب پیر ضامن علی اور جناب حسن ثانی بھی تھے،
وہ دونوں یہ سب کچھ سن کر دم بخود تھے، مگر خاموش تھے، میرے لیے بھی یہ اعتراضات نا خوشگوار
بلکہ ناقابل برداشت تھے، بے چین ہو کر میں نے ہر ایک سے ٹکر لی، اور امیر خسرو سے متعلق میرا جو کچھ
مطالعہ تھا اس کو بروئے کار لانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ نواب صاحب نے مجھ کو مخاطب کر کے
کہا کہ میں نے بہت کافی وقت لیا، کچھ اور لوگوں کو بھی بولنے کا موقع دوں میں نے ان سے
عرض کیا کہ میں اس لیے برابر بول رہا ہوں کہ عماد الملک کے نواسے امیر خسرو نے سات سو
برس میں جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ عماد الملک کے نواسے کی موجودگی میں اس دور دوڑ کے
سمینار میں ان سے چھین نہ لیا جائے، یہ سنکر مجمع کے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگے، چائے کا وقفہ ہوا،
تو وہ میرے پاس آئے اور بولے کہ میں دار المصنفین کی نمایندگی کا پورا حق ادا کر رہا ہوں
اسی وقت ایک روسی نمایندہ بھی میرے پاس پہنچ گئے، اور مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں
نواب صاحب نے شبلی اکیڈمی کا نام بتایا، تو روسی نمایندے نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھکر کہا
کہ اس اکیڈمی کی نمایندگی پورے طور پر ہو رہی ہے، میرے کچھ علمی دوستوں نے بھی کہا کہ میرا آنا اچھا ہوا
ورنہ معلوم نہیں اس سمینار میں امیر خسرو کہاں لیجا کر پٹک دیے جاتے، سمینار کے دوسرے دن راشٹرپتی بھون میں
صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے ایٹ ہوم تھا، میں بھی ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا،
صدر جمہوریہ سے بڑھ بڑھ کر سبھی مل رہے تھے، وہ دار المصنفین کے بڑے محسن، ہمدرد اور سرپرست رہے
ہیں، اس کی رکنیت بھی قبول فرما کر اس کی عزت بڑھائی ہے، میں بھی ان کی خدمت میں پہنچ کر
شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر اس بھیڑ بھاڑ میں پہنچنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، دور
سے نواب علی یاور جنگ صاحب کی نظر میرے اوپر پڑی، وہ میرے پاس آئے اور مجھکو اپنے
ساتھ صدر صاحب کے سامنے لا کھڑا کر دیا، اور پھر میں نے سمینار میں جو حصہ لیا اس کا ذکر

کرنے کے ساتھ میرے اور میری تصانیف کے لیے ایسے ایسے کلمات خیر کہے جن کا میں اپنے کو مستحق نہیں پا رہا تھا، میں دونوں بزرگوں کے سامنے شرمندہ ہو رہا تھا، میں ان سے رخصت ہوا تو عرض کیا کہ میں دہلی سے بمبئی پی، ایچ، ڈی کے ایک مقالہ کا ممتحن بن کر جا رہا ہوں، وہ بولے، میں بمبئی میں ان سے ضرور ملوں، بمبئی میں کچھ ایسا مشغول رہا کہ ان سے وقت مقرر کرنے کا موقع نہ ملا، جب چلنے لگا تو ان کے سکریٹری سے ان کی مشغولیتوں کا پروگرام معلوم ہوا تو میں ان سے ملے بغیر بمبئی سے اعظم گڈھ کے لیے روانہ ہوا،

اعظم گڈھ آکر حیات سلیمان کے ساتھ کچھ اور کتابیں ان کی خدمت میں بھیج دیں، پھر پاکستان چلا گیا، جہاں دار المصنفین کے کام کے سلسلہ میں سات مہینے قیام کرنا پڑا، اس اثنا میں نواب صاحب کے دو عنایت نامے موصول ہوئے جو یہ تھے:-

راج بھون، مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۶۷ء

مکرمی!

چاروں کتابیں جن میں سے سچی کہانیوں کے دو حصے ہیں وصول ہوئیں، جن کا از حد شکریہ، مطالعہ بزم صوفیہ کی طبع ثانی سے شروع کیا ہے جس کا بہت انتظار تھا، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم سے مجھے بڑا انس تھا اور ان کی حیات کو بھی بڑے شوق سے پڑھوں گا، مجھے علم ہے اور افسوس بھی کہ آپ بمبئی تشریف فرما تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے، مگر اتنے دن دہلی میں رہنے کے بعد واپسی پر کام کا انبار جمع ہو گیا تھا، اس کے علاوہ پے در پے کمیٹیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، اس لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں اور امید ہے کہ آپ مجھے بخش دیں گے، جی چاہتا ہے کہ اب اعظم گڈھ ہی میں ملاقات ہو، دار المصنفین سے نانا مرحوم کو بھی دیرینہ علمی تعلق رہا، اسکے کتب خانہ

کو بھی خاص طور سے دیکھنا چاہتا ہوں، یہ کب ہو سکے گا، خدا ہی جانتا ہے، مگر میں اس کے لیے برابر دعا کر رہا ہوں۔ فقط

علی یاور جنگ

راج بھون بمبئی، مورخہ ۱۱ مئی ۷۶ء

مکرمی!

ابھی اس سوچ میں لگا ہوا ہوں کہ کب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور دارالمصنفین کا کتب خانہ دیکھوں جس میں جی لگا ہوا ہے، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کی سوانح عمری کا مطالعہ ختم ہوگیا، کتاب مجھے بے حد پسند آئی، اور مولانا مرحوم بہت یاد آئے، چند روز ہوئے حیدرآباد جانے کا موقع آیا تو اس مکان کو بھی دیکھا جہاں عماد الملک بہادر اپنی عمر کے آخری حصہ میں رہا کرتے تھے، اور جہاں مجھے پہلی بار مولانا سید سلیمان ندوی سے شرف ملاقات حاصل ہوا، اس وقت اس مکان میں آل انڈیا ریڈیو بسا ہوا ہے، ان کا سابقہ مکان بلگرامی ہوز بھی مکرر دیکھا جو انھوں نے میری والدہ کو دیدیا تھا اور جس میں میں پیدا ہوا، میں نے خاص طور سے وہاں اس کمرے کا بھی معائنہ کیا جس میں وہ مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات کیا کرتے تھے، اس طرح آپ کی بھیجی ہوئی کتاب کیا پڑھی کہ سارا پچھلا زمانہ یاد آگیا۔

معارف کی اس اشاعت کا شکریہ جس کے شذرات میں سمینار کا ذکر خیر کیا گیا ہے جو آپ ہی کے قلم مبارک سے لکھا گیا ہے، اگر اس اشاعت کی تین یا چار کاپیاں اور مجھے مل سکیں تو ضرور بھیج دیجئے میں ممنون ہوں گا، سمینار میں آپ کی عالمانہ تقریریں مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی جنھوں نے بالخصوص تصوف کے موضوع پر مباحث کو اتنے بلند پایہ پر رکھا۔ فقط

علی یاور جنگ

بھی مولانا عبدالسلام ندوی میری عدم موجودگی میں دارالمصنفین کی ڈاک کے جوابات دیتے رہے تھے، نواب صاحب کے خطوط کے بھی جوابات دیے، مگر شاید ان کے سامنے پیش نہیں کیے گئے، میں پاکستان سے واپس آیا تو اپنی ڈاک میں یہ ۲ دو خطوط بھی پڑھے، ان کا جواب دیا، مگر جواب دینے میں عجلت نہیں کی، خیال ہوا کہ ان کے جوابات تو جا چکے ہیں، میں نے ان کو جو خط لکھا اس میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی، اس لیے ان کے جواب کا انتظار نہ تھا، ایک رات یکایک ان کی وفات کی خبر ریڈیو سے ملی، تو بڑا دکھ ہوا، ان کی علالت کی خبر نہ ملی تھی، اسلیے ان کی المناک وفات کی خبر سننے کے لیے تیار نہ تھا، ان کی ملاقاتیں اور ان کی باتیں یاد آتی رہیں، سرکاری حلقوں میں ان کی اہمیت کا اندازہ تو پہلے ہی سے تھا، انکی موت پر صدر جمہوریۂ ہند اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے جو تعزیتی پیغامات شائع ہوئے اس سے ان کی سرکاری حیثیت کی اہمیت کے اندازہ میں اور بھی اضافہ ہوا،

ان کی وفات کے چار روز کے بعد ان کا یہ مکتوب ملا:۔

راج بھون بمبئی۔ مورخہ ۷ر دسمبر ۱۹۷۶ء

مکرمی!

آپ کے خط مورخہ ۹ر نومبر کا شدید انتظار تھا، اور اب معلوم ہوا کہ کیوں میرے ۲ دو پچھلے خطوں کے جواب نہیں آئے۔ اس بیچ میں قلب کے عارضہ سے میں بیمار پڑ گیا تھا اور آپریشن کروانا پڑا، اب خدا کے فضل سے رفتہ رفتہ رو بصحت ہوتا جا رہا ہوں، اس وقت دہلی جانے کا ارادہ نہیں ہے، مگر جب بھی ہوا تو وہاں سے اعظم گڈھ ضرور آؤں گا اور آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں گا، جس کے لیے جی تڑپ رہا ہے، رسالہ معارف کے اس خاص شمارے کی دو تین کاپیاں جن کی مجھے ضرورت تھی

اور جن میں شذرات کے تحت سمینار کے بارے میں بڑا قدر دانہ مضمون شائع ہوا تھا، ان کو بھیجنا نہ بھولئے، انتظار رہے گا، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ سمینار کے رکارڈ میں رہیں۔ فقط

علی یاور جنگ

اس خط کو پڑھ کر ان کی وفات کی سوگواری میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی کہ علامہ شبلی، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اور دار المصنفین کا ایک بڑا قدردان جاتا رہا، اس حیثیت سے وہ یاد آتے رہے اور اکثر یاد آتے رہیں گے،
ان کی زندگی میں ان کے ناقدین بھی رہے، بعض حلقوں میں ان کی مخالفت بھی ہوتی رہی جس کی انتہا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کے جلسہ میں پہنچ گئی تھی، مگر انھوں نے اپنے لیے جو دنیا بنائی تھی، اس میں وہ کامیاب رہے اور کامیاب اس دنیا سے رخصت ہوئے ان میں کمزوریاں بھی رہی ہوں گی، مگر ان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں، اللہ تبارک تعالیٰ ان کی عاقبت کو بھی بخیر کرے۔ آمین

ادبیات

غزل

از جناب علی جواد زیدی صاحب تہران

ہ نگہ فسانہ گو، زخم فروش و دل گداز
وہ نگہِ بہانہ جو، عشوہ فروش و دل نواز

دہ کشانِ عصرِ نو، جن کو تھا سرکشی پہ ناز
لغزشوں سے سمجھ گئے کیا ہے نشیب، کیا فراز

ندوں نے میکدے میں آج شکل یہ کیا بنائی ہے
جیسے غمِ جہاں میں غرق، وقتِ دعا صفِ نماز

ہ زیرِ لب سہی، آہِ سحرگہی مری
میں نے مگر صدا سنی، کوئی تو در ہوا تھا باز

ر دبی تھی، وہ ابھی تھی، انکی ہنسی ہنسی کی بات
بھید کھلے جو حُسن کے، بن گئے زندگی کے راز

تنے لبوں پہ چھا گئے نغمہ و شور و حرفِ شوق
کتنے دلوں میں رہ گئے کتنے دنوں کے تلخ راز

تنے وجودِ بے نمود، تو نے صنم بنا دیے
اے خردِ وفا تراش، تیری حیات ہو دراز!

ہے یہی زندگی اگر، منتشر و بغیر سمت
پھر تو خطا معاف ہو، زندگی سے ہم آئے باز

ظوں کے نظم و بست سے شعر کرشمہ بن گیا
فکر کے نظم و ضبط سے، شعر بنا نظر نواز

زیدیِ رمز آشنا، تو بھی ہے ایک سرپھرا
عشق کا کس کو حوصلہ، کس کو ہوس سے احتراز

مطبوعات جدیدہ

تفسیر قرآن (تفسیر ماجدی) جلد سوم :۔ از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم،
بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۱۲۔ قیمت صہ۔ پتہ:
صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ۔

یہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر قرآن کی تیسری جلد ہے جو گیارہویں پارہ کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل ہے، اس کی پہلی اور دوسری جلد پر معارف میں مفصل ریویو چھپ چکا ہے، یہ جلد بھی ان خصوصیات سے پوری طرح مزین ہے، یعنی قدیم تفسیروں کے چیدہ مباحث اور دور حاضر کے علمی و سائنسی انکشافات نقل کرکے آیتوں کا مفہوم اور ان کا ہر پہلو واضح کیا گیا ہے اور مستشرقین و متشککین کے شبہات اور مغالطوں کی تردید بھی کی گئی ہے، اس کی بڑی خوبی اختصار و جامعیت ہے، ترجمہ کی روانی، شگفتگی اور سلاست کے لیے مولانا کا نام نامی ہی کافی ہے، شروع میں ایک انڈکس اور مختصر مقدمہ بھی ہے جو بڑا پرمغز اور مولانا کے خاص انداز کا نمونہ ہے، قرآن مجید کے طالب علموں اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو اس تفسیر کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، ان سطروں کے لکھتے وقت مولانا کی وفات کی خبر ملی، وہ جا چکے، مگر اپنے پیچھے اپنی تفسیر کی شاندار یادگار چھوڑ گئے۔

مقدمہ لطائف اشرفی : از ڈاکٹر سید وحید اشرف صاحب علیگ، بڑی تقطیع، کاغذ عمدہ ٹائپ، صفحات ۶۴۔ قیمت دس روپے۔ پتہ: از مصنف شعبۂ فارسی و اردو فیکلٹی آف آرٹ، مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ، ہند۔

ڈاکٹر سید وحید اشرف استاذ شعبۂ فارسی و اردو مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ کو حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے خاندانی تعلق ہے، اس سے پہلے وہ انکے حالات و سوانح پر ایک کتاب لکھ چکے تھے جس پر معارف میں چند ماہ قبل ریویو شائع ہو چکا ہے، اب انھوں نے ان کے ارشادات و ملفوظات کے مجموعہ اور تصوف کی مشہور و مقبول کتاب لطائف اشرفی پر فارسی زبان میں ایک مقدمہ تحریر کر کے شائع کیا ہے، یہ ۲ حصوں میں ہے، پہلے میں مصنف کا اور دوسرے میں تصنیف کا تعارف کرایا گیا ہے، پہلا حصہ چھ ابواب کا اور دوسرا چار کا مجموعہ ہے، پہلے حصہ میں حضرت اشرف جہانگیرؒ کے سوانح کے مآخذ، تاریخ ولادت و وفات، ابتدائی حالات، امراء و سلاطین سے تعلقات، علمی و ادبی کمالات اور تصنیفات کی فہرست دی گئی ہے، یہ حصہ دراصل مصنف کی اردو کتاب کی تلخیص ہے، اس میں صاحب سوانح کی تاریخ ولادت و وفات کی تحقیق میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے، یہ اور دوسرے حصہ کے اکثر مباحث پہلے معارف میں بھی چھپ چکے ہیں، لطائف اشرفی کے تعارف میں پہلے اس کے جمع و ترتیب اور حضرت سید اشرفؒ کی زندگی ہی میں اس کے بڑے حصہ کے مرتب ہو جانے کی دلیلیں اور اس کے مضامین و مندرجات اور اہم مآخذ کی فہرست دی گئی ہے، پھر اس کے بعد کی صوفیانہ کتابوں خصوصاً نفحات الانس جامی کے مآخذ ہونے کا ثبوت بیان کیا گیا ہے، آخر میں اس کی علمی و ادبی اہمیت اور تصوف کی بلند پایہ کتاب ہونے کا ذکر ہے، یہ مقدمہ بڑی محنت سے لکھا گیا اور قابل مطالعہ ہے، لیکن اسکی قیمت زیادہ ہے۔

فہرست مخطوطات عربی رضا لائبریری } مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت
جلد چہارم و پنجم (انگریزی) }
طباعت اچھی، صفحات ۶۱۶ و ۶۲۴ مجلد قیمت [illegible] و [illegible] پتہ رضا لائبریری ٹرسٹ رامپور۔

یہ رضا لائبریری رام پور کے عربی مخطوطات کی فہرست کی چوتھی اور پانچویں جلدیں ہیں، جو حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیمات کی امداد سے شائع کی گئی ہیں، چوتھی جلد میں زہد و تصوف، انجیل مقدس،

اور علم و فلسفہ کی کتابوں کی فہرست ہے، اور پانچویں جلد میں حساب، ریاضی، طب، طبیعیات
زراعت، کیمیا، ہیئت، نجوم، فلکیات، علم الحروف، اخلاق، سیاست مدن اور حرب و مغاز
کی کتابوں کا ذکر ہے، فہرست میں تصنیف و مصنف اور کاتب کے نام، سنہ وفات، مخطوطہ کے
زمانۂ تحریر و تصنیف، صفحات اور سطروں کی تعداد، نشان خط، سائز اور مکمل یا ناقص ہونے کی
کی گئی ہے، زہد و تصوف میں سنی، شیعہ اور زیدیہ فرقوں کی کتابوں کی علیحدہ علیحدہ وضاحت ہے
دونوں جلدوں کے مختصر مقدمہ میں ان کے مخطوطات کی تعداد اور زیادہ قدیم مخطوطات کے نا
اور اہم خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، فہرستوں کی اشاعت سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مد
ملتی ہے، دونوں جلدوں کی ترتیب و تدوین کی خوبی کے لیے فاضل مرتب کا نام ہی پوری ضمانت ہے۔

ذکر سیدین: ۔ مرتبہ جناب شمسی طہرانی صاحب۔ تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی،
صفحات ۱۵۹ مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپئے۔ پتے: (۱) کتبخانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی
(۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

خواجہ غلام السیدین مرحوم ملک کے مشہور ماہر تعلیم، اردو و انگریزی کے لائق فاضل اور مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ کے مایۂ ناز فرد تھے، جناب شمسی طہرانی نے زیر نظر کتاب میں انکی زندگی کے خط و خال، فضل و کمال اور افکار
و نظریات کو خود انکی اور دوسرے ارباب قلم کی تحریروں کی مدد سے پیش کیا ہے، پہلے انکی خاندانی نجابت، تعلیم، ملازمت،
وردھا اسکیم میں کارنامے، مسلم یونیورسٹی اور دوسرے تعلیمی اداروں سے دلچسپی اور انکی محبوب شخصیتوں کا ذکر کیا ہے، پھر انکے
طرز تحریر اور مرقع نگاری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، اور انکے قومی، سیاسی اور تعلیمی خیالات اور ذہنی و اخلاقی
عظمت، رواداری، امن پسندی اور حب الوطنی کی مصوری کی گئی ہے، گو اس مختصر کتاب سے خواجہ صاحب کی سوانح عمری
کا مکمل حق ادا نہیں ہو سکتا، تاہم اس سے انکے آیندہ سوانح نگاروں کو مدد ملے گی، اس حیثیت سے
یہ کتاب مفید ہے۔

'ض'

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی، تحقیقی، ادبی، تنقیدی، تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے
ں جو مطالعہ و بصیرت، تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات
جم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

اہاجرین جلد دوم قیمت: ۹-۱۲

سیر الصحابہ جلد ۶ " ۴-۹

ام حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں
واقعۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

سیر الصحابہ جلد ۷،

تابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح،
قیمت: ۵۰-۱۲

ریخ اسلام اول (عہد رسالت، خلافت راشدہ)
قیمت: ۵۰-۱۲

ریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰۰-۱۱

ریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول)
قیمت: ۰۰-۱۴

ریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)
قیمت: ۰۰-۱۵

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت ۶۵-۱۵

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں،
قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دین رحمت قیمت: ۰۰-۱۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۷۵-۴
زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلاویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشا، اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا مثنیٰ، دلکش، دلچسپ، قابل مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۵۰-۲۴

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے گذر کر یورپ وامریکا اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہونچ گیا ہے، مشرقیات کے جن غیرمسلم فضلا نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں دارالمصنفین کے رفقا محققین نے ان کے دنداں شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئیے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں،

مکمل فائلوں کی تفصیل

سنہ ۱۹۳۴ء   سنہ ۱۹۳۷ء، سنہ ۱۹۳۸ء، سنہ ۱۹۳۹ء

سنہ ۱۹۷۱ء

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں،   "منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ"

نمبر ال ۵۲۰ — فروری سنہ ۱۹۷۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن — عبد السلام قدوائی ندوی

......٥......

قیمت پندرہ ۱۵ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۰ ۔ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۷ء ۔ عدد ۲

مضامین

شذرات

مقالات

شذرات

آہ! رشید احمد صدیقی

ابھی مولانا عبدالماجد دریابادی کی وفات کا غم تازہ ہی تھا کہ اردو زبان کے ایک اور صاحب کمال، صاحب طرز اور صاحب فن ادیب اور انشا پرداز یعنی یگانۂ روزگار، فخر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مایۂ ناز فرزند شیراز ہند جناب رشید احمد صدیقی کی رحلت کی خبر ملی۔

دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

وہ مڑیا ہو ضلع جونپور کے رہنے والے تھے، علی گڑھ میں چھ سال تعلیم پائی، یہاں کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تو یہیں کے ہو کر رہ گئے، اسکی روایات کے رازداں، اسکی حمیت کے دیدباں، اسکی عزت کے نگہبان اور اسکی آبرو کے پاسبان بنکر ساری زندگی گذاری، وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایک اہل دل مسلمان نقاش اور مصور کا شاہکار سمجھتے رہے، سیاحوں کو جو دل آویزی اور رعنائی اجنٹا اور ایلورا میں نظر آتی ہے، وہی انکو گھر بیٹھے مسلم یونیورسٹی میں نظر آتی رہی، شاہجہاں ثمن برج میں بیٹھکر تاج محل دیکھا کرتا، پھر اسی برج میں اس نے ایک چھوٹا سا شیشہ نصب کرا رکھا تھا جس میں تاج محل کا پورا عکس پڑا رہتا، رشید صاحب کیلئے علی گڑھ میں انکا مکان انکا ثمن برج تھا جس کے اندرونی حصے میں ایک خوبصورت لہلہاتا سبزہ زار تھا، اسکے بیرونی حصہ میں طرح طرح کے گلاب کے پودے لگے رہتے تھے، یہیں سے اپنے شیشۂ دل میں اپنے ذہن کے تاج محل یعنی مسلم یونیورسٹی کو دیکھکر خوش ہوتے رہتے، اب اسی تاج محل کے اندر مدفون ہیں جس کی سرزمین نے انکے جسد خاکی کو نہیں بلکہ مسلم یونیورسٹی کے نشاط روح، سوز سینہ اور دل بیقرار کو بڑے شوق سے اپنی آغوش میں لے لیا ہوگا، وہ جا چکے مگر اپنی کتاب "آشفتہ بیانی میری" میں علی گڑھ کیلئے یہ پیام چھوڑ گئے ہیں کہ زمانہ بدلتا رہتا ہے بدلتے رہنا اسکی تقدیر ہے، علی گڑھ اس تقدیر سے باہر نہیں ہے، اسلیے وہ بھی بنتا بگڑتا رہیگا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہر تبدیلی کی زیادہ سے زیادہ اچھائیوں اور کم سے کم برائیوں کو قبول کرے گا۔

وہ ادبی دنیا میں ایک مزاح نگار کی حیثیت سے داخل ہوئے "طنزیات و مضحکات" لکھ کر اس فن کو سیکھنے اور سکھانے کی کوشش کی، پھر خنداں اور مضامین رشید لکھکر سنجیدہ ظرافت اور ظریفانہ سنجیدگی دونوں کو ایک مستقل آرٹ بنا دیا، شیخ نیازی لکھکر بچوں کو بھی کشت زعفران کے کنارے لاکر کھڑا کر دیا، انکے مضامین "دھوبی" اور "حاجی صاحب" کو پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے آب گیاہ سے خالی زمین کو لالہ زار اور بے مزہ زندگی کو مزیدار بنا سکتے تھے، شروع میں ان کا نام فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی اور پطرس بخاری کے ساتھ لیا جاتا تھا، مگر رفتہ رفتہ انکی صف سے نکل کر اپنے لیے نئی راہ نکالی، وہ قہقہوں کے بجائے صرف موج تبسم کے قائل تھے، وہ صرف گدگدانے، گدگدا کر ہنسنے پر مجبور نہیں کرتے، دکھتی ہوئی رگ کو ضرور پکڑ لیتے، مگر اسکو مسل دینے سے گریز کر جاتے، انکے یہاں نیش عقرب ہوتا اور نہ نوک سوزن ہوتی، انکی بذلہ سنجی پر انکے ذوق کی عفت آپی چھائی رہتی، جو حجاب شکن اور نہ نقاب پوش ہوتی مگر ہر حال میں محمل نشیں ہوتی، وہ شاعر نہ تھے، مگر اپنی مزاحیہ نثر سے شاعری کا کام لیتے رہتے، آخر میں تو اس میں غالب کی شوخی، داغ کا تیکھا پن، اکبر الہ آبادی کا اخلاقی درس، جگر کی دردمندی اور فانی کے غم کی معرفت پیدا ہو گئی تھی،

انکی علمی و ادبی تحریروں میں بڑی آب و تاب ہوتی، انکی وجہ سے دہلی اور لکھنؤ اسکول کی طرح اردو زبان کا ایک علی گڑھ اسکول بھی بن گیا ہے، وہ جب کوئی تحریر لکھتے اس میں اردو کے ساتھ علی گڑھ یا علی گڑھ کی کسی شخصیت کا ذکر ضرور لے آتے، انکو خود اعتراف ہے کہ ان میں اندازِ گل افشانیٔ گفتار علی گڑھ ہی کے پیمانہ و صہبا سے آیا، انکی تحریروں میں قسمت کے احترام کے ساتھ مغربیت کا پاس خاطر بھی ہوتا، جن میں خوش طبعی، شایستگی اور غیر اندیشی کے آبدار موتی بھی جھلملاتے رہتے، اپنے محبوب معاصروں اور خصوصاً علی گڑھ کے کسی نامور فرزند کی وفات پر کوئی ماتمی تحریر لکھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ اسکی تربت پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں، مولانا محمد علی پر انکا نوحہ انکے قلم اور خود اردو ادب کی انشا پردازی کی بہترین مثال ہے، وہ انکے متعلق لکھتے ہیں کہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں، یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج محل کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے، ...... محمد علی کو جتنے بے تمیزوں اور بد مذاقوں سے سابقہ پڑا، ایسے بد توفیق اور بد مذاق بھی کم تھے، بوالہوس اور اکثر کینہ پرور بھی، محمد علی نے ان سب سے انتقام بھی لیا، لیکن اپنی زندگی میں نہیں

بلکہ اپنی موت سے ..... ایسا حسین کہاں جس کو خود یزید کی تلاش ہو" ـــــ آج کون ہے جو ایسے ڈھلے ڈھلائے اور کندن کی طرح چمکتے ہوئے جملے لکھ سکتا ہے، انکی گنج ہائے گرانمایہ اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ بنی رہے گی۔

وہ اپنے زندہ معاصروں میں سے کسی پر کچھ لکھتے تو اس میں بھی خاص رنگ و بو پیدا کر دیتے، انکی کتاب "ہمارے ذاکر صاحب" ڈاکٹر ذاکر حسین ہی کی زندگی میں شائع ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے راشٹرپتی بنکر جب کبھی اسکو راشٹرپتی بھون میں پڑھا ہوگا تو ان کو یہ فیصلہ کرنا شاید مشکل ہوا ہوگا کہ راشٹرپتی کے مغل گارڈن کے سبزہ زاروں اور پھولوں میں زیادہ لہلہاہٹ اور شادابی ہے یا رشید صاحب کی اس کتاب میں، ان کی تحریروں کو پڑھتے وقت کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہم گوری چنبیلی کی روش کے بیچ میں کھڑے ہوکر بکھری ہوئی تجلی اور چھٹکی ہوئی چاندنی سے محظوظ ہو رہے ہیں، ان ہی کے انداز میں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ اپنی تحریروں کی جنت میں ہمیشہ زندہ و قائم رہیں گے۔

انھوں نے اردو تنقید نگاری کے فن کی بھی امامت کی جس میں انکا رنگ بالکل ہی منفردانہ اور غیر مقلدانہ رہا، وہ جب یہ لکھتے ہیں کہ "غزل بدنام ہونے کے باوجود اردو شاعری کی آبرو ہے" "غالب نے اردو شاعری کو وزن اور وقعت دینے کے علاوہ ایک نسب اور ایک روایت بھی دی" "بعض احباب کہتے رہتے ہیں کہ "غالب ایک زوال آمادہ تمدن، جاگیردارانہ نظام یا روایتی شاعری کے چراغ رہگذر باد تھے، تو یہ الزامات ہیں اصولی تنقید نہیں، آئین نہیں، آرڈیننس ہے" "جدید اردو میں ان تمام صالح، دلکش اور وقتی عناصر کی جلوہ گری ملتی ہے جن سے غزل کی گرہ عبارت ہے" "اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے، حاتم طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ اپنی اپنی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے" "اقبال کبھی حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف لیکن بالآخر دونوں" تو ان جملوں میں نہ صرف نیا پن ہے بلکہ نظر و فکر کی گہرائی بھی ہے، انھوں نے غالب، اقبال، اکبر الہ آبادی، اصغر، اور فانی پر جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں آئندہ نسلوں کیلئے بھی کہنگی محسوس نہیں ہوگی، اس سے ہر زمانہ میں روشنی ملے گی اور ذہن میں جلا پیدا ہوتی رہے گی جس سے ان کے ادبی شعور کی پختگی کا اظہار ہوتا رہے گا۔

ان کو دارالمصنفین سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، وہ علامہ شبلی کی تحریروں کی رعنائی، برنائی، جمالیات کا رمز شناسی، انکے تخیل کی رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تملاہٹ کے بیحد قائل تھے۔ استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی علیگڈھ تشریف لیجاتے تو وہ انکی میزبانی بڑی محبت اور احترام سے کرتے، انکی وفات پر معارف کے سلیمان نمبر کیلئے گنج گرانمایہ کے عنوان سے جو مضمون لکھا وہ انکے بہترین مضامین میں شمار ہوتا رہے گا، اس میں انکے علمی تبحر، تحقیقی ذہانت، ذہنی تنقیحات، ادبی بصیرت، مورخانہ ژرف نگاہی، طالب علمانہ شغف، علوم پر محرمانہ نظر، مذہب کے معاملات میں شریفانہ، دانشمندانہ اور عالمانہ رویہ، تقریر کی اثر آفرینی اور صلح جوئی کے ساتھ ساتھ انکے وضع قطع میں نفاست پسندی اور رکھ رکھاؤ کی مدح بڑی فراخدلی سے کی ہے، انکی اس رائے پر کہ وہ بحیثیت عالم علامہ شبلی سے متاثر ہوئے اور بحیثیت معلم سید صاحب سے، انکے مرتبہ شناسی میں مدد ملے گی اور یہ غور وفکر کی بھی دعوت دیتی ہے، وہ مولانا عبد السلام ندوی کی تصانیف کی منطقیانہ ترتیب کے معترف تھے، کہتے کہ پیچیدہ مسائل کو سلجھا کر لکھنے میں انکی ہمسری کوئی نہیں کر سکتا انکی اقبال کامل کے متعلق بار بار کہا کہ یونیورسٹیوں میں اقبال اسی کتاب کے ذریعہ سے سمجھے گئے، وہ جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے ادبی ذوق کے بھی مداح تھے، معارف کے سلیمان نمبر کیلئے انھوں نے اپنا مضمون انکے پاس یہ لکھکر بھیجا کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں کتر بیونت کر سکتے ہیں، انکی ترمیم و اصلاح سے انکو پورا اتفاق ہوگا، یہ انکی کسرنفسی کا بھی ثبوت تھا یہ راقم علی گڈھ جب بھی گیا ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر اٹھا، جب اپنی کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" لکھ رہا تھا تو ان کو یہ کچھ ایسی پسند آگئی کہ اس کو جلد از جلد طبع اور شائع کرنے کی فرمائش کرتے رہے، اس کا اعتراف ہے کہ ان ہی کی حوصلہ افزائی سے یہ دو جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ان کے فرشتہ صفت چھوٹے بھائی جناب شباز احمد صدیقی صاحب شبلی کالج میں انگریزی کے لکچرر تھے، جن کا قیام عرصۂ دراز تک شبلی منزل کے احاطہ ہی میں رہا، اس لیے وہ جب کبھی اعظم گڈھ آتے تو یہیں قیام کرتے، وہ مولانا مسعود علی ندوی کی خوش سلیقگی اور خوش انتظامی، یہاں

کی خاطر مدارات، مہمان نوازی، رفقا کے میل محبت اور کام کرنے کے شغف سے متاثر ہوتے، انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جہاں یہ تحریر فرمایا کہ بہت سے دانایان سیاست، اربابِ فضیلت اور شیدائیان شعر و ادب اس سے نسبت رکھنا اپنے لیے ایک امتیاز سمجھتے تھے، وہاں یہ بھی لکھا کہ اعظم گڈھ کا یہ مختصر سا خطہ جو کسی طرح ایک اوسط درجہ کے باغ کے رقبہ سے زیادہ نہیں ہے، شمالی ہند کی روایتی تہذیب و دانش و بینش کی نہ صرف نمایندگی کرتا رہا بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافہ بھی کرتا رہا"—— یہ خاکسار جب جب دارالمصنفین شبلی منزل کی اس روایتی تہذیب کو برقرار رکھنے کی بھی ضرور نصیحت کی، وہ معارف کے شذرات کو بہت شوق اور پابندی سے پڑھا کرتے تھے، حضرت سید صاحبؒ نے اس کے لکھنے میں جو معیار قائم کیا تھا اس کو قائم رکھنے کی تلقین اپنی ملاقاتوں میں برابر کرتے رہتے، ان سطروں کے لکھتے وقت ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ان کی وفات سے دارالمصنفین اپنے ایک بہت ہی دلنواز اور شفیق بزرگ اور قدردان سے محروم ہو گیا، انکی رحلت کے بعد علی گڑھ کے چمن کی نرگس خدا جانے اپنی بے نوری پر کتنے دنوں تک روتی رہیگی علی گڑھ والے جب ان کو یاد کرینگے، ان کے دل سے یہ آواز نکلے گی

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

وہ اردو زبان کے حبیب تھے، بلکہ وہ خود اسکے محبوب بنگئے، وہ اردو ادب کے عاشق زار تھے مگر اردو ادب نے خود انکو اپنا معشوق بنالیا، انھوں نے اپنے محبوب ذاکر صاحب کے لیے جو کچھ کہا تھا وہی ان کیلئے اردو ادب اپنی زبانِ حال سے کہتا رہیگا

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

علی گڑھ کیلئے انکے سینہ میں ایک سوز سلگتا رہا، یہ سوز سینہ ہندستان کے مسلمانوں کے افتخار، وقار اور سربلندی کیلئے تھا، یہی انکا توشۂ آخرت بنے گا جو ممکن ہو کہ جنت کی حوروں کے گیسوؤں کیلئے شامہ بنجائے۔ آمین، انھوں نے کسی موقع پر لکھا تھا کہ مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لونگا: غالب، اردو اور تاج محل —— اگر اس راقم سے پوچھا جائے کہ ایم، اے، او کالج نے ہم کو کیا دیا تو میں یہ کہونگا، خوبصورت یونی فارم، مسلم یونیورسٹی، اور رشید احمد صدیقی،

آہ! جناب فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ ہند

معارف کے اس شمارہ کی طباعت ہو چکی تھی کہ یکایک ریڈیو سے صدر جمہوریہ ہند کی المناک رحلت کی خبر ملی، ملک اس قدر جلد ان کی دائمی جدائی کے لیے تیار نہ تھا، فلک کا کیا بگڑ آجو نہ وہ مرتے کوئی دن اور، پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور اب جناب فخرالدین علی احمد کی وفات راشٹرپتی بھون ہی میں ہوئی، دونوں کی صدارت کے ساتھ

پیچھے پیچھے وہ دبے پاؤں قضا بھی آئی

وہ جا چکے، جب اُن کی سوانح عمری لکھی جائے گی تو وہ ایک پُرجوش مجاہد آزادی، قابلِ فخر محبِ وطن، کامیاب بیرسٹر، آسام کے معزز ایڈوکیٹ جنرل، اسی ریاست کی حکومت کے قابل اعتماد وزیر خزانہ، پھر ملک کی لوک سبھا کے ہردلعزیز ممبر، اقوام متحدہ کے ہندوستانی وفد کے بڑے لائق رکن، مرکزی حکومت کے مختلف محکموں کے بہت ہی کارگزار وزیر، سیکولرزم کے بہترین نمایندہ، قومی یکجہتی کے زریں نشان اور آخر میں جمہوریۂ ہند کے محبوب صدر کی حیثیت سے برابر یاد کیے جائینگے، ہندوستان کی خارزار سیاست میں داخل ہو کر کسی مسلمان رہنما کا کامیاب ہونا آسان نہیں، کچھ مسلمان قائد ایسے ہوئے جو مسلمانوں میں تو مقبول تھے لیکن ہندوؤں میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے گئے، اور کچھ مسلمان لیڈر ایسے بھی گذرے جو ہندوؤں میں تو محبوب لیکن مسلمانوں میں غیر محبوب رہے، جناب فخرالدین علی احمد صاحب کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ دونوں حلقوں میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے گئے، ان کے کسی اخباری بیان یا کسی عمل کی نشاندہی نہیں کیجا سکتی ہے جس سے ہندو خوش اور مسلمان ناخوش یا مسلمان خوش اور ہندو ناخوش ہوئے۔

انکی علم نوازی کی یادوں کی بھی مشعل روشن رہے گی، ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی پورے ملک میں ان ہی کی خواہش پر بڑے اہتمام سے منائی گئی، ایوان غالب اور غالب انسٹی ٹیوٹ انکی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے، ۱۹۷۵ء میں امیر خسرو کا سات سو سالہ بین الاقوامی جشن ان ہی کی سرپرستی میں بڑی کامیابی سے

منایا گیا، ملک کے بعض حلقوں میں اردو زبان سے جو بیزاری تھی ان کو رفع کرنے میں انکی مؤثر شخصیت بہت کارآمد ثابت ہوئی مختلف ریاستوں میں جو علحدہ علحدہ اکیڈمی قائم ہوئی اس میں انکی ہدایت کو بڑا دخل رہا، انھوں نے اردو کی حمایت میں بھی ایسی مؤثر تقریر کی جس سے ایک ریاست کا غفلت شعار ضمیر بیدار ہوا، اردو کو ملک کے تہذیبی ورثہ میں واپس لانے میں انکی کوشش برابر جاری رہی۔

وہ دارالمصنفین کے بھی بڑے مربی رہے، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ہماری مجلس انتظامیہ کے بڑے قدیمی رکن تھے انکی وفات کے بعد جب جناب فخرالدین علی احمد صاحب سے انکی جگہ پر یہاں کی رکنیت قبول کرنے کی درخواست کیگئی تو انھوں نے اپنے حسب ذیل گرامی نامہ میں یہ تحریر فرمایا، اس وقت وہ محکمۂ زراعت اور غذا کے وزیر تھے،

نئی دہلی ۲۰ر ستمبر ۱۹۶۹ء

مکرمی! تسلیم۔ آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ نے شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کا رکن بننے کی جو پیش کش کی ہے وہ بڑی عزت افزا ہے، دارالمصنفین کی خدمات ملک اور ملت کیلئے بہت مفید رہی ہیں، میں اسے فخر کی بات سمجھونگا کہ اس سے میرا رشتہ اور قریب تر ہو جائے، امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔

نیازمند: فخرالدین علی احمد

دارالمصنفین جب مالی پریشانیوں سے گذر رہا تھا تو انھوں نے ایچ۔ای۔ایچ نظام چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کے صدر شہزادہ معظم جاہ کو حسب ذیل مکتوب انگریزی میں تحریر فرمایا:

نئی دہلی ۲۹ر مارچ ۱۹۷۱ء

مائی ڈیر پرنس معظم جاہ! آپ کو معلوم ہے کہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ یو۔پی اپنی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں میں تقریباً پچپن سال سے مشغول ہے، اس نے ایسی شہرت حاصل کرلی ہے کہ دوسرا کوئی بھی علمی ادارہ اس سے رشک کرسکتا ہے، اسکو ہندستان کے ایک نامور فرزند مولانا شبلی نے قائم کیا جن سے اردو میں تاریخی تحریروں کی تحقیقات کی بنا پڑی اور اردو کے تنقیدی سرمایہ میں بڑا گرانقدر اضافہ ہوا، ان کی سیرۃ النبی علم و فضل کا شاہکار ہے۔

اس اکیڈمی کو ہز ہائینس نظام حیدرآباد کی طرف سے ہندوستان کی آزادی سے پہلے امداد ملتی رہی، بدقسمتی سے گذشتہ چند برسوں کے اندر، اکیڈمی بعض مختلف اسباب کی بنا پر مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے، یہ بڑی المناکی ہوگی اگر یہ ادارہ بند ہو جائے یا اس کو اپنی علمی سرگرمیوں کو بڑی حد تک کم کرنا پڑے،

اس کو ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام ٹرسٹ کی طرف سے پانچسو روپے ماہوار کی امداد ملی ہے، اس سے جو اہم علمی کارنامے انجام پائے ہیں اور اس کے مالی ذرائع کی جو کمی ہے اس لحاظ سے یہ امداد بہت زیادہ نہیں، گو جو کچھ ملا ہے اسکا خیر مقدم کرنا بھی مناسب ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس ادارہ کے لوگ بہت شکرگذار ہونگے اگر ان کے لیے کوئی مستقل آمدنی کی صورت نکل آئے۔ میں آپکا ذاتی طور سے شکرگذار ہونگا اگر انکو آپ یکمشت ایسی رقم دیدیں جس سے اسکو پندرہ سو روپیہ ماہانہ کی آمدنی مستقل طور پر ہو جائے۔ بہترین خواہشوں کے ساتھ۔

آپ کا مخلص فخرالدین علی احمد

انکے اس مکتوب کے بعد دارالمصنفین کو یکمشت بڑی رقم تو نہیں ملی لیکن ایک ہزار ماہانہ کی امداد گذشتہ سال تک ملتی رہی جس کے لیے دارالمصنفین ان کا بیحد ممنون ہوا،

یہ راقم ان کی خدمت میں بارہا حاضر ہوا، ہر حاضری میں ان کی شرافت خلاق سے متاثر ہو کر اٹھا، جب ہندوستان و پاکستان کی آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا تو میں اپنی لڑکی کی شادی کیلئے کراچی جانا چاہتا تھا۔ تاخیر سے میری پریشانی بڑھ رہی تھی، میں نے جناب فخرالدین علی احمد صاحب کو ایک خط میں اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا، انھوں نے از راہ نوازش اپنے جواب میں یہ تحریر فرمایا کہ میں باضابطہ حکومت کو درخواست دوں اگر اجازت ملنے میں کوئی دشواری ہو تو میں انکو مطلع کروں، اس خط کے لکھنے کے بعد ہی وہ صدر جمہوریۂ ہند ہو گئے، یہ خط میں نے ضلع کے سرکاری حکام اور اتر پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کو دکھایا تو پھر ضروری کارروائیوں میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی، پھر بھی اس میں کافی تاخیر ہو گئی، میں نے ایک دوسرے خط میں اپنی پریشانی کا اظہار جناب فخرالدین علی احمد سے کیا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے وزارت خارجہ کو ٹیلیفون کرایا کہ لکھنؤ کے علاقائی پاسپورٹ آفس کو ہدایت دیجائے کہ میرے لیے جلد پاسپورٹ بنا دیا جائے، وزارت خارجہ سے لکھنؤ

...نک کال آیا جس کے بعد پاسپورٹ لیکر میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ پاکستان روانہ ہوگیا۔ ان کا یہ احسان میرے اور میرے خاندان کے دل ودماغ پر برابر منقوش رہے گا۔

عابدہ احمد بیگم صاحبہ ابتک مسز اندرا گاندھی کے بعد ہندوستان کی معزز ترین خاتون سمجھی جاتی تھیں، وہ اپنے بلند اقبال شوہر کے مہر ومحبت کے عطر میں بسی ہوئی زندگی بسر کررہی تھیں اور اپنے کو ہندوستان کی بہت ہی خوش قسمت خاتون سمجھتی ہوں گی، جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں تو ان کے شوہر کی میت گلاب کے پھولوں کے انبار کے نیچے لوگوں کے آخری دیدار کے لیے رکھی ہوئی ہے، دہلی کے عقیدت مند شہری اس کو دیکھکر انکی زندگی کی کامیابی انکے رتبہ کی بلندی، انکی ملنساری کی خوبی اور انکی مرنجاں مرنج سیاسی حکمت عملی کو یاد کرکے ان کو آخری خراج تحسین پیش کررہے ہونگے، اسکے بعد جنازہ پورے شاہانہ انداز میں اٹھیگا، ماتمی بگل کے بعد توپوں کی سلامی دیجائیگی، میت کی فوجی گاڑی پھولوں سے لدی ہوئی ہوگی، اسکے آگے خوش لباس سواروں کا دستہ ہوگا، اسکے پیچھے مغموم وزیراعظم مسز اندرا گاندھی، قائمقام صدر، وزرا، سفرائے غیر ممالک کے ممتاز نمایندوں کی سواریاں ہونگی، بحری، بری اور ہوائی فوج کے ہزاروں لشکریوں کا جلو ہوگا۔ یہ ماتمی جلوس شان وشوکت کیساتھ نئی دہلی کی سڑکوں سے گذریگا، بیشمار شہری اپنے مرحوم صدر کو الوداعی سلام کہہ رہے ہونگے، ان کے لیے دعائے مغفرت بھی کرتے جاتے ہوں گے، مگر انکی سوگوار اور غمزدہ بیوہ اس شاندار جنازہ کو دیکھکر اپنی زبان حال سے کہہ رہی ہوں گی،

مفہوم کائنات تمھارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا

مسز اندرا گاندھی ان کے غم میں برابر شریک ہوں گی، کیونکہ ان کو اپنی سیاسی زندگی میں کوئی اور راشٹرپتی ایسا معتمد علیہ شاید ہی ملے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو صبر جمیل اور مرحوم صدر جمہوریہ کو ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائیں۔ آمین

رفتید ولے نہ از دلِ ما

مقالات

اسلام میں مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمن

یہ مقالہ پاکستان کی بین الاقوامی سیرت کانگریس میں کراچی کے اجلاس میں پڑھا گیا، جو مارچ ۱۹۷۶ء میں منعقد ہوئی تھی اب کچھ ترمیم و اضافہ کیساتھ معارف میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ص، ع

صدر محترم!

مجھکو خوشی ہے کہ میں سیرۃ النبیؐ کی اس بین الاقوامی کانگریس میں شریک ہوں جس کیلئے میں حکومتِ پاکستان کی وزارتِ مذہبی امور اور ہمدرد نیشنل فونڈیشن کا شکر گذار ہوں، میں اپنی حکومت ہند کا بھی ممنون ہوں کہ اس کی طرف سے یہاں آنے میں ہر قسم کی سہولتیں میسر ہوئیں، میں ہندوستان کی ریاست اتر پردیش کے شہر اعظم گڈھ کے ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی نمایندگی کر رہا ہوں، مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس رہا ہے کہ یہ وہ ادارہ ہے جہاں سے اردو میں سیرۃ النبیؐ پر اتنا قابل قدر لٹریچر شائع ہوا ہے کہ شاید ہی ایسا خزانۂ عامرہ کسی اور زبان میں ہو، اس کے بانی علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں ایک گدائے بے نوا بن کر شہنشاہ کونینؐ کے دربار میں اپنے اخلاص و عقیدت کے جو نذرانے پیش کیے

ہیں، وہ تماشا کے لیے ایک گوہرِ بے بہا کی حیثیت رکھتا ہے، حسن عقیدت کے جو پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چن کر ان کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانۂ نبوت پر اپنی زندگی میں تو نہ چڑھا سکے لیکن یہ سعادت ان کے فاضل اجل شاگرد اور میرے استاد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کو حاصل ہوئی جنھوں نے اس خدمت کو بجا لانے میں اپنی زندگی کے ۳۲ سال صرف کئے، وہ مصلحتِ خداوندی سے آپ ہی کی سرزمین کراچی میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

سیرۃ النبیؐ کی تکمیل چھ حصوں میں ہوئی ہے، پہلے دو حصوں میں تو یہ پیش کیا گیا ہے کہ حضورِ پرنور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات اقدس کے ساتھ کیا تھے، بقیہ چار حصوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آپ اپنے ساتھ کیا لائے اور دنیا کو کیا دے گئے، ان میں حالات طیبہ اور سوانح اقدس کے ساتھ آپ کے نفس معجزات کی حقیقت، مکالمۂ الٰہی، نزول ملائکہ، معراج اور شرح صدر کے بیانات کے بعد منصبِ نبوت کے لوازم و خصائص اور اسلام کے عقائد و عبادات کی تعلیمات کی توضیح کی گئی ہے، آخری حصہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پایہ کتنا اونچا تھا، ان حصوں کے علاوہ حضرت الاستاذ نے مدراس میں سیرت پر چھ خطبے دیے جو خطباتِ مدراس کے نام سے مشہور ہیں، یہ ان کی علمی و ادبی تصانیف کا شاہکار ہیں، پھر انھوں نے بچوں اور عورتوں کے لیے رحمتِ عالم لکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و تعلیمات کو عام کیا، ان ہی کی نگرانی میں صحابۂ کرامؓ اور تابعین پر چودہ جلدیں لکھی گئیں جو آپ کی تعلیمات کے عملی نمونے تھے، ان ہی کے شاگردوں نے دینِ رحمت اور ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری لکھیں، جن میں اسلام کی فراخدلانہ تعلیمات کی مزید وضاحت کی گئی ہے، دار المصنفین کی ان مطبوعات سے ایک خاص ذہن اور مخصوص مکتبِ فکر کی نشوونما ہوئی ہے، میرا یہ مقالہ اسی ذہن اور مکتبِ فکر کی محض آواز بازگشت ہے،

مجھکو اس وقت یہ کہنے میں پندار محسوس ہو رہا ہو کہ انسانیت کی تکمیل کیلئے جتنے فضائل اخلاق کی ضرورت ہوسکتی ہو ان سب کی تعلیم ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اور ان پر خود عمل کرکے دکھایا بیان تزکیۂ نفس، زہد، تقویٰ، عفت، پاکبازی، دیانتداری، شرم، رحم، عدل، عہد کی پابندی، احسان، عفو، درگذر، رواداری، شجاعت، استقامت، حق گوئی اور استغنا وغیرہ جو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمات ہوسکتی ہیں وہ آپ کے ذریعہ ہم کو ملیں اور جتنے رذائل ہوسکتے ہیں ان سب کی مذمت کی گئی ہے، ان تعلیمات کے بعد یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اسلام کا رب رب المسلمین ہی نہیں بلکہ رب العٰلمین ہے اور اس کا رسول رحمت للعٰلمین ہے، مگر ہمارے غیر مسلم ناقدین نے اسلام کے زور، جبر، جیرہ دستی اور عدم رواداری کی بہتان تراشی کی ایک مہم چلا رکھی ہے، کیوں؟ اس کی وجہ تو وہ خود بتا سکتے ہیں، مگر بظاہر یہ مہم یا تو ان کے مذہبی تعصب یا سیاسی مصالح یا اسلام کی تعلیمات سے ناواقفیت کی بناء پر جاری ہے، اگر یہ مذہبی اور سیاسی مصلحتوں کی بناء پر ہے تو یہ خود ان کی عدم رواداری اور متعصبانہ ذہنیت کا ثبوت ہے، اور اگر کسی مطالعہ کے بعد وہ غلط رائے پر قائم کرنے کے خوگر اور عادی ہوگئے ہیں تو ان کی اس مریضانہ ذہنیت کا شاید کوئی علاج نہیں،

دارالمصنفین کے مکتب فکر نے اسلامی فن روایت و درایت کا یہ معیار قائم کیا ہے کہ سب سے پہلے ایک واقعہ کی نوعیت کو کلام پاک کی روشنی میں سمجھا جائے، اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو احادیث صحیحہ کا سہارا لیا جائے، اگر اس میں بھی ناکامی ہو تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے، سیرت کی جو روایتیں اعتبار کے لحاظ سے احادیث کی روایتوں سے فروتر ہوں انکے مقابلہ میں احادیث کی روایات کو ترجیح دیجائے، اگر احادیث کی روایتوں میں اختلاف ہو تو ارباب فقہ و محدثین کی روایتوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ جو روایت عقلی وجوہ، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف سمجھی جائے، وہ لائق حجت قرار نہ دیجائے، روایاتِ احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت

کے بلاوجہ قبول کرنے کی کوشش کیجائے، روایت و درایت کا یہ معیار اسلام کے غیر مسلم نقادوں کے یہاں نہیں پایا جاتا، وہ اسلامی تاریخ کی کچھ جزئیات یا سنی سنائی روایات یا بعض نامعتبر کتابوں کے واقعات کو ماخذ بنا کر محض اپنے زور بیان اور عیارانہ قوت استدلال سے بود کو نابود، نابود کو بود، وجود کو عدم، عدم کو وجود، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا دیتے ہیں، مگر افسوس اس کا نہیں کہ غیر مسلم اسلام کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں بلکہ دکھ اس کا ہے کہ ہم آپ ان کی رائے سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ہمارا مسلک تو یہ ہونا چاہئے کہ ہم انسانیت کو سنوارنے کے لیے اس دنیا میں ہیں، ہمارا رب رب العٰلمین ہے، اس کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے، اس کے کلام کا سرعنوان ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے، اس کی پہلی سورہ الحمد للہ رب العالمین، الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے، اس کی تین سو سے زیادہ آیتوں میں اس کی صفت رحمت کا ذکر ہے، وہ غفور ہے، وہ توآب ہے، وہ ذوالرحمہ ہے، وہ خیر الراحمین ہے، وہ کریم ہے، وہ حلیم ہے، وہ حفیظ ہے وہ ستّار ہے، وہ غفّار ہے، وہ ذوالجلال والاکرام ہے، ہم اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے ہیں، تو پھر رحیمی، کریمی، حلیمی اور ستّاری سے انحراف کر کے عدم رواداری، انسان دشمنی اور ایذا رسانی کو ہم اپنا وطیرہ کیسے بنا سکتے ہیں، ہمارا عقیدہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ ہم دنیا کے لیے رحمت اسلیے بھی ہیں کہ ہم رحمۃ للعالمین کے پیرو ہیں۔

جب خداوند تعالیٰ نے اپنے آخری نبی یعنی ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کا پیام دیکر اس دنیا میں بھیجا تو ارشاد فرمایا :۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (الانبیاء)	میں نے آپ کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

پھر فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ — اے پیغمبر ہم نے تجھکو گواہی دینے والا،
شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا — نیکوں کو خوش خبری سنانے والا، غافلوں
وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ — کو ہشیار کرنے والا، خدا کی طرف اس کے
وَسِرَاجًا مُنِيرًا (احزاب - ۶) — حکم سے پکارنے والا، اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے

پھر تکرار ہے:۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً — ہم نے نہیں بھیجا ہے تم کو اے محمد لیکن تمام انسانوں
لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا) — کے لیے خوشخبری سنانے اور ہشیار کرنے والا بنا کر،

جب ہم رحمۃ للعلمین کے پیرو ہونے کے دعویدار ہیں تو ہمارا مقصد حیات یہ ہے کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں تمام انسانوں کو خوشخبری سنائیں، غافلوں کو ہوشیار کریں تاکہ اپنے رسول کے اسوہ کے پابند ہو کر، روشن کرنے والا چراغ بن کر رہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ — بے شک اللہ سب کے ساتھ عدل،
الْإِحْسَانِ (نحل) — احسان اور سلوک کا حکم دیتا ہے۔

پھر تاکید ہوتی ہے:۔

أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ — تم دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور بھلائی
(قصص) — کرو جیسا کہ خدا تمھارے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔

اس کے معنی ہیں کہ عدل، احسان، حسن سلوک، نیکی اور بھلائی ہماری زندگی کا بھی نصب العین ہے۔
اللہ تبارک وتعالیٰ کفر یعنی اس کے وجود سے انکار، اور شرک یعنی اسکی ذات میں کسی کی

شرکت کو پسند نہیں کرتا ہے، کافر اور مشرک اس کے باغی ہیں، وہ چاہتا تو کفر اور شرک کا تخیل انسانی ذہن میں پیدا ہونے ہی نہیں دیتا، یا کافروں اور مشرکوں کو صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹا دیتا، مگر دنیا میں برابر کفر بھی رہا اور شرک بھی، کافروں اور مشرکوں کو ہر قسم کا عروج بھی حاصل ہوتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنے تمام بندوں کو اپنا فرمانبردار اور اطاعت گذار بنا کر ایک مسلک، ایک عقیدہ اور ایک مذہب کا پابند بنا سکتا تھا، مگر اس کا فرمان ہے کہ اس دنیا میں

مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ	جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر
فَلْيَكْفُرْ (کہف)	اختیار کرے۔
لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ)	دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتوں اور کثرت سے خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتوں کے لیے اجر مقرر کر رکھا ہے، اور ان کو اپنی رحمت کا بڑا حصہ دینے کی بشارت بھی دی ہے، اور ان کافروں کو جو اس کی باندھی ہوئی حدوں سے گذر جاتے ہیں، دردناک عذاب بلکہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رکھنے کے انتباہ سے بھی آگاہ کیا ہے، مگر ان کو اس دنیا میں آزاد چھوڑ رکھا ہے جس سے اس کی قدرت کاملہ کی رواداری عیاں ہے، ان کو راہ راست پر اسلام کے پیام کے ذریعہ سے لانے کی ضرور تلقین کی ہے مگر اس طرح کہ

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی اور
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	اچھی اچھی باتوں کے ذریعہ بلاؤ اور بہت
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (نحل ۱۲۵)	پسندیدہ طریقہ سے بحث کرو۔

اسی کے ساتھ اس کی بھی تلقین ہے کہ

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ	مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًاۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ (انعام ۱۰۸)
معبودوں کی پرستش کرتے ہیں ان کو برا کہو، یہ لوگ نادانی سے خدا کو برا کہنے لگیں گے۔

جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا آخری پیام دنیا میں لائے تو آپ کو یہ حکم ملا کہ آپ کا کام صرف خدا کا پیام پہنچا دینا ہے اور بس

ان علیک الا البلاغ .... شوری ۴۸

وان تولوا فانما علیک البلاغ .... نحل ۸۲

فان تولیتم فاعلموا انما علی رسولنا البلاغ المبین..... مائدہ ۹۵

اگر لوگ روگردانی کریں تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے، آپ پر نہیں، اسکے جوابدہ وہ ہونگے آپ نہیں، ان سے حساب لینا خدا کا کام ہے، آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ .... غاشیہ ۲۲

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَھُمْ .... غاشیہ ۲۶

اور نہ آپ ان کے نگہبان و محافظ ہیں

وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ .... انعام ۱۰۷

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا .... بنی اسرائیل ۵۴

فَمَا اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ .... نساء ۸۰
حَفِیْظًا ....

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز ٹھہرا رکھے ہیں اللہ خود ان کا حال دیکھتا رہتا ہے

وَالذین اتخذوا من دونہ اولیاء اللہ حفیظ علیھم شوریٰ ۶

جن نے اس کے رسول کے ہدایت کے مطابق سیدھی راہ اختیار کی وہ تو اپنے ہی لیے

اختیار کرتا ہے اور جو بھٹکا وہ بھٹک کر اپنا ہی کھوتا ہے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (بنی اسرائیل ۲)

اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہے۔

وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (بنی اسرائیل۔۲)

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم رہی ہے کہ اسلام کے پیام سے روگردانی کرنے والوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ان پر کوئی زور، جبر اور نہ زبردستی نہ کیجائے، یہ رواداری کا پیام یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے، خود اللہ تعالیٰ کو اس کا علم تھا کہ اس کے فرمانبردار بندوں یعنی اسلام کے پیروؤں اور غیر مسلموں، کافروں اور مشرکوں میں تصادم ہوگا، اس لیے اس کی بھی ہدایت دی کہ جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انھوں نے تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا، بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ (ممتحنہ)

ایک اور جگہ ہے کہ جو لوگ تم سے لڑیں، اللہ کی راہ میں ان سے لڑو لیکن کسی قسم کی زیادتی نہ کرو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، (بقرہ ۱۹) یہ بھی حکم ہے کہ جب دشمن صلح کے لیے آگے بڑھیں تو ان سے صلح کرلی جائے، سورۂ انفال ۱۰ میں ہے کہ اگر کافر صلح کے لیے جھکیں تو تم بھی صلح کے لیے جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو

یہود اور مسلمان کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہودیوں کا ذکر بہت ہی خفگی، تکدر بلکہ کراہت سے کیا گیا ہے، ان کے لیے پے در پے رسول بھیجے گئے، مگر انھوں نے سرکشی کی، کسی کو جھٹلایا، کسی کو قتل کر ڈالا (بقرہ ۸۷ و مائدہ ۴۳)، انھوں نے آخرت بیچ کر دنیا کی زندگی خریدی ہے (بقرہ: ۸۶) ان کے دل سخت ہو گئے ہیں، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں کیونکہ بعض پتھروں سے تو چشمے بھی پھوٹ بہتے ہیں (بقرہ: ۷۴)

بائبل میں بھی ان کو خطاکار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداروں کی نسل، باغی جھوٹے فرزند، خدا کی شریعت کو سننے سے انکار کرنے والے کہا گیا ہے (باب ۱، آیت ۴-۵ باب ۳، آیت ۹-۱۴) بائبل ہی میں ہے کہ انھوں نے حضرت سلیمانؑ کو شرک، بت پرستی، جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے متہم کیا، انھوں نے حضرت داؤدؑ پر اوریاہ کی بیوی سے زنا کرنے کا بھی الزام لگایا۔

یہودیوں کی ان تمام مذموم حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انکے مغضوب ہونیکا فیصلہ کیا،

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ	یہ جہاں بھی پائے گئے اُن پر ذلت کی مار ہی
مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ	پڑی لیکن اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ
وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ	میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے، یہ اللہ
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ	کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ	بےچارگی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب
كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی
وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ	آیات سے کفر کرتے رہے، انھوں نے
حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ	پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، یہ انکی نافرمانیوں
كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (آل عمران ۱۲)	اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی غضبناکی کا اظہار ان کے مجموعۂ کتب مقدسہ میں یسعیاہ، یرمیاہ اور ان کے بعد آنے والے انبیاءؑ کی تمام کتابوں میں ہے، اللہ تعالیٰ کی اس غضبناکی کا اظہار حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی ان متعدد تقریروں سے بھی ہوتا ہے جو اناجیل میں ہیں، اس کی توثیق کلام پاک میں اس طرح کی گئی ہے:-

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ	اور یاد کرو جبکہ تمھارے رب نے اعلان
عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن	کردیا کہ وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ
يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ	اُن پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین
إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ	عذاب دیں گے، یقیناً تمھارا رب سزا
(الاعراف ـ ۲)	دینے میں تیزدست ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہودیوں نے جو زیادتیاں کیں اس کا ذکر آگے آئے گا، ان کی اسلام دشمنی مشہور رہی، چنانچہ کلام پاک میں ہے کہ وہ مسلمانوں کی خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ مسلمانوں کو جس چیز سے نقصان پہنچے وہی اُن کو محبوب ہے، انکے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے، اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اس سے شدید تر ہے، ان کا بھلا ہوجاتا ہے توان کو برا معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں، (آل عمران رکوع ۱۲)

کلام پاک میں یہ بھی ہے کہ یہ یہودی جھوٹی باتوں کی ٹوہ لیتے پھرتے ہیں، حرام مال کھاتے چلے جاتے ہیں مگر یہودیوں کی ان تمام نفرت انگیز برائیوں اور بداعمالیوں کے باوجود کلام پاک میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ ہدایت دی گئی کہ جب وہ لوگ تمھارے پاس اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے آئیں تو تم کو اختیار ہے کہ تم فیصلہ کردو یا ان سے کنارہ کش رہو، وہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن اگر فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو، کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (مائدہ ۱۲)

اس سے بڑھکر اور کیا مذہبی رواداری کا درس دیا جاسکتا ہے، اور اسکا عملی ثبوت ہمارے رسول صلعم کی سیرت طیبہ میں ملے گا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

آسمانی کتابوں کی صداقت پر ایمان | ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رسول کے صحیفۂ وحی یعنی قرآن مجید

پر ایمان لائے، لیکن اس کیلئے قرآن مجید میں بھی لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کرے، کوئی مسلمان اُس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ کلام پاک کے ساتھ اور دوسرے پیغمبروں کی کتابوں کو تسلیم نہ کرے، سورۂ بقرہ رکوع ۱۶ میں ہے کہ اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا، اُس پر اور جو کچھ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، خاندانِ یعقوبؑ کی طرف اتارا گیا۔ اس پر اور جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا، اس پر اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ہم ان سب پر ایمان لائے۔ (بقرہ ۱۶)۔ پھر آل عمران۔ ۹ میں یہی بات پھر دہرائی گئی ہے، اس سے انکار کو کفر قرار دیا گیا، سورہ نسار۔ ۲۰ میں ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت گمراہ ہوا۔

کلام پاک میں صحفِ ابراہیم، توریت، زبور اور انجیل کا ذکر تصریح کے ساتھ ہے، مگر کلام پاک ہی میں ہے کہ

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (نسار۔ ۲۳)	ہم نے تم سے پہلے رسول بھیجے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے ہیں کہ ان کے حالات تمکو سناتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جنکے حالات نہیں سناتے ہیں۔

اس کے یہ معنے ہیں کہ کچھ آسمانی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا ذکر کلام پاک میں نہیں کیا گیا ہے، اسی لیے جس کسی صحیفہ میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں اس کو ہم بالتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہ کریں تو تصریح کے ساتھ اس کا انکار بھی کرنے کا حق نہیں رکھتے، اسی لیے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب"۔ (صحیح بخاری کتاب التوحید وحدیث الی آخر)

اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی جلد چہارم باب "کتب الہی پر ایمان" میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

"حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا، یہ رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کرکے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کرکے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے، ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتاب کو جعل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا دنیا کی تمام وحیوں کا انکار کرکے بھی نروان حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کرے جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔" (جلد چہارم ص ۹۹-۵۹۸)

دنیا کی قوموں کے ساتھ رویہ اسی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ رہی کہ مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں حسب ذیل قومیں ہیں (۱) اہل کتاب یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن مجید کو تو نہیں مانتے لیکن ان کتابوں میں سے کسی ایک کو تسلیم کرتے ہیں جس کا ذکر کلام پاک میں ہے، ان کے متعلق اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ اگر اسلامی حکومتوں کے وفادار شہری ہیں تو ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رکھی جائیں، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے، ان کی جان، عزت اور مال کی حفاظت کی جائے، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور اور ان کے جائز کھانے کھا سکتے ہیں۔ (۲) شبہ اہل کتاب، یعنی وہ لوگ جو ان آسمانی کتابوں میں سے کسی کو تسلیم نہیں کرتے جن کا

ذکر کلام پاک میں ہے، مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، ان میں صابئی، مجوس، ہنود اور بودھ وغیرہ شامل ہو سکتے ہیں، اسلام کی تعلیم کے مطابق مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے ہیں، انکا ذبیحہ نہیں کھا سکتے، ان دو باتوں کے علاوہ ان کو اسلامی حکومتوں میں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اہل کتاب کو دیے گئے ہیں یعنی ان کی جان، عزت، آبرو، مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔ (۳) کفار اور مشرکین یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے، اور نہ وہ کسی مذہب کی پیروی کے دعویدار ہیں، اسلامی حکومتوں میں ان کو بھی امن دینے کی تعلیم دی گئی ہے۔ سورہ توبہ ۶ میں ہے کہ اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ چاہے تو اس کو پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے، پھر اس کو اس کی جگہ واپس پہنچا دو، یہ اس لیے کہ یہ لوگ اسلام کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ (توبہ)

اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے کہ اس دنیا میں کچھ کفار اور مشرکین بھی رہیں، اس کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے:۔

اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ جس کسی پر چاہتا ہے راہ گم کر دیتا ہے، جس کسی پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے، اور ضرور ایسا ہونا ہے کہ تم سے ان کاموں کی بازپرس ہو جو دنیا میں کرتے رہتے ہو۔" (نحل ۔ ۶)

عہد رسالت میں کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ نیکی کرنے یا ان کو صدقہ دینے سے ثواب نہیں ملتا، اس پر وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری جس سے مراد یہ تھی کہ ہدایت بخشنا مسلمانوں کا کام نہیں، وہ بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم سے نیکی کریں اور اپنی نیت ٹھیک رکھیں، ان کو اجر ملے گا، کلام پاک کی یہ آیتیں ہیں:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ — تیرا ذمہ ان کو راہ پر لے آنا نہیں ہے

اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَمَا	اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے، اور
تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ	تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ	تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر
اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ	اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل
اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲:۲۷۲)	جائے گی اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا،

اس سلسلہ میں میرے استاذ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سیرۃ النبی میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لیے آمادہ کیا، مجوسیوں صابئیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی (ج ۴ ص ۲۰۱)

رواداری میں رسول اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ

کلام پاک میں رواداری، فراخدلی اور انسان دوستی کی جو تعلیمات دی گئیں اُن پر ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے بھی دکھا دیا جس کی تائید کلام پاک سے بھی ہوتی ہے، آل عمران ۱۵۹ میں ہے کہ بس خدا کی عنایت سے تم ان کے لیے نرم ہو، اے محمد! اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو البتہ یہ لوگ جو تمہارے آس پاس جمع ہیں، تمہارے ارد گرد سے ہٹ جاتے، سورہ توبہ ۱۶ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے فرمایا کہ آپ بھلائی کے بھوکے ہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اس کے نزدیک سب سے پسندیدہ مخلوق وہ ہے جو اس کے کنبہ

کے ساتھ نیکی کرے (طبرانی و بیہقی)، آپ کی تعلیم یہ بھی رہی کہ ایک دوسرے سے تعلقات منقطع نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور خدا کے بندے! بھائی بھائی بن جاؤ (ترمذی ابواب البر والصلہ ما جاء فی الحسد) آپ کا یہ بھی اعلان ہے کہ جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر خدا بھی رحم نہیں کرتا (ترمذی ما جاء فی رحمۃ الناس) فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ دوسروں کیلیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، اور جب آدمی کسی کو دوست رکھے تو خدا کے لیے دوست رکھے (مسند احمد بن حنبل ج ۳ ص ۲۷۲) آپ نے یہ بھی ہدایت کی کہ تم لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، تب مسلمان ہوگے (ترمذی ابواب الزہد) اسلام کے دشمنوں کے مظالم سے تنگ آکر ایک مرتبہ صحابہ نے آپ سے ان کے لیے بد دعا کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (مشکوٰۃ باب فی اخلاق و شمائل)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے منصب نبوت کے فرائض انجام دینے میں جو رواداری اور فراخدلی دکھائی وہ انسانی تاریخ کی بہت ہی روشن اور تابناک مثال ہے، قریش، یہود اور نصاریٰ سب ہی نے آپ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں مگر آپ نے ان سب کو بہت ہی صبر، تحمل اور بردباری سے برداشت کیا،

قریش کی ایذا رسانی جب آپ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو قریش کے تمام سردار آپ کے مخالف ہو گئے، جن میں ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف وغیرہ بھی تھے، ان کی کوشش ہوئی کہ وہ آپ کو اس قدر ستائیں کہ آپ اسلام کی تبلیغ سے باز آجائیں۔ مگر اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ جیسے سربرآوردہ اشخاص مشرف بہ اسلام ہو گئے تو قریش کو یہ کامیابی پسند نہ آئی، اس لیے انھوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو ایک جگہ محصور کر کے تباہ کر دیا جائے، کوئی شخص بنی ہاشم سے قرابت نہ کرے ان کے ہاتھ خرید و فروخت نہ کرے، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دیا جائے، جب تک کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لیے حوالے نہ کر دیں، یہ معاہدہ در کعبہ پر آویزاں کیا گیا، بنو ہاشم مجبور ہو کر شعبِ ابو طالب میں پناہ گزیں ہوئے، جہاں وہ تین سال تک درخت کی پتیاں اور سوکھے چمڑے پکا کر کھاتے رہے، تین سال کے بعد کچھ رحمدلوں کو ترس آیا تو اس معاہدہ کو چاک کر دیا (ابن ہشام ص، طبری ج ۳ ص ۱۱۸۹ سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۲۸ - ۲۲۹) یہ معاہدہ ختم منسوخ ہو گیا مگر قریش کی ایذا رسانی جاری رہی، وہ آپ کی راہ میں کانٹے بچھاتے، آپ نماز پڑھتے تو ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن پر اوجھڑی لا کر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر زور سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بل پڑ جاتیں، آپ کو جادوگر اور مجنون کہتے، شریر لڑکوں کو آپ کے پیچھے کر دیتے، نماز با جماعت میں قرآن پڑھتے تو قرآن کے اتارنے والے خدا کو گالیاں دیتے، کہیں مجمع میں وعظ فرماتے تو ابولہب بدزبانی کرتا جاتا کہ یہ جھوٹ ہے، ان کے فریب میں نہ آنا، یہ لات و عزیٰ کی پرستش چھڑانا چاہتا ہو (صحیح بخاری ص ۶۸۶ و سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۳۰ - ۲۳۶)

مگر ان مزاحمتوں کے باوجود اسلام پھیلتا رہا جس سے پریشان ہو کر قریش دارالندوہ (دارالشوریٰ) میں جمع ہوئے اور یہ طے کیا کہ پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے آپ کا خاتمہ کر دے، اس صورت میں آپ کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا، آل ہاشم تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے، یہ فیصلہ کر کے جھٹ پٹے سے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ کا محاصرہ کر لیا، مگر اسی کے بعد ہجرت کا واقعہ پیش آگیا،

ان ایذا رسانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں :-

"دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں برغبت

سن لی گئی ہوں، حضرت نوح علیہ السلام کو سینکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا، یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے، تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، حضرت عیسٰی علیہ السلام کو دار و رسن کا منظر پیش آیا، اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلۂ واقعات کی غیر معمولی کڑی نہ تھی، لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا؟ سقراط زہر کا پیالہ پی کر فنا ہو گیا، حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آکر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا، حضرت عیسٰی علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے، لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ان سب سے بالاتر تھا، خباب بن الارت نے جب قریش کی ایذارسانی سے تنگ ہو کر آپ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے وہ لوگ گزر چکے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے، تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خدا اس کام کو پورا کرے گا، یہاں تک کہ شتر سوار صنعا سے حضر موت تک سفر کریگا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا، کیا یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری نہیں ہوئی۔" (سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۳۹ - ۲۳۸)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے تو اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا، جنگِ بدر اسی فیصلہ کا نتیجہ تھی جس میں اسلام کے دشمنوں کو شکست فاش ہوئی، مگر جب یہی دشمنانِ اسلام اسیرانِ جنگ بنکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا، یہ قیدی دو دو چار چار

صحابہ کو تقسیم کر دیے گئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ وہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہ نے اس حکم کی تعمیل کی، وہ خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے، مگر ان کو پورا کھانا کھلاتے، ان قیدیوں میں ابو عزیز کا بیان ہے کہ انصار جب ان کا صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھکو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیدیتا، لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے، اور مجھکو واپس دیدیتے، اور یہ اس بناپر تھا کہ آنحضرتؐ نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔" (طبری ص ۱۳۴۸، سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۰۳)

جنگ بدر کی شکست کے بعد مشرکین قریش احد کے میدان میں پھر جمع ہوئے، اپنی ہزیمت کا انتقام لینے کی خاطر بہت ہی غضبناک ہو کر لڑے، وہ اپنے غیظ و غضب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تیروں کی بوچھار کرنے لگے، اس وقت ان کو برا کہنے کے بجائے آپ کی زبانِ مبارک سے صرف یہ نکلا

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ　　اے خدا میری قوم کو بخش دے، وہ جانتے نہیں۔

اور جب دشمنوں کا حملہ اور پھر تیز تر ہو گیا تو عبرت کے لہجہ میں آپ کی زبان مبارک سے یہ حسرتناک الفاظ نکلے کہ وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے، یہ آہ بھی خداوند تعالیٰ کو پسند نہ آئی، جس کے بعد یہ آیت اتری کہ

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (آل عمران ۱۲۸)　　تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں۔

قریش کی اسلام دشمنی برابر جاری رہی، احد کے بعد چھوٹی بڑی لڑائیاں برابر ہوتی رہیں، اور جب ۸ھ میں غزوۂ موتہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے تو انکے سامنے قریش کے وہ تمام سرکش سردار تھے، جنھوں نے آپ کی ایذا رسانی قتل اور مسلمانوں کی خونریزی، غارتگری اور آبرو شکنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، مکہ میں فاتحانہ داخل ہوتے ہوئے

نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ جب تک کوئی شخص خود ان پر حملہ آور نہ ہو، وہ کسی پر تلوار نہ اٹھائیں،
ر جو شخص حرم میں چلا جائیگا یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لیگا، اس کی جان اور آبرو محفوظ رہے گی،
رواداری پر عمل بھی ہوا، اس موقع پر تمام مفاخر، سارے انتقامات اور خونبہائے قدیم آپ کے
موں کے نیچے تھے، مگر آپ نے سب کو نظر انداز کرکے قریش کو اس طرح مخاطب فرمایا کہ جاہلیت
غرور، نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا، تمام انسان آدم کی نسل سے ہیں، اور آدم مٹی سے بنے ہوئے
تھے، خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس موقع کی جو مرقع آرائی علامہ شبلی نے کی ہے، وہ ان کی نثر نگاری کے محاکات کی ایک روشن
مثال ہے، ناظرین کو اس کے پڑھنے میں لطف بھی آئے گا اور پیغمبر اسلام کی رواداری کی ایک اعلیٰ مثال
بھی ان کے ذہن میں نقش ہو جائے گی،

"آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو
اسلام کے مٹانے میں سب کے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلعم پر
گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ وسنان نے پیکرِ قدسی کے ساتھ
گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلعم کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے،
وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلعم کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ بھی
تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں
کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آآکر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی آگ
پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے، رحمتِ عالم نے ان کی طرف دیکھا
اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا تمکو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں"۔
وہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے کہ تو

شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے، ارشاد ہوا، تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو، کفار مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا، اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے، لیکن آپ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ اپنی مملوکات سے دست بردار ہو جائیں۔" (سیرۃ النبی جلد اول ص ۵۰۴)

کیا مذہبی رواداری کی اس سے بہتر مثال کسی اور مذہب کی تاریخ میں مل سکتی ہے؟

وحشی حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کے قاتل تھے، وہ فتح مکہ کے بعد بھاگ کر طائف چلے گئے، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا، رسول اللہؐ نے ان کو مسلمان تو کر لیا لیکن یہ بھی فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے، (صحیح بخاری قتل حمزہ، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۶۲)

ابوسفیان کی بیوی ہندہ تھی، اس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کر کے ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کیے تھے، فتح مکہ کے روز نقاب پوش ہو کر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مسلمان ہو کر امان کی سند حاصل کر لی، رسول اللہؐ نے جب ہندہ کو پہچانا تو اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، ہندہ متاثر ہو کر بول اٹھی، یا رسول اللہ آپ کے خیمہ سے مبغوض تر خیمہ کوئی میری نگاہ میں نہ تھا لیکن آپ کے خیمہ سے زیادہ محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں۔" (صحیح بخاری ذکر ہند، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۶۲)

ابوجہل کے فرزند عکرمہ اسلام لانے سے پہلے آپ کے سخت دشمن تھے، فتح مکہ کے بعد وہ بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں، وہ یمن گئیں، ان کو مسلمان بنا کر آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئیں، ان کو دیکھ کر آپ فرط مسرت میں ان کی طرف بڑھے، اور فرمایا اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو (موطا امام مالک کتاب النکاح، سیرۃ النبی جلد دوم ۳۶۳)

ابوسفیان آپ کے شدید دشمن تھے، آپ کے خلاف جتنی لڑائیاں لڑی گئیں، ان میں سب

نمایاں حصہ ان ہی کا تھا، فتح مکہ کے بعد حضرت عباسؓ ان کو رسول اللہؐ کی خدمت میں لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو قتل کر دینا چاہا، لیکن آپ نے منع فرمایا، رواداری اور فراخدلی کی یہ مثال پیش کی کہ ان کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا، اور فرمایا جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہوگا (صحیح بخاری، فتح مکہ۔ سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۴۶)

ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے تھے، اس سے متاثر ہو کر ایک صحابی نے عرض کیا کہ ان دشمنوں کے حق میں بد دعا فرمائیں، یہ سن کر آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، (صحیح بخاری بعثت النبی، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۸)۔ ایک دوسرے موقع پر چند صحابیوں نے دشمنوں کے لیے اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا "میں دنیا کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں" (مشکوٰۃ اخلاق النبی بحوالہ صحیح مسلم، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۸)

مکہ میں جن دنوں مسلمانوں پر مظالم ہو رہے تھے، تو سخت قحط پڑا، لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے، آپ کا شدید دشمن ابوسفیان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ محمدؐ! تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت جاتی رہے، آپ نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، اور اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت کو دور کر دیا (صحیح بخاری تفسیر دخان ج ۲، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۹)

طائف میں جب اسلام کی دعوت پہنچی، تو وہاں کے لوگوں نے مبلغینِ اسلام پر بڑے مظالم ڈھائے، ان کو بکثرت ہلاک کیا، صحابہ نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ ان کے حق میں بد دعا کیجئے، آپ ہاتھ اٹھاتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ بد دعا فرما رہے ہیں، لیکن آپ یہ فرما رہے تھے "خداوندا! ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور دوستانہ ان کو مدینہ لا، اور یہ دعا قبول ہو کر رہی (ابن سعد غزوۂ طائف، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۹)

اسی طرح آپ سے دوس کے قبیلہ کے لیے بد دعا کرنے کو کہا گیا، تو آپ نے ان کے لیے یہ دعا،

فرمائی "خداوندا! اس کو ہدایت کر اور ان کو لا (صحیح مسلم مناقب اوس، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۰۸)

عبداللہ بن ابی اسلام کی تاریخ میں منافقوں کا سردار سمجھا جاتا ہے، وہ جنگِ بدر کے بعد بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، مگر اس کی مفسدانہ کارروائیاں اسلام کے بدترین دشمنوں سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں، وہ قریش کے سرداروں سے خفیہ خط و کتابت کرتا، مسلمانوں کے مخفی رازوں کو ان کے دشمنوں تک پہنچایا کرتا، مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی دعوتیں دیتا رہا، غزوۂ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، مگر میدان جنگ میں آپ سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا، جس سے مسلمانوں کی قوت بہت کمزور ہو گئی، واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ پر الزام لگایا، لیکن جب وہ مرا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کی مغفرت کے لیے نماز پڑھنے کے لیے آگے بڑھے، حضرت عمرؓ نے اس منافق کی ساری باتیں یاد دلائیں تو آپ نے فرمایا "اگر مجھے اختیار دیا جاتا کہ ستر دفعہ میں نماز پڑھوں تو اس کی بخشش ہو سکتی ہے تو میں اس سے بھی زیادہ پڑھتا" (صحیح بخاری کتاب الجنائز، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۱۸۳)، یہ بھی روایت ہے کہ جب وہ مرا تو اس احسان کے معاوضہ میں کہ اس نے حضرت عباسؓ کو اپنا کرتہ دیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا (بخاری، سیرۃ النبی ج ۲ ص ۳۷۰)

رسول اللہؐ اور یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں سے براہ راست واسطہ اس وقت پڑا جب آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے، جہاں یہودی اپنی دولت اور ثروت کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے، ان کا تمول انکے لین دین کے کاروبار کی وجہ سے تھا، انکے یہاں سود لینا جائز تھا، وہ اس کی شرحیں بے رحمی سے مقرر کرتے اور اس کے وصول کرنے میں بڑی سفاکی دکھاتے، لوگوں کی جائداد پر قبضہ کر لیتے، حتی کہ انکے بچوں اور عورتوں کو اپنے یہاں رہن رکھ لیتے، دولت کی فراوانی کی وجہ سے اُن میں ہر قسم کی عیاشانہ برائیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں، عام طور سے وہ نفرت کی نظروں سے

دیکھے جاتے، مگر لوگ ان کے قرض سے دبے رہتے تھے، اس لیے ان کا اقتدار قائم رہتا، عرب کے قبیلے آپس میں لڑا کرتے تو یہ ان کے اختلاف کو کسی نہ کسی صورت سے بڑھاتے رہتے، اسلام پھیلنے لگا تو یہودیت کا زور ختم ہونے لگا، مسلمان ان کی بداخلاقی کو بری نظر سے دیکھنے لگے، صدیوں سے ان کا جو وقار قائم تھا، وہ ضائع ہونے لگا، قرآن مجید ان کے ذمائم کی علیحدہ پردہ دری کر رہا تھا، پھر بھی مدینہ کے اطراف میں یہودیوں کے تین قبیلوں بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ کا بڑا اثر رہا، انھوں نے اپنے لیے بڑے بڑے قلعے بنا لیے تھے، اور مدینہ کے دو قبیلے اوس اور خزرج کو اپنی فتنہ انگیزیوں سے لڑایا کرتے تھے، جس سے یہ قبیلے پریشان رہتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کی شر انگیزی اور بد باطنی سے واقفیت رکھنے کے باوجود ان کے اور مسلمانوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش فرمائی، مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ لکھوایا جس کے شرائط یہ قرار پائے:۔ (۱) خونبہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، اب بھی قائم رہے گا (۲) یہود کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی (۳) یہود اور مسلمان آپس میں دوستانہ تعلقات رکھیں گے (۴) فریقین سے جب کسی تیسرے فریق سے جنگ ہوگی تو وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے (۵) کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا (۶) کوئی بیرونی طاقت مدینہ پر حملہ کرے گی تو دونوں مل کر مداخلت کریں گے (۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کریگا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا، البتہ مذہبی لڑائیاں اس سے مستثنیٰ رہیں گی (ابن ہشام ج ۱ ص ۹۷، ۲۷۸، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۷۵)

یہ معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذہبی رواداری اور فراخدلی کی ایک ایسی مثال ہے جس پر دنیا ناز کر سکتی ہے، موجودہ دور کی اقوام متحدہ بھی فریقین میں اس سے بہتر معاہدہ نہیں کرا سکتی، مگر اس رواداری کے باوجود یہودی نچنت نہیں بیٹھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کے بجائے مکہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنانے کا اعلان کیا تو یہودیوں کو بڑا دکھ پہنچا،

اور انھوں نے معاہدہ کے باوجود مسلمانوں کی علانیہ مخالفت شروع کردی، وہ مدینہ کے ان لوگوں سے ساز باز کرنے لگے جو ابھی تک بت پرست تھے، یا مسلمان بننے کے باوجود منافقانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے، جب مدینہ پر قریش نے حملہ کیا تو وہ خوش تھے لیکن جب مکہ کے مشرکین کو بدر کے میدان میں شکست ہوئی تو ان کو بڑا دکھ پہنچا، انھوں نے اسلام کی بیخ کنی کو اپنا شعار بنا لیا، بنی قینقاع بڑے طاقتور یہودی تھے، ان میں سے ایک یہودی نے ایک انصاریہ عورت کی بے حرمتی کی تو ایک انصاری نے غیرت اور غصہ میں آکر اس یہودی کو قتل کردیا، یہودیوں نے مل کر اس انصاری کو قتل کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ ان یہودیوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا خدا سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب نازل ہو جائے، انھوں نے جواب دیا کہ ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑیگا تو ہم دکھا دینگے کہ لڑائی کس کا نام ہے، یہ نقضِ امن ایک طرح کا اعلانِ جنگ تھا، رسول اللہ ؐ انکی ریشہ دوانیوں سے عاجز آچکے تھے، اسلیے مجبور ہو کر انکے خلاف جنگ کی، وہ قلعہ بند ہو گئے، پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد انھوں نے اپنی شکست تسلیم کرلی، اور اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ ؐ جو فیصلہ کرینگے ان کو منظور ہو گا، آپنے ان سے انتقام لینے کے بجائے شام کے علاقہ اذرعات میں جلا وطن کردینے پر اکتفا کیا، (سیرت ابن ہشام و ابن سعد غزوۂ بنی قینقاع، سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۷۱)

یہودیوں کے ایک بااثر سردار کعب بن اشرف نے جنگ بدر کے بعد مکہ جاکر قریش کی تعزیت کی اور ان کی حمایت میں نہایت پر زور مرثیہ لکھ کر ان کو انتقام کے لیے ابھارا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو لکھی اور ابوسفیان سے خانہ کعبہ میں لیجا کر انتقام کا حلف اٹھوایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی، ان فتنہ انگیزیوں سے وہ خود قتل کیا گیا (سیرۃ ابن ہشام حالات غزوۂ بدر، بخاری، سیرۃ النبی جلد اول ص، تاریخ اسلام اول از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۵۲)

(باقی)

یہود اور قرآن مجید

از ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے انحراف | یہود کے اخلاقی انحطاط کا اصل سبب یہ تھا کہ ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا رواج ختم ہو گیا تھا، برائیوں کی روک تھام نہ کرنے کی وجہ سے ساری قوم کا اخلاقی مزاج بگڑ گیا تھا، ان کا اجتماعی ضمیر مردہ اور ایمانی و اخلاقی غیرت فنا ہو گئی تھی، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے ہر قبیلہ کی نگہداشت کے لیے ایک ایک نقیب مقرر کیا گیا تھا، مگر آہستہ آہستہ وہ احتساب کے فرض سے غافل ہوتے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم برائیوں میں مبتلا ہو گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کا اس طرح اظہار فرمایا ہے:۔

"بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اس طرح شروع ہوا کہ جب برائی پھیلنے لگی تو پہلے انکے علماء نے منع کیا لیکن جب وہ باز نہ آئے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے لگے تو صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے"[1]

اصحاب سبت کے واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ابتداءً ان کے اندر برائیوں سے روکنے والا ایک گروہ موجود تھا، چنانچہ جب ایک جماعت حیلہ کر کے سبت (سنیچر) کے روز مچھلیاں پکڑنے لگی تو دوسری جماعت نے اس کو اس فعل سے روکا، ان دونوں کے علاوہ ایک

---

[1] جامع ترمذی باب تفسیر سورۂ مائدہ۔

اور انھوں نے معاہدہ کے باوجود مسلمانوں کی علانیہ مخالفت شروع کردی، وہ مدینہ کے ان لوگوں سے ساز باز کرنے لگے جو ابھی تک بت پرست تھے، یا مسلمان بننے کے باوجود منافقانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے، جب مدینہ پر قریش نے حملہ کیا تو وہ خوش تھے لیکن جب مکہ کے مشرکین کو بدر کے میدان میں شکست ہوئی تو ان کو بڑا دکھ پہنچا، انھوں نے اسلام کی بیخ کنی کو اپنا شعار بنالیا، بنی قینقاع بڑے طاقتور یہودی تھے، ان میں سے ایک یہودی نے ایک انصاریہ عورت کی بے حرمتی کی تو ایک انصاری نے غیرت اور غصہ میں آکر اس یہودی کو قتل کردیا، یہودیوں نے مل کر اس انصاری کو قتل کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ ان یہودیوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا خدا سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب نازل ہو جائے، انھوں نے جواب دیا کہ ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑیگا تو ہم دکھادینگے کہ لڑائی کس کا نام ہے، یہ نقضِ امن ایک طرح کا اعلانِ جنگ تھا، رسول اللہ ان کی ریشہ دوانیوں سے عاجز آچکے تھے، اسلیے مجبور ہو کر انکے خلاف جنگ کی، وہ قلعہ بند ہوگئے، پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد انھوں نے اپنی شکست تسلیم کرلی، اور اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ جو فیصلہ کرینگے ان کو منظور ہوگا، آپ نے ان سے انتقام لینے کے بجائے شام کے علاقہ اذرعات میں جلا وطن کردینے پر اکتفا کیا، (سیرت ابن ہشام و ابن سعد غزوۂ بنی قینقاع، سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۷۰)

یہودیوں کے ایک بااثر سردار کعب بن اشرف نے جنگ بدر کے بعد مکہ جاکر قریش کی تعزیت کی اور ان کی حمایت میں نہایت پرزور مرثیہ لکھ کر ان کو انتقام کے لیے ابھارا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو لکھی اور ابوسفیان سے خانہ کعبہ میں لیجا کر انتقام کا حلف اٹھوایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی، ان فتنہ انگیزیوں سے وہ خود قتل کیا گیا، (سیرت ابن ہشام حالات غزوۂ بدر، بخاری، سیرۃ النبی جلد اول ص، تاریخ اسلام اول از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۵۲)

(باقی)

یہود اور قرآن مجید

از ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے انحراف یہود کے اخلاقی انحطاط کا اصل سبب یہ تھا کہ ان میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا رواج ختم ہو گیا تھا، برائیوں کی روک تھام نہ کرنے کی وجہ سے ساری قوم کا اخلاقی مزاج بگڑ گیا تھا، ان کا اجتماعی ضمیر مردہ اور ایمانی و اخلاقی غیرت فنا ہو گئی تھی، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے ہر قبیلہ کی نگہداشت کے لیے ایک ایک نقیب مقرر کیا گیا تھا، مگر آہستہ آہستہ وہ احتساب کے فرض سے غافل ہوتے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم برائیوں میں مبتلا ہو گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کا اس طرح اظہار فرمایا ہے:۔

> "بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اس طرح شروع ہوا کہ جب برائی پھیلنے لگی تو پہلے انکے علماء نے منع کیا لیکن جب وہ باز نہ آئے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے لگے تو صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے"[1]

اصحاب سبت کے واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ابتداءً ان کے اندر برائیوں سے روکنے والا ایک گروہ موجود تھا، چنانچہ جب ایک جماعت حیلہ کرکے سبت (سنیچر) کے روز مچھلیاں پکڑنے لگی تو دوسری جماعت نے اس کو اس فعل سے روکا، ان دونوں کے علاوہ ایک

---

[1] جامع ترمذی باب تفسیر سورۂ مائدہ۔

تیسری جماعت بھی تھی جو اگرچہ اس معصیت میں خود تو شریک نہ تھی مگر وہ پہلی جماعت کو ارتکاب جرم سے منع نہ کرتی تھی اور دوسری جماعت سے یہ کہتی تھی کہ ان لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جو باز آنے والے نہیں اور جن کی ہلاکت یقینی ہے، بالآخر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف برائی سے روکنے والا گروہ اس سے محفوظ رہا، باقی دونوں جماعتیں ہلاک ہو گئیں، ایک تو ارتکابِ جرم کی پاداش میں اور دوسری امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ترک کے باعث،[1]

پھر وہ وقت آگیا جب علانیہ گناہوں کا ارتکاب ہونے لگا اور نیکی بدی کا احساس مٹ گیا، قرآن نے اسی بنا پر کہا ہے:۔

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ	بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان پر
اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ	داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت ہوئی،
وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا	یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور
عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ہ کَانُوْا	حد سے زیادہ آگے بڑھ جایا کرتے تھے، جس
لَا یَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ	برائی کو اختیار کیے ہوئے تھے اس سے منع نہ کرتے
لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (مائدہ: ۷۸، ۷۹)	بہت ہی بری بات تھی جو یہ کرتے تھے۔

یہ فریضہ اصلاً ان کے علماء و ارباب حل و عقد پر عائد کیا گیا تھا لیکن وہ اپنے فریضۂ منصبی سے بالکل غافل ہو گئے تھے، چونکہ انھوں نے اپنے آپ کو شریعت کی پابندیوں سے آزاد کر لیا تھا، اسلیے ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ دوسروں کو ہدایت کر سکیں، انکی ڈھٹائی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بے عملی کے باوجود لوگوں کو پرہیزگاری، نیک عملی اور خدا کی اطاعت کی تلقین کرتے تھے، قرآن کریم نے اس روش پر ان کو یوں ملامت کی ہے:۔

---

[1] اعراف: ۱۶۳ تا ۱۶۵

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ (بقرہ : ۴۴)	کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو درانحالیکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔

حضرت مسیحؑ نے بھی فرمایا ہے :۔

"اے شرع کے عالمو! تم پر افسوس ہے کہ تم ایسے بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہو، آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے" (لوقا ۱۱ : ۴۷)

وہ حق سے خود منحرف اور دوسروں کی اصلاح کی فکر سے تو غافل تھے ہی، اس پر طرہ یہ کہ انکی ساری قابلیت لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے اور دین سے برگشتہ کرنے پر صرف ہوتی تھی، ہادی و مرشد کے بجائے وہ رہزن بن گئے تھے، جھوٹے فتوے دیکر لوگوں کو گمراہ کرتے اور جب اصلاح کی کوشش کیجاتی تو یہ اپنی عالمانہ فریب کاری سے سنگِ راہ بنجاتے، اسی لیے قرآن مجید نے انکے علماء پر "صد عن سبیل اللہ" کا الزام عائد کیا ہے :۔

وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (توبہ : ۳۴)	(یہودی علماء و فقہاء لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

اور دوسری جگہ خدا نے ان سے اپنی نعمتیں چھین لینے کی وجہ یہ بیان کی ہے :۔

وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ كَثِيرًا (نساء : ۱۶۰)	اور اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے ہیں۔

جھوٹ بنی اسرائیل میں جھوٹ کا اس قدر زور تھا کہ قرآن مجید کو کہنا پڑا :۔

وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا سَمّٰعُونَ لِلْكَذِبِ (مائدہ : ۴۱)	اور ان لوگوں میں سے جنھوں نے یہودیت اختیار کی جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صداقت و راستبازی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا، انھوں نے جھوٹ کو اپنا شعار بنالیا تھا، جھوٹی گواہی، جھوٹا بیان اور جھوٹا اشتہار ان کا معمول ہوگیا تھا، اور اپنی اس دروغ بیانی پر ندامت کے بجائے بے تحاشا قسمیں کھاکر جھوٹ کو سچ ثابت کرتے، یہود کے عوام ہی نہیں، ان کے علماء بھی اس میں ملوث تھے، قرآن نے ان کو تنبیہ کی کہ "تم لوگوں کو جھوٹی اور غلط باتیں کہنے سے کیوں نہیں روکتے"[۱] توراۃ میں بھی ان کو اس قبیح عادت سے منع کیا گیا تھا:

"جھوٹا معاملہ نہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو، تم میرا نام لیکر جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ، تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔" (خروج ۲۰: ۱۶)

زنا اور بدکاری یہود کے احکام عشرہ کی ایک دفعہ یہ تھی "اور تو زنا مت کر"۔ (خروج ۲۰: ۱۵) لیکن یہ حکم بھی انھوں نے پس پشت ڈالدیا تھا، میاں بیوی کے درمیان تفریق ڈالنا انکا محبوب مشغلہ تھا[۲] یہ مذموم حرکت وہ اس لیے کرتے تھے تاکہ دوسرے کی بیوی کو اس سے جدا کرکے اپنی طرف مائل کرلیں،

قرآن سے قطع نظر خود توراۃ ان کی بدکاری اور فحش پسندی کے واقعات سے پُر ہے قریۂ اریحا کی فتح کے سلسلہ میں توراۃ نے ان کی یہ حالت بیان کی ہے کہ

"بنی اسرائیل نے یہ شہر حضرت موسیٰؑ کے اخیر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی بدکاریاں کیں، جن کے نتیجہ میں خدانے ان پر وبا بھیجی اور چوبیس ہزار آدمی ہلاک کردیے گئے"۔ (گنتی ۲۵: ۱-۸)

توراۃ کے باب سلاطین میں ان کی متعدد شرارتوں اور نافرمانیوں کے ضمن میں بھی اسکا ذکر ہے

"اور اپنے تئیں بیچ ڈالا کر خداوند کے حضور بدکاریاں کریں کہ اسے غصہ دلا دیں، ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر سخت غصہ ہوا۔" (سلاطین ۱۷: ۱۸)

---

[۱] مائدہ: ۶۳ [۲] بقرہ: ۱۰۲

حضرت داؤدؑ کی مناجات میں ہے:-

"اور (تو) زانیوں کا شریک رہا ہے، تیرے منہ سے بدی نکلتی ہے اور تیری زبان فریب گھڑتی ہے، تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے اور اپنی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے۔" (زبور ۵۰ : ۱۶ - ۲۲)

تورات کے ابواب احبار و استثنا میں زنا کی سزا رجم بیان ہوئی ہے، مگر جب یہود میں زنا اور فواحش کی کثرت ہوئی تو ان کو رجم کی سزا دینے میں پس و پیش ہوا اور وہ طرح طرح کے حیلے بہانے کرنے لگے، حیلہ جوئی کی خاطر یہ لوگ بعض مقدمات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی پیش کرتے، تاکہ وہ اپنی شریعت کے سخت قانون کی گرفت سے بچ جائیں، تفسیر کی کتابوں میں سورہ مائدہ کی آیت [وکیف یحکمونک الخ] کے ضمن میں یہود کے اسی طرح کے ایک مقدمہ کا ذکر ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ خیبر کے کسی معزز یہودی خاندان کی ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق ہوگیا، توراۃ کے قانون کے مطابق ان کی سزا رجم تھی، لیکن وہ ان کو سنگسار نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لیے رسول اللہ صلعم کے پاس اس غرض سے آئے کہ اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے لیکن اگر رجم ہی کا حکم دیں تو اسے قبول نہ کیا جائے، چنانچہ جب آپ نے رجم کا حکم دیا تو انھوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا، آپ نے پوچھا تمہارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا، آپ نے ان کے علماء سے قسم دے کر پوچھا مگر انھوں نے بھی یہی جھوٹی بات کہی، اس موقع پر ایک شخص جس کو وہ تورات کا سب سے بڑا عالم سمجھتے تھے، خاموش رہا، آپ نے اس سے فرمایا، میں تجھ سے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی توراۃ میں زنا کی یہی سزا ہے؟ اس نے بتایا کہ اس کی سزا تو رجم ہی ہے، مگر ہمارے یہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو

انھیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انھیں رجم کیا جاتا، مگر جب عام میں اس سے ناراضگی پیدا ہونے لگی تو ہم نے تورات کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنالیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور ان کا منہ کالا کرکے گدھے پر الٹے منہ سوار کیا جائے " (تفسیر ابن کثیر ۲ ص ۵۸-۵۹)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود میں یہ برائی کتنی عام ہو گئی تھی، اور انھوں نے اس کی سزا میں تخفیف کرکے اس کے مزید فروغ کا کیسا سامان کر دیا تھا۔

حب دنیا | پہلے جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہود کی ساری تگ و دو اور ہر قسم کی سرگرمیاں صرف حصولِ دنیا کے لیے وقف ہو گئی تھیں، وہ اس کے پیچھے ایسے دیوانے ہو گئے تھے کہ ان کی نگاہ میں آخرت کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ گئی تھی۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ (بقرہ: ۸۶)

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت بیچ کر دنیا کی زندگی خریدی ہے۔

اسی لیے ان کو موت سے سخت وحشت اور گھبراہٹ ہوتی تھی، حالانکہ وہ خدا کے محبوب و مقرب ہونے کے مدعی تھے اور اپنے آپ کو آخرت کی نعمتوں کا تنہا حقدار سمجھتے تھے، اس کا لازمی تقاضا تو یہ تھا کہ وہ دنیا پر ریجھنے کے بجائے اس سے وحشت زدہ اور موت سے لرزہ براندام رہنے کے بجائے اس کے آرزومند ہوتے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (جمعہ: ۵)

کہو کہ اے وہ لوگو! جنھوں نے یہودیت اختیار کی ہے اگر تم کو یہ گمان ہے کہ تم ہی لوگوں کے مقابلہ میں اللہ کے دوست ہو تو موت کی آرزو کرو اگر تم لوگ (اپنے دعوے میں) سچے ہو۔

مگر اس کے برعکس قرآن مجید نے ان کا حال یہ بیان کیا ہے کہ

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (جمعہ: ۷)

اپنے اعمال کی وجہ سے یہ لوگ کبھی موت کی آرزو نہ کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

یہی مضمون دوسری جگہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ (بقرہ: ۹۶)

اور تم ان لوگوں (یہود) کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے یہاں تک کہ ان لوگوں سے بھی زیادہ جنھوں نے شرک کیا ہے، ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار سال کی عمر ملے، حالانکہ اگر یہ عمر بھی ملے تو بھی وہ اپنے کو عذاب سے بچا نہیں سکتے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کرتے ہیں

قرآن نے ان کی بزدلی اور جہاد فی سبیل اللہ سے فرار کے جو واقعات بیان کیے ہیں ان سے بھی ان کی یہی مکروہ تصویر سامنے آتی ہے، ان کے آیاتِ الٰہی کو ذریعۂ تجارت بنا لینے، دنیا کے چند سکوں کی خاطر اللہ کے عہد کو توڑنے، حق کو چھپانے اور کتاب الٰہی کی تحریف اور اسکے اندر اپنے طبع زاد فتوے شامل کر دینے کا مفصل ذکر پہلے ہو چکا ہے، ان کو ان معصیتوں میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوتی، اگر کبھی اس زر پرستی اور حبِ دنیا پر ان کا ضمیر ملامت کرتا تو جھوٹے سہاروں اور موہوم تمناؤں سے اپنے کو اس طرح تسکین دے لیتے کہ ہم خدا کے محبوب ہیں، ہماری ساری غلطیاں معاف ہیں، قرآن نے ان کی اسی ذہنیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:۔

وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا (اعراف ۱۶۹)

اور کہتے ہیں ہمارے لیے سب معاف کر دیا جائیگا۔

وہ مال ہی کو عزت و برتری کا معیار سمجھتے تھے، قیادت و سرداری کو تعداد اور مال کے پیمانے سے ناپتے تھے، چنانچہ جب حضرت سموئیلؑ نے ان کے مطالبہ پر طالوت کو انکا سردار مقرر کیا تو وہ اس پر خوش ہونے کے بجائے اللہ کے انتخاب پر اعتراض کرنے لگے اور کہنے لگے

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا	بھلا اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے
وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ	ہو سکتی ہے جبکہ اس سے زیادہ حق دار
وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ	ہم اس امارت کے ہیں اور اسے تو مال
(البقرہ : ۲۴۷)	کی فراوانی بھی حاصل نہیں ہے۔

توراۃ میں ہے :-

"اور ساؤل (طالوت) بھی .... اپنے گھر گیا اور لوگوں کا ایک جتھا جن کے دلوں کو خدا نے مائل کر دیا تھا، اس کے ساتھ ہو لیا، پر بنی بلعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا اور اس کی تحقیر کی اور اس کے لیے نذرانے نہ لائے، پر اس نے اپنے آپ کو ایسا بنایا گویا نہ سنتا تھا۔" (سموئیل ۱۰: ۲۶-۲۷)

توراۃ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ذہنیت سے واقف ہونے کی بنا پر طالوت کو خود بھی اندازہ تھا کہ چونکہ ان کو مالی و خاندانی وجاہت حاصل نہیں ہے اسلیے بنی اسرائیل کو ان کی قیادت منظور نہ ہوگی۔ (سموئیل ۹: ۲۱)

دنیا کے پیچھے اس طرح دیوانگی کی وجہ سے یہود میں جو بڑی بڑی خرابیاں اور اخلاقی پستیاں پیدا ہوئیں ان میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے :-

خیانت عموماً خیانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیا تک محدود سمجھا جاتا ہے، مگر درحقیقت اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور یہود ہر قسم کی خیانت اور بد دیانتی میں مبتلا تھے، انھوں نے سب سے بڑی خیانت تو خود اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت میں کی تھی، اسی

پر حضرت مسیح نے ان کو اس فاحشہ عورت سے تشبیہ دی تھی جو اپنے شوہر سے غداری اور بیوفائی
کرتی ہے، قرآن نے چند لفظوں میں ان کی خیانت اور بدعہدی کی پوری تصویر کھینچی ہے:

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ	تم برابر ان کی خیانت سے مطلع
مِّنْهُمْ (مائدہ: ۱۳)	ہوتے رہوگے۔

ان کی بد دیانتی کا یہ حال تھا کہ:-

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ	اور ان میں ایسے لوگ ہیں کہ اگر تم انکے پاس
لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ	ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک
عَلَيْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ	اسکو ادا نہ کرینگے جب تک کہ تم ان کے سر پر
قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ	سوار نہ ہو جاؤ، یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے
سَبِيْلٌ (آل عمران: ۵)	ہیں کہ امیوں (عربوں) کے معاملہ میں ہم پر

[illegible]

اپنی قوم کا تو کچھ پاس کرتے تھے مگر دوسروں کے معاملہ میں کسی اخلاقی ضابطہ کے پابند نہ تھے،
ان کے نزدیک غیر یہودی کا مال ہڑپ کر لینا معیوب نہ تھا، وہ ان کی امانتوں میں خیانت کرتے
اور ان کے مال میں دستبرد کو کار ثواب خیال کرتے تھے، توراۃ میں غصب، سود اور خیانت
کی جو ممانعت کی گئی ہے، اس کے بارہ میں یہ سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق غیر قوموں اور کافروں سے
نہیں ہے، اس من گھڑت ضابطہ نے دوسری قوموں سے خیانت اور بد معاملگی کرنے میں انہیں
بہت دلیر بنا دیا تھا، دراصل اسرائیلی وغیر اسرائیلی کی تفریق ان کی مذہبی روایات میں قدم قدم
پر ملتی ہے، مثلاً "جو قرض ایک شخص نے دوسرے کو دیا وہ سات سال گذر جانے پر ضرور معاف
کر دیا جائے مگر پردیسی سے تو اس کا مطالبہ کر سکتا ہے" (استثنا ۱۵-۳)
توراۃ میں غیر اسرائیلیوں کے لیے پردیسی اور اجنبی کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے،

سودخواری | سودخواری کا بھی یہودیوں میں عام رواج تھا، وہ بعثت نبویؐ سے پہلے ہی سے حجاز میں آباد تھے، جب یونانیوں اور سریانیوں نے ان کو اپنے علاقے سے نکالا تو یہ عرب چلے آئے اور ان جگہوں میں آباد ہوئے جہاں چشمے اور سرسبز مقامات تھے، پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سودی کاروبار کے ذریعہ ان پر قابض ہو گئے، اس طرح خیبر، مدینہ اور اس کے اطراف میں انھوں نے نہایت مضبوط قلعے تعمیر کر لیے تھے[۱]، عربوں کے مقابلہ میں ان کو معاشی بالادستی بھی حاصل تھی، یثرب (مدینہ) پر یہ اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ وہاں کے دو مشہور قبائل اوس وخزرج کو برابر لڑاتے رہتے اور متحد نہ ہونے دیتے، یہودی چونکہ فلسطین وشام جیسے متمدن علاقوں سے آئے تھے اس لیے عربوں کے مقابلہ میں وہ زیادہ ترقی یافتہ تھے، ان کے دوسرے ملکوں سے کاروباری تعلقات بھی تھے، اس طرح یثرب وحجاز میں غلے کی برآمد اور دوسرے وسائلِ معیشت پر ان کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا، اس کثیر المنفعت تجارت کے علاوہ سودی کاروبار بھی خوب پھیلا ہوا تھا، غریب، کسان اور مزدور ان سے بھاری شرح سود پر قرضے لیکر سود در سود کے جال میں پھنسے ہوئے تھے،

قرآن مجید نے یہود کے غضبِ الٰہی کے مورد ہونے اور ان سے خدا کی نعمتوں کے چھینے جانے کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء - ۱۶۱)　　اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے ہیں حالانکہ اس سے ان کو روکا گیا ہے۔

یہاں قرآن نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ توراۃ کی ممانعت کے باوجود یہ قوم سودخواری کی لعنت میں گرفتار رہی، اس کی توثیق توراۃ کی اس عبارت سے ہوتی ہے،

---

[۱] الملل والنحل شہرستانی ج ۲ ص ۹۴

"اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر اور اس سے سود مت لے، اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایے کے کپڑے گرو میں رکھ لے تو چاہئے کہ سورج ڈوبتے ہوئے اسے پہنچا دے، کیونکہ یہ اس کا فقط اوڑھنا ہے، یہ اس کے بدن کے لیے لباس ہے جس میں وہ سوتا ہے اور یوں ہوگا کہ جب وہ میرے آگے فریاد کرے گا میں اس کو سنوں گا، کیونکہ میں مہربان ہوں۔" (خروج ۲۲ : ۲۵-۲۷)

"اور اگر تمھارا بھائی تمھارے بیچ محتاج اور تہی دست ہو جائے تو تم اس کی دستگیری کرو، خواہ وہ اجنبی ہو خواہ مسافر تاکہ وہ تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے، تو اس سے سود اور نفع مت لے پر اپنے خدا سے ڈر تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے نہ اسے نفع کے لیے کھانا کھلا۔" (احبار ۲۵ : ۳۵-۳۷)

لیکن توراۃ کی ان صاف ہدایات کے باوجود ان کی سود خواری میں کوئی فرق نہ آیا اور تاریخ کے ہر دور میں ان کے حرص و سنگدلی کا یہی رنگ رہا، دوسری قومیں تو خاص طور سے انکے ظلم و استحصال کا نشانہ ہیں، اس بارہ میں انھوں نے اپنی کتاب میں تحریف کر دی اور غیر قوموں سے سود لینے کو بالکل جائز کر لیا، ملاحظہ ہو :-

"تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا۔" (استثنا ۲۳ : ۲۰)

رشوت رشوت خوری کا بھی ان کے یہاں ایسا زور تھا کہ قرآن مجید کو کہنا پڑا

اَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ (مائدہ : ۴۲) (یہود) پکے رشوت خور ہیں

دوسری جگہ فرمایا :

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ اور تم ان (اہل کتاب) میں سے اکثر کو دیکھو گے

فِی الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَاَکۡلِهِمُ السُّحۡتَ (مائدہ: ۶۲) کہ وہ گناہ، زیادتی اور رشوت کھانے میں گرم رو ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخلاقی بیماری وبا کی طرح ان کے اندر پھوٹ پڑی تھی اور ان کی سرشت میں داخل ہو گئی تھی، اس بارہ میں ان کے علماء اور بھی آگے تھے، وہ رشوتیں لیکر خدا کے قوانین تک کو مسخ کر دیتے اور عوام کو حسبِ خواہش غلط احکام بتاتے تھے، اسی لیے قرآن نے ان کو سرزنش کرتے ہوئے کہا ہے:۔

لَوۡلَا یَنۡهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِهِمُ الۡاِثۡمَ وَاَکۡلِهِمُ السُّحۡتَ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ (مائدہ: ۶۳)

ان کے علما و فقہا ان کو گناہ کی بات کہنے اور رشوت کھانے سے روکتے کیوں نہیں، کتنی بری حرکت یہ کر رہے ہیں۔

جب کسی قوم کے اندر اس طرح رشوت کی گرم بازاری ہو جائے تو اس کے یہاں عدل و انصاف باقی نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ یہود کی عدالتیں بے جان اور بے اعتبار ہو گئی تھیں، لوگ حکام کو کچھ دے کر اور گواہوں کو خوش کر کے اپنے موافق فیصلے کرا لیتے، حالانکہ توراۃ میں ہدایت کی گئی تھی:۔

"اپنے سارے فرقوں میں قاضی و حاکم مقرر کیجیو، وہ انصاف سے لوگوں کی عدالت کریں تو عدالت میں مقدمہ نہ بگاڑیو، طرفداری نہ کیجیو اور نہ رشوت لیجیو، رشوت دانشمند کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے اور صادق کی باتوں کو پھیرتی ہے۔" (استثنا ۱۸: ۱۹)

یہی نہیں بلکہ ان کو ہدیہ اور نذرانہ لینے سے بھی منع کیا گیا تھا،

"تو ہدیہ نہ لینا کیونکہ ہدیہ دانشمندوں کو اندھا کر دیتا ہے اور صادقوں کی باتوں کو پھیر دیتا ہے" (خروج ۲۳: ۸)

غیر یہودیوں کے ساتھ تو حلال و حرام کی قید ہی انھوں نے ختم کر دی تھی، اس لیے ان سے رشوت لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، ان کے مذہبی صحیفہ تالمود میں ہے:۔

"جب کسی مقدمہ میں ایک فریق اسرائیلی ہو اور دوسرا غیر اسرائیلی تو اگر اسرائیلی کے موافق فیصلہ یہودی شریعت کے مطابق ہو سکتا ہے تو وہی فیصلہ کرو اور کہہ دو کہ یہی ہمارا قانون ہے، اور اس کے موافق غیر اسرائیلی قانون کے مطابق ہو سکتا ہو تو یہی کر دو اور غیر اسرائیلی سے یہ کہہ دو کہ تمھارے یہاں کا ضابطہ یہی ہے اور اگر ایسا فیصلہ دونوں ضابطوں میں سے کسی ضابطہ سے بھی نہ ہو رہا ہو تو کسی حیلہ سے کام لو۔"

اکل اموال بالباطل | قرآن نے یہود و نصاریٰ کی ان تمام حرکات کو ایک لفظ اکل اموال بالباطل میں سمیٹ لیا ہے، سورہ توبہ میں ان کے علماء و مشائخ کا یہ کردار بیان ہوا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا	اے ایمان والو! بیشک اکثر (یہودی)
مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ	علما اور (مسیحی) راہب لوگوں کا مال باطل
أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ	طریقوں سے کھاتے ہیں۔

(توبہ: ۳۴)

اکل اموال بالباطل بڑا جامع لفظ ہے، اس کے اندر جو مال بھی جھوٹ، فریب، غصب، خیانت، رشوت، چوری، جوے، سود، سٹہ وغیرہ ناجائز ذرائع سے حاصل کیا جائے سب شامل ہے، اسی طرح لین دین اور تجارت کے وہ سب طریقے بھی اس کے اندر داخل ہیں جن میں معاملت کے دونوں فریقوں کی رضا اور مفاد کا خیال نہ کیا جائے بلکہ ایک فریق کا فائدہ ملحوظ رکھا گیا ہو اور دوسرے کو نقصان کا نشانہ بنایا گیا ہو، اسی طرح علمائے یہود صدقات و زکوٰۃ کی رقموں کو فقرا و مساکین میں تقسیم کرنے کے بجائے خود اپنے قبضہ و تصرف میں لے لیتے تھے، یہ بھی اکل اموال بالباطل تھا،[۱]

---

[۱] علمائے تفسیر نے اکل اموال بالباطل کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اس پر جو کچھ لکھا ہے وہ بہت عمدہ ہے۔ (ترجمان القرآن [illegible])

یہ جب ان کے خواص اور علماء کا حال تھا جن کو مخاطب کرکے حضرت مسیح نے ایک بار فرمایا تھا:

"تم نے میرے باپ (رب) کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا دیا، تم اوروں کو تو زیرے اور سونف پر بھی عشر کا حساب بتاتے ہو لیکن دوسروں کا مال ہڑپ کرجاتے ہو۔"

تو عوام کا کیا حال رہا ہوگا، قرآن نے ان کے بھی اس میں ملوث ہونے کا ذکر کیا ہے[1]۔

ہراس اور بزدلی | مال وزر کی طمع اور طویل زندگی کی آرزو نے ان کو اتنا بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں سے جہاد اور خدا کی راہ میں جان ومال کی قربانی سے ہمیشہ پہلو تہی کرتے تھے، وہ ارض مقدس کی بازیافت کے آرزومند تھے مگر حضرت موسیٰ کی یقین دہانیوں اور یوشع وکالب کی ولولہ انگیز تقریروں کے باوجود ان کی بے ہمتی کا وہی عالم رہا، قرآن مجید نے انکی بزدلی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ گذشتہ اوراق میں نقل ہوچکا ہے[2]، اب تورات کا بیان بھی ملاحظہ ہو:۔

"ہمیں زور نہیں کہ ہم ان لوگوں پر چڑھیں، کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زورآور ہیں، یہ زمین جس کی جاسوسی میں ہم گئے تھے، ایک زمین ہے جو اپنے بسنے والوں کو نگلتی ہے، اور سب لوگ جنھیں ہم نے وہاں دیکھا بڑے قدآور ہیں اور ہم نے وہاں جباروں کو یعنی بنی عناق کو جو جباروں کی نسل میں ہیں دیکھا اور ہم اپنی نظروں میں انکے سامنے ایسے تھے جیسے ٹڈے اور ایسے ہی ہم انکی نظروں میں تھے۔" (گنتی ۱۳: ۳۲-۳۳)

"تب ساری جماعت چلا کر روئی اور لوگ اس رات بھر روپا کیے، پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰ وہارون پر کڑکڑائے اور ساری جماعت نے انھیں کہا کہ اے کاش ہم مصر میں مرجاتے اور کاش کہ ہم اسی بیابان میں فنا ہوتے، خداوند کس لیے ہم کو اس زمین میں لاکر تلوار سے گرجائیں اور ہماری جوروان اور بچے پکڑے جائیں۔" (گنتی ۱۴: ۱-۳)

---

[1] نساء ۱۶۱　[2] مائدہ ۲۱-۲۴

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوشع و کالب پر وہ اس قدر برہم ہوئے کہ ان پر پتھراؤ بھی کرنا چاہا تھا۔

ان کے اندر شجاعت و دلیری اور خودداری و عزتِ نفس کا جوہر ہی باقی نہ رہ گیا تھا، اسی لیے ہر قسم کی رسوائیاں برداشت کرتے مگر ہمت و غیرت سے کام نہ لیتے اور عزت کی موت پر ذلت کی زندگی کو ترجیح دیتے، قرآن کریم نے ان کی تاریخ کے ایک ایسے ہی واقعہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں
دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ	کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ڈر
الْمَوْتِ (بقرہ : ۲۴۳)	سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سموئیلؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل تین لاکھ کی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ اپنا گھربار سب کچھ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور عقرون سے جات تک اپنے سارے شہر بھی خالی کر دیے، فلسطینیوں نے اس بزدلی کی وجہ سے ان کا قتل عام کیا اور وہ مقدس تابوت بھی چھین لے گئے جو ان کے یہاں قبلہ کی طرح محترم تھا۔ (سموئیل ۷ : ۱۴)

حضرت سموئیلؑ کی دعا و استغفار اور نصیحت سے جب خوف و ہراس اور بزدلی و دوں ہمتی کی یہ کیفیت کچھ ختم ہوئی اور ان میں قدرے عزم و حوصلہ پیدا ہوا تو انھوں نے ان سے ایک سردار مقرر کرنے کی فرمایش کی تاکہ اس کی قیادت میں اپنے دشمنوں سے لڑ کر اپنے مفتوحہ علاقوں کو دوبارہ حاصل کر سکیں، حضرت سموئیلؑ کو انکی بزدلی کا تجربہ تھا، اس لیے انھوں نے اپنے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ تم لوگ دشمن کا مقابلہ نہ کر سکو گے، مگر انھوں نے کہا کہ ہم اپنے بال بچوں اور علاقوں سے نکال دیا گیا ہے، بھلا ایسی صورت میں بھی ہم لڑنے سے گریز کرینگے، مگر ہوا وہی جس کا حضرت سموئیلؑ کو اندیشہ تھا۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ (بقرہ: ۲۴۶)

پس جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو بجز تھوڑے لوگوں کے سب نے اس سے روگردانی کی،

پھر جب کسی طرح یہ لوگ دشمن کے سامنے پہنچے تو بولے:۔

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ (بقرہ: ۲۴۹)

اب ہم میں جالوت اور اسکی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں۔

انکی بزدلی کا یہی عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا، وہ مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے، قریش کو بھی برابر اکساتے اور بھڑکاتے لیکن کبھی کھل کر سامنے آنے کی ہمت نہ کرتے، انکی لاف زنی سے کبھی مسلمان گھبراتے تو انھیں یہ کہکر تسکین دیجاتی کہ گھبراؤ نہیں،

لَن يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ (آل عمران)

دلآزار باتوں کے سوا وہ تمھیں ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکینگے، اگر وہ تم سے جنگ کرینگے تو پیٹھ دکھا کر بھاگینگے پھر ان کو کہیں سے مدد نہ ملیگی

قرآن کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح نکلی، مدینہ اور اسکے اطراف سے یہود کے زور و اثر کا خاتمہ ہو گیا، بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع اور یہود خیبر سب بھاگ کھڑے ہوئے اور جلا وطن کر دیے گئے مگر کہیں جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔

حرص و بخل یہود کی زر پرستی اور دنیا طلبی نے ان کو بڑا حریص اور نہایت بخیل بنا دیا تھا، انکی تنگ دلی، حرص، بخل اور خود غرضی آجتک ضرب المثل ہے، آج بھی انکا وہی حال ہے، وہ تمام وسائلِ دولت پر قابض ہو کر ساری دنیا پر معیشت کے دروازے بند کر دینا چاہتے ہیں، حالانکہ توراۃ نے ان کو تاکید کی تھی کہ

"تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اسکے غلام اور اسکی لونڈی اور اسکے بیل اور اسکے گدھے اور اسکی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔" (خروج ۲۰: ۱۷)

اوپر کی سطور میں یہود کی چند بڑی بڑی اخلاقی خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے، انکی تمام برائیوں کا احاطہ اس مختصر مقالہ میں ممکن نہیں ہے، مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اخلاقی انحطاط کی آخری حد کو پہنچ گئے تھے،

اس زبوں حالی کا جو انجام ہوا اس کی داستان آیندہ اشاعت میں سنیے گا۔

(باقی)

آلِ مقسم قیقانی سندھی

امام ابن عُلَیّہ بصری اور دیگر علماء و محدثین

از مولانا قاضی اطہر صاحب مُبارک پوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ہندوستان کے جو علمی و دینی خانوادے عرب کے مطلع پر صدر اسلام میں چمکے اور انکے علم و فضل کی روشنی سے صدیوں تک عالمِ اسلام منور رہا، ان میں سے ایک خانوادہ آلِ مقسم قیقانی سندھی بھی ہے، جس میں ریحانۃ الفقہاء، سید المحدثین، امام حافظ ابن عُلیۃ اسمٰعیل بن ابراہیم بن مقسم بصری، ربعی بن ابراہیم بن مقسم بصری، ابراہیم بن اسمٰعیل ابن عُلیۃ، حماد بن اسمٰعیل بن علیۃ اور محمد بن اسمٰعیل بن عُلیۃ جیسے مشاہیر علماء و محدثین گذرے ہیں، آج ہم پہلی بار معارف کے صفحات پر ہندوستان کے اس علمی و دینی خاندان کا تذکرہ پیش کر رہے ہیں، جس کے کارنامے آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں،

قیقان (کیگان، قلات) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آلِ مقسم قیقانی سندھی" بصری کے قدیم وطن قیقان کے محلِ وقوع، تاریخی حالات اور فتوحات کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا جائے تاکہ اندازہ ہو کہ کفر و شرک کی کیسی شدید ظلمتوں سے ایمان و یقین اور علم و فضل کے یہ آفتاب و ماہتاب نمودار ہوئے ہیں، قدیم جغرافیہ نویسوں کے بیان کی رو سے خراسان اور رزابلستان کے درمیان قیقان نامی ایک بہت بڑا علاقہ تھا، اسی نام سے شہر بھی موسوم تھا جو مقامی راجہ کا دار السلطنت تھا، بلاذری نے یہاں کے فتوحات کے سلسلے میں لکھا ہے:-

والقیقان من بلاد السند　　خراسان کی حدود سے متصل قیقان سندھ

مما یلی خراسان[1]　　کے شہروں میں سے ہے۔

ابن خرداذبہ نے المسالک والممالک میں اسے خراسان کی سمت سندھ کا پہلا شہر بتایا ہے[2]۔

یاقوت نے معجم البلدان میں اسے طبرستان کے قریب کا شہر لکھا ہے[3]،

قیقان گیگان کا معرب ہے، موجودہ ریاستِ قلات اسی کے حدود میں واقع ہے۔ قیقانی گھوڑے اور ٹٹو قدیم زمانے سے مشہور ہیں، حتیٰ کہ اب بھی ان کی یہ شہرت باقی ہے۔

اور جدید تحقیقات کی رو سے گیگان یا کیکانان وہ ملک ہے جسے رائے خاندان کے زمانہ میں مشہور سیاح ہوان سانگ نے کی کیانگ نا" کے نام سے ذکر کیا ہے، ملک کیکانان نوشکی کے قریب قصدار (قزدار) اور قندابیل (گنڈاوا) کے درمیان کا علاقہ تھا، اس مقام پر رائے خاندان کی مملکت کی سرحد کا ذکر ہے جس سے مراد سرحد کیکانان ہے، موجودہ ریاست قلات بلکہ سراوان اور جھالاوان کی ریاستیں بھی رائے خاندان کی مملکت میں شامل تھیں[4]،

فتوحات اور سبایا وغنائم | قیقان کا علاقہ نہایت دشوار گذار اور پہاڑی تھا، یہاں کے باشندے بڑے بہادر اور جنگ جو تھے، باہر کے حملہ آوروں کے لیے یہ علاقہ بڑا خطرناک اور مشکلات سے پر تھا۔ اس کا ایک حصہ (قندابیل) جو حدود سندھ میں تھا، عہد فاروقی میں فتح کر لیا گیا تھا، اور اس زمانے سے برابر مسلمانوں کے تصرف میں رہا، البتہ قیقان کا جو علاقہ طبرستان وخراسان سے متصل تھا وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی، اس کے بعد کئی سخت معرکے ہوئے جن میں مسلمانوں کو جان ومال کا نقصان عظیم برداشت کرنا پڑا، لیکن آخرکار مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا اور پورا قیقان ان کے قبضہ میں آگیا، ان جنگوں کی مختصر سرگذشت ذیل کی سطور میں

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۲ [2] المسالک والممالک ص ۲۶ [3] معجم البلدان ج ۷، ص ۱۹۶ [4] حاشیہ فتحنامہ سندھ ترجمہ چچ نامہ ص ۳۸۴ از محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب۔

بیان کی جا رہی ہے،

پہلا اسلامی حملہ | قیقان کے علاقہ پر پہلا اسلامی حملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا، خلیفہ ابن خیاط نے اس جنگ کا سنہ ۳۶ھ قرار دیا ہے لیکن بلاذری کے نزدیک یہ معرکہ ۳۸ھ کے آخر یا ۳۹ھ کے شروع میں اس طرح پیش آیا کہ حضرت حارث بن مرہ عبدیؓ نے مسلمانوں کو غزوۂ ہند کی دعوت دی اور فدائیوں کی فوج لیکر مکران کے آگے بلاد قندابیل تک پہنچ گئے، خلیفہ بن خیاط کا بیان ہے

دوغل فی جبال القیقان	انھوں نے قیقان کے پہاڑی علاقوں
فاصاب سبایا کثیرۃ	میں گھس کر بہت سے جنگی قیدی حاصل کیے۔

دوسری جگہ ہے کہ حارث بنؓ مرہ عبدی نے حضرت علیؓ کے زمانہ میں فوج جمع کرکے بلاد مکران میں جہاد کیا اور کامیابی کے بعد مالِ غنیمت پایا، مگر مقامی باشندوں نے ان کے مقابلہ کے لیے زبردست فوج اکٹھا کی، اور شدید جنگ ہوئی جس میں حضرت حارث بنؓ مرہ اور اسلامی فوج کا بیشتر حصہ شہید ہو گیا،[1]

اور بلاذری کی روایت ہے کہ ۳۸ھ کے آخر یا ۳۹ھ کے شروع میں حارث بنؓ مرہ عبدی نے حضرت علیؓ کی اجازت سے اس طرف توجہ کی اور رضا کارانہ فوج لیکر حملہ کیا،

فظفر واصاب مغنما وسبیا	جس میں انھوں نے فتح یابی کے بعد مال غنیمت
وقسم فی یوم واحد ألف رأس	اور قیدی حاصل کیے اور ایک دن میں ایک ہزار

اس کے بعد ۴۲ھ میں حارث بنؓ مرہ اور ان کے چند رفیقوں کے علاوہ تمام ساتھی شہید ہو گئے، اس حادثہ کے بعد کچھ عرصہ تک مسلمانوں کی طرف سے خاموشی رہی،

---

[1] تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۲۱۴ و ۲۱۵ و ۲۲۹ [2] فتوح البلدان ص ۴۲۱،

دوسرا مرحلہ | حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں قیقان پر دوسرا حملہ ۴۲ھ میں ہوا، اور قبیلہ ازد کے مشہور بہادر حضرت راشد بن عمرؓ جدیدی عبدی نے اسلامی فوج لیکر مکران کی فتوحات کے سلسلہ میں قیقان کو فتح کیا اور گذشتہ شکست اور نقصان کا بدلہ لینے میں شدید اقدامات کیے، بلاذری نے لکھا ہے

ثم غزا القیقان فظفر وغنم	انھوں نے فتح مکران کے بعد قیقان میں جہاد
الغانمات (فتوح البلدان ص ۴۳۴)	کرکے کامیابی حاصل کی اور پے در پے حملے کیے۔

یعقوبی نے بھی راشد بن عمرؓ کی فتوحات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

فغزا القیقان فظفر وغنم	انھوں نے قیقان میں جنگ کرکے کامیابی اور
(تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۵)	مال غنیمت حاصل کیا۔

اس مہم میں حضرت سنان بن سلمہ ہذلی رضی اللہ عنہ شریک تھے، جب امیر لشکر راشد بن عمرؓ جدیدی جنگ کے دوران ایک غزوہ میں شہید ہوگئے تو حضرت سنانؓ بن سلمہ ہذلی نے اسلامی فوج کی امارت سنبھالی،

تیسرا مرحلہ | تیسری بار حضرت معاویہؓ کے دور میں ۴۵ھ میں حضرت عبد اللہؓ بن سوار عبدیؓ نے قیقان میں جنگ کرکے مال غنیمت حاصل کیا، خلیفہ بن خیاط کا بیان ہے:

فافتتح القیقان واصاب غنائم (تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۱۹۲)	انھوں نے قیقان فتح کیا اور اموال غنیمت پائے،

بلاذری نے لکھا ہے

فغزا القیقان فاصاب مغنما (فتوح البلدان ص ۴۳۴)	ابن سوار نے قیقان میں غزوہ کرکے غنیمت پائی

اور قاضی رشید بن زبیر نے کتاب الذخائر والتحف میں تصریح کی ہے کہ

وانہ غزا بلاد القیقان فاصاب منہ غنائم۔ (کتاب الذخائر والتحف ص ۱۷۶)	ابن سوار نے بلاد قیقان میں جہاد کرکے ان سے غنائم حاصل کیے۔

حضرت عبداللہ بن سوار نے قیقان کی فتوحات کے بعد امن و امان قائم کیا، وہاں کے راجہ نے اطاعت قبول کی اور ان کی خدمت میں جزیہ اور فدیہ پیش کیا، سندھ کے عمدہ اور بیش بہا تحائف بھیجے، اس کے بعد عبداللہ بن سوار حضرت معاویہؓ کی خدمت میں شام واپس چلے گئے، اور قیقان میں مشہور بزرگ حضرت کرز بن ابو کرز و بیرہ حارثی عبدیؓ انکے جانشین بنے، خلیفہ نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن سوار نے حضرت معاویہؓ کو قیقانی گھوڑے پیش کیے، عرب میں براذین قیقانیہ انھی گھوڑوں کی نسل سے ہیں،

چوتھا حملہ | قیقان پر چوتھی بار ۴۷ھ میں حملہ ہوا، صورت یہ ہوئی کہ عبداللہ بن سوار جن دنوں حضرت معاویہؓ کے پاس شام میں مقیم تھے، قیقان والوں نے بدعہدی کر کے بغاوت کی راہ اختیار کی اور مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے زبردست فوجی طاقت جمع کرلی، اس لیے حضرت معاویہؓ نے عبداللہ ابن سوار کو دوبارہ یہاں کی امارت پر روانہ کیا، وہ چار ہزار فوج لیکر مکران آئے اور کچھ دنوں وہاں قیام کرکے قیقان کا رخ کیا، مقامی باشندوں سے زبردست جنگ ہوئی، اس بار بھی اسلامی فوج کا بہت نقصان ہوا، امیر لشکر حضرت عبداللہ بن سوار اور فوج کا اکثر حصہ میدانِ جنگ میں کام آگیا، جو لوگ بچ گئے وہ مکران چلے گئے،[۱]

پانچواں حملہ | ۵۰ھ میں قیقان پر پانچواں حملہ ہوا جس کی سرگذشت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سوار اور اسلامی فوج کی بڑی تعداد کی شہادت پر حضرت معاویہؓ کو بہت رنج ہوا، اور انھوں نے غور و فکر کے بعد حضرت سنان بن سلمہ ہذلیؓ کو یہاں کا مستقل امیر مقرر کیا، جنھوں نے مکران و قصدار اور قیقان وغیرہ کو پھر سے فتح کیا، اوپر بیان ہو چکا ہے کہ

---

[۱] تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۰۸

دوسرے حملہ کے وقت حضرت سنان بن سلمہؓ یہاں موجود تھے، اور راشد بنؓ عمر جدیدی جدی کی شہادت پر وقتی امیر بنائے گئے تھے، خلیفہ بن خیاط نے لکھا ہے کہ راشد بنؓ عمر (عبداللہ بن سوار) کی شہادت کے بعد ۵۰ھ میں امیر عراق حضرت سنان بنؓ سلمہ کو حدود ہند کی ولایت پر مقرر کیا، ان کی فوج میں حضرت ابوالیمانؓ نیال معلی بن راشد ہذلی بصری بھی تھے، جو عبادت و ریاضت میں مشہور تھے، ان کا بیان ہے کہ ہم نے سنان بن سلمہ کے ساتھ قیقان میں جہاد کیا، ہمارے سامنے دشمن کی بہت بڑی فوج تھی، سنان بن سلمہ نے اسلامی فوج کو مخاطب کرکے کہا

ابشروا، فانتم بین خصلتین	تم لوگوں کو بشارت ہو کہ تم دو کامرانیوں
الجنۃ والغنیمۃ	یعنی جنت اور غنیمت کے درمیان ہو۔

اس کے بعد انھوں نے سات پتھر لیکر کہا کہ جب دیکھو کہ میں نے حملہ کر دیا تو تم بھی حملہ کر دینا، یہ کہکر وہ کچھ دیر رکے رہے، جب آفتاب نصف النہار پر ہوا تو ایک پتھر سامنے پھینکا اور بلند آواز سے نعرۂ تکبیر کہا، پھر اسی طرح ایک ایک پتھر پھینکتے رہے، یہاں تک کہ صرف ساتواں پتھر رہ گیا، آخر کار سورج ڈھلنے کے بعد اسے بھی پھینکا اور حٰم لا ینصرون کہکر نعرۂ تکبیر بلند کیا، پھر حملہ کیا، ان کے ساتھ ہم نے بھی حملہ کر دیا اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے، ہم نے چار فرسخ تک تعاقب کرتے ہوئے ان سے جنگ کی، یہاں تک کہ ہم دشمن کی ایک جماعت کے پاس پہنچے جو ایک قلعہ میں پناہ گزیں تھی، انھوں نے ہم کو دیکھتے ہی کہا کہ خدا کی قسم آپ لوگوں نے ہم سے جنگ نہیں کی ہے، بلکہ ایسے لوگوں نے ہمیں مغلوب کیا ہے جنھیں ہم اس وقت آپ لوگوں کے ساتھ نہیں دیکھ رہے ہیں، وہ لوگ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے، ان کے سروں پر سفید عمامے تھے، یہ سنکر ہم نے ان سے کہا:

ذلک نصر من اللہ	یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری مدد تھی،

پس واپس ہونے پر پتہ چلا کہ ہم میں سے صرف ایک سپاہی شہید ہوا ہے، ہم نے سنان بن سلمہؓ سے پوچھا کہ سورج کے ڈھلنے تک آپ حملہ کرنے سے کیوں رکے رہے، انھوں نے جواب دیا کہ

كذالك يصنع رسول الله صلى الله عليه وسلم (تاریخ خلیفہ ج۱، ص۲۵)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوات میں ایسا ہی کیا کرتے تھے،

الغرض سرزمین قیقان چار مرتبہ مجاہدین اسلام کا مشہد بننے کے بعد پانچویں مرتبہ مسلمانوں کے قبضہ میں آئی، اب کے مرتبہ حضرت سنان بن سلمہ ہذلی رضی اللہ عنہ جیسے دیندار اور خدا پرست صحابی کی امارت اور حضرت ابوالیمان نیال ہذلی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عابد و زاہد کی شرکت اور ملائکۃ الرحمٰن کی نصرت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی سے نوازا اور قیقان کا وسیع علاقہ اسلامی مملکت میں شامل ہوا،

مقسم قیقانی کوفی امام ابن عُلَیّہ وغیرہ کے دادا مقسم اسی قیقان کے باشندے تھے، وہ ان ہی غزوات میں سے کسی غزوہ میں گرفتار کر کے جنگی قیدی کی حیثیت سے عرب لائے گئے، اس کی تصریح سب سے پہلے ابن عُلَیّہ کا زمانہ پانے والے مورخ و عالم ابن سعد نے طبقات میں ان الفاظ میں کی ہے:

اسمٰعيل بن ابراهيم بن مقسم مولى عبد الرحمٰن بن قطبة الاسدى، اسد خزيمة وكان مقسم من سبى القيقانية مابين خراسان وزابلستان (طبقات ابن سعد، ص ۳۲۵)	اسمٰعیل بن ابراہیم بن مقسم مولی عبدالرحمٰن ابن قطبہ اسدی کے دادا مقسم قیقان کے قیدی تھے جو خراسان اور زابلستان کے درمیان واقع ہے۔

خطیب نے بھی تاریخ بغداد میں ابن سعد کی روایت سے یہی الفاظ نقل کیے ہیں[1]، اور بعد کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں ابن سعد ہی کے حوالہ سے یہی درج کیا، البتہ اس میں وکان مقسم جدلاً ہے، یعنی جدہ کا اضافہ یا تصریح ہے۔[2]

مقسم کس جنگ میں گرفتار ہوکر کب کوفہ آئے اور قبیلہ اسد بن خزیمہ کے غلام ہوئے، ان باتوں کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی ہے، البتہ یہ یقین ہے کہ ۳۶ھ سے ۵۰ھ تک کی پانچ جنگوں میں کسی میں گرفتار ہوکر کوفہ لائے گئے، پندرہ سولہ سال کی مدت میں پانچ مرتبہ معرکۂ کارزار گرم ہوا، ہر جنگ میں مسلمانوں کو بہت سے قیدی اور غلام ہاتھ لگے، ہمارا خیال ہے کہ پہلی جنگ میں مقسم گرفتار ہوئے تھے، جو مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کے حصول کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامیاب تھی، بلاذری کا یہ بیان پہلے گذر چکا ہے کہ

فظفر واصاب مغنما وسبیًا	حارث بن مرہ عبدی نے فتح کے بعد مال غنیمت
وقسم فی یوم واحد الف راس	اور قیدی حاصل کئے اور ایک دن میں
(فتوح البلدان ص ۴۲۱)	ایک ہزار قیدیوں کو اسلامی فوج میں تقسیم کیا۔

خلیفہ بن خیاط نے بھی ان کی کامیابی کے بارے میں لکھا ہے

دوغل فی جبال القیقان فاصاب	قیقان کے پہاڑوں میں گھس گئے اور بہت
سبایا کثیرۃ (تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۱۱۱)	سے جنگی قیدی پائے۔

اگر مقسم ۳۶ھ یا ۳۸ھ کی جنگ قیقان میں گرفتار ہوکر کوفہ لائے گئے تو اس وقت کوفہ کی آبادی پر بیس بائیس سال سے زائد مدت گذر چکی تھی، اور وہاں عربوں کے مشہور قبائل مستقل طور سے سکونت پذیر ہو چکے تھے، جن میں قبیلہ اسد بن خزیمہ بن مدرکہ وہاں کی شہری اور تمدنی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل تھی، اور اس کی بنائی ہوئی مسجدیں، مکانات

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۰ [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۱

اور دکانیں اس کے جاہ و جلال، شان وشوکت اور دولت و ثروت کو ظاہر کرتی تھیں، چنانچہ اس قبیلہ کے ایک فرد سماک بن مخرمہ اسدی کی مسجد سماک کوفہ کی نہایت پُرشکوہ اور پائیدار مسجد شمار کیجاتی تھی، مشہور شاعر اخطل نے اس کے بارے میں کہا ہے:

ان سماکاً بنی مجداً لاسرتہ حتی الممات وفعل الخیر یبتدر
قد کنت احسبہ قینا واخبرہ فالیوم طیر عن اثوابہ الشرر[1]

اسی طرح بنو اسد کی ایک شاخ بنو جذیمہ تھی، جس کے نام سے کوفہ میں مسجد بنی جذیمہ تھی، وہ بڑی اور لمبی چوڑی تھی، اس میں صرافوں کی کئی دکانیں تھیں،[2]

کوفہ کے ان ہی بنو اسد بن خزیمہ کے خاندان میں عبدالرحمٰن بن قطبہ اسدی اپنے زمانہ کے نامور سردار تھے، مقسم ان ہی کی ولا و ملکیت میں آئے، عرب میں اسد بن ربیعہ بن نزار بھی مشہور قبیلہ تھا، اس لیے دونوں بنو اسد میں فرق کے لیے "اسدی اسد خزیمہ" کی تصریح کر دیجاتی ہے،

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقسم نے غلامی کے دور میں کوفہ میں تجارت کرکے اسکی آمدنی سے اپنے کو آزاد کرا لیا تھا، وہ بزاز یعنی کپڑے کے تاجر تھے، بعد میں ان کے لڑکے ابراہیم نے بھی کوفہ میں بزازی کا پیشہ اختیار کیا، اور اس میں اتنی ترقی کی کہ کوفہ اور بصرہ میں ان کی تجارت کا سلسلہ جاری ہو گیا، اس زمانہ میں کوفہ اور بصرہ کے غلام عام طور سے تجارت کرکے بڑی بڑی رقمیں جمع کرتے تھے، اور اپنے آقاؤں سے مکاتبت پر آزادی حاصل کرنے میں ان سے کام لیتے تھے، محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب المحبر میں تسمیۃ اشراف مکاتبی البصرۃ والکوفۃ کے باب میں ایسے بہت سے غلاموں کا تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے تجارت کرکے تیس ہزار، چالیس ہزار، ستر ہزار اور ایک لاکھ درہم پر اپنے آقاؤں سے آزادی حاصل کی تھی، (ص ۳۰۴ تا ۳۰۸)

---

[1] فتوح البلدان ص ۲۰۲ [2] ایضاً ص ۲۸۴

ابراہیم بن مقسم کوفی | مقسم کے بیٹے ابراہیم اشرف ممالیک میں سے تھے، انھوں نے اپنے والد کے کام کو آگے بڑھا کر کپڑے کی تجارت کو ترقی دی اور کوفہ و بصرہ میں اس کو فروغ دیا، ابن سعد نے لکھا ہے

وکان ابراهیم بن مقسم تاجراً من اهل الكوفة، وكان يقدم البصرة بتجارته فيبيع ويرجع (طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۳۲۵)[1]	ابراہیم بن مقسم اہل کوفہ کے تاجر تھے اور وہ اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں بصرہ آتے جاتے تھے، پھر فروخت کرکے واپس جاتے تھے۔

ابراہیم بزاز تھے یعنی کپڑے کی تجارت کرتے تھے، اس کا پتہ امام ابوداؤد کے اس قول سے چلتا ہے، جو انھوں نے ابن عُلیہ کے بارے میں کہا ہے:

وهو رجل من اهل الكوفة بزاز، هو مولى بني اسد (تاریخ بغداد ج ۶، ص ۲۱)	وہ کوفہ کے بزاز یعنی پارچہ فروش تھے، وہ بنی اسد کے آزاد شدہ غلام تھے،

ابراہیم بڑے مالدار اور خوش حال تھے۔ بسلسلۂ تجارت بصرہ آتے جاتے تھے، بعض اوقات وہاں قیام طویل ہو جاتا تھا، اس لیے وہیں عُلیہ بنت حسان نامی ایک عورت سے نکاح کر لیا، جو بنو شیبان کی مولاۃ یعنی آزاد شدہ باندی تھی، یہ عورت باندی ہونے کے باوجود بڑی دیندار اور صاحبِ فضل و کمال تھی۔ دنیاوی اعتبار سے بھی اسے خاص وجاہت حاصل تھی، بصرہ کے علاقہ عوقہ میں اس کا شاندار مکان تھا جو اسی کے نام سے مشہور تھا، بصرہ کے علماء و فقہاء، اور عباد و زہاد میں سے حضرت صالح مری وغیرہ علیہ بنت حسان کے یہاں علمی و دینی استفادہ کے لیے حاضر ہوتے اور وہ باہر نکل کر ان حضرات سے مختلف موضوعات پر کھل کر گفتگو اور سوال و جواب کرتی تھی،[1] علیہ جیسی ذی علم اور صاحبِ علم و کمال عورت سے شادی معمولی

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۳۲۵

...دمی کے امکان میں نہ تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم بڑی تجارت کے ساتھ علم و فضل میں بھی مشہور تھے، اور لوگوں میں انھیں بڑی مقبولیت حاصل تھی،

عُلیہ بنت حسان مولاۃ بنی شیبان (بنی شیبان کی آزاد کردہ باندی) تھی، جیسا کہ ابن سعد اور خطیب وغیرہ نے تصریح کی ہے لیکن اس کے برخلاف صاحب خلاصہ تہذیب الکمال نے علیہ بنت حسان کو بھی مولاۃ بنی اسد بن خزیمہ بتایا ہے،[۱] جو بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا، شاید ابراہیم کی نسبت سے اسے بھی اسدی لکھدیا ہو؟ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم بن مقسم اور علیہ بنت حسان کی شادی میں بڑی خیر و برکت عطا فرمائی، ان سے دو لڑکے اسمٰعیل اور ربعی پیدا ہوئے اور دونوں نے زمانہ کے مطابق علم دین حاصل کیا، مگر اسمٰعیل بن ابراہیم جو ابن علیہ کی کنیت سے مشہور تھے، سید المحدثین اور ریحانۃ الفقہا ہوئے اور ان کی نسل میں علم دین صدیوں تک جاری رہا۔ (باقی)

---

[۱] خلاصہ تذہیب الکمال ص۲۶

تاریخ سندھ

حصہ اول و دوم

ہندوستان کی سرزمین میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ ہی میں اترا تھا، اور یہیں انھوں نے سب سے پہلے حکومت کی بنیادیں استوار کیں، اور ایک ہزار سے اوپر یہاں داد حکمرانی دیتے رہے، جس کے آثار آج بھی سندھ کے در و دیوار سے نمایاں ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کی اسی اولین منزل کے عہد بعہد کی حکومتوں کی بہت مفصل سیاسی و تمدنی و علمی تاریخ ہے۔

(قیمت:۔ ۱۲-۵۰)

مولفہ سید ابوظفر صاحب ندوی

منیجر

روداد

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

از ڈاکٹر ماجد علی خاں لکچرر اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ دہلی

"ذاکر حسین انسٹیٹوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے موضوع پر ایک سمینار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ۲۶ تا ۲۹ر دسمبر ۱۹۷۹ء منعقد ہوا، ذیل کی سطور میں اس کی روداد پیش کیجا رہی ہے، تاکہ جو اہل علم اس موقع پر موجود نہ تھے، وہ بھی سمینار کے مباحث سے واقف ہو سکیں اور منتظمین کو مفید مشورے دے سکیں، یہ روداد ڈاکٹر ماجد علی خاں صاحب لکچرر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مرتب کی ہے، جہاں کہیں کچھ کمی اور زیادتی محسوس ہوئی تو حسب ضرورت حذف و اضافہ کر دیا گیا۔

(معارف)

موجودہ زمانہ میں ایک طرف لادینی اور الحاد کا سیلاب مختلف راستوں سے امنڈ رہا ہے، اور دوسری طرف سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے مذہبی حلقوں کے سامنے نئے نئے مسائل کھڑے کر دیے ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے گہرے مذہبی علم اور عصر حاضر کے تقاضوں سے واقفیت ضروری ہے، ان مشکلات کو تنہا نہ مذہبی درسگاہوں کے فارغ التحصیل حل کر سکتے ہیں، نہ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ، کاروبار حیات کی وسعت اور علوم و فنون کی کثرت کے اس دور میں ایسے جامع العلوم

اشخاص کا وجود محال ہے جو زندگی کے ہر میدان میں پورے طور پر رہنمائی کرسکیں، اس لیے اسکے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ علوم اسلامی کے ماہر اور جدید تعلیم کے صاحب نظر اصحاب جمع ہو کر ان مسائل پر غور کریں اور ایسا حل نکالیں جو کسی تحریف و انحراف کے بغیر اصول اسلام کے مطابق اور وقت کے تقاضوں کے موافق ہو، یہ سمینار اسی غرض سے منعقد کیا گیا تھا اس میں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علما، اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کافی تعداد میں شریک ہوئے اور پہلو بہ پہلو بیٹھ کر مختلف مسائل پر غور کیا اور خلوص اعتماد کی فضا میں مفید فیصلے کئے۔

شاید اس نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا، اس میں دار العلوم دیوبند، دار العلوم ندوۃ العلماء، مدرسۃ العلم فرنگی محل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے فضلاء اور دہلی، مدراس، بنارس اور لکھنؤ کے ارباب فکر و نظر کے علاوہ بعض مسیحی اداروں کے نمایندوں نے بھی شرکت کی۔

اس موقع پر جناب شہاب الدین صاحب انصاری ناظم کتب خانۂ جامعہ نے اسلامی کتب کی ایک نمایش کا انتظام بھی کیا تھا، جس میں قرآن مجید، اسلامی علوم، اہم کتابیں اور مسلم آرٹس کے دلکش نمونے جمع کئے گئے تھے۔

سمینار کا افتتاح صدر جمہوریۂ ہند عزت مآب جناب فخرالدین علی احمد صاحب نے کیا، اور افتتاحی جلسہ کی صدارت دار العلوم دیوبند کے مہتمم جناب مولانا محمد طیب صاحب نے کی، اس جلسہ میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے کہ پنڈال اپنی وسعت کے باوجود تنگ نظر آنے لگا، اس موقع پر مندوبین کے علاوہ بیرونی ممالک کے سفرا اور دہلی کے بہت سے اہل علم اور عمائد بھی موجود تھے۔

سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریۂ ہند جناب فخرالدین علی احمد صاحب نے فرمایا

"اسلام میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ہر دور کے لیے ایک پیغام اور رہنمائی رکھتا ہے، اسلام نے جمود پر حرکت کو ترجیح دی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ہر زمانہ کے لیے ہے، بدلتے ہوئے حالات میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید ہماری زندگی کے ہر گوشہ میں تشریح طلب ہوگئی ہے، یوں تو اسلام نے زندگی کے ہر پہلو پر شروع ہی سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے جس کو وقت کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے، حصول علم، حقوق اہل و عیال، حب الوطنی، قومیت، رواداری، امن، ہم آہنگی، اتحاد و اتفاق، مساوات، معاشرتی انصاف، ہمدردی، غرض دینی و دنیاوی اعتبار سے کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا حل ہم کو قرآن پاک اور سیرۃ النبیؐ سے نہ ملتا ہو لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور علم کے پھیلاؤنے کائنات، اپنی ذات اور سماجی زندگی کے بارے میں انسان کی نظروں کو پہلے سے زیادہ وسعت اور گہرائی عطا کر دی ہے، فکر اسلامی کی تشکیل جدید کو سائنس کی ترقی، علوم کے پھیلاؤ، تمدن کی پیچیدگی اور بدلتے ہوئے سماجی رشتوں کی پوری رعایت دھیان میں رکھنی ہوگی، ہمیں اس اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے کہ ایسا کرنا ممکن ہے کیونکہ فکر اسلامی ماضی میں بھی ترقی کی صلاحیت کا مظاہرہ کر چکا ہے، تاریخ اسلام کا یہی نازک مرحلہ تھا جب ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ، سرسید احمد خاں، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے علماء اور مفکرین نے فکر اسلامی کی تشکیلِ نو کا کام ہاتھ میں لیکر مایوسی کو امید اور جمود کو حرکت سے بدلنے کی کوششیں کیں۔"

صدر جمہوریۂ ہند نے تجویز کیا کہ "وقت کا تقاضا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں، اپنے خیالات کو غور و فکر کی نئی روشنی میں ڈھالیں اور ترقی کی دوڑ میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلیں، اس کے لیے وسیع النظر

اور وسیع القلب ہونے کی ضرورت ہے ۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ " کسی بھی ادارہ کی ترقی اور وسعت کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے دائرۂ کار کا تعین ہو اور اسکے مناسب اشخاص کا انتخاب ہو، پھر وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق راہیں پیدا کر لیتے ہیں، جن مسائل پر غور کرنا ہو ان کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرنا چاہیئے جو اس کے اصول و فروع سے بخوبی واقف ہوں، اسلام ایک ایسا دین ہے جو ہر دور کے تقاضے پورے کر سکتا ہے، کتاب و سنت کی مشعلِ ہدایت نے ہر زمانہ میں رہنمائی کی، عرب کے سادہ ماحول سے اسلام آگے بڑھا تو ایرانی تہذیب، رومی تمدن اور یونانی علوم سے مڈبھیڑ ہوئی ۔ مگر اللہ نے ایسے لوگوں کو پیدا کر دیا، جنھوں نے ان کے تار و پود بکھیر دیے، پھر باطنی علوم کا سامنا ہوا، مگر صوفیاے اسلام نے اس طلسم کو بھی توڑ دیا، پھر عقل پرستی کا دور اور اب سائنسی مشاہدات کا زمانہ ہے، اسلام کے اصول ہر دور میں اٹل رہے، عقائد و عبادات ناقابل تغیر ہیں، ہاں معاشرت و معاملات کے مسائل پر غور ہوتا رہا ہے، اور علما، و فقہا، زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے رہے ہیں ،

افتتاحی اجلاس میں جن لوگوں نے تقریریں کیں ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین خاں، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، شعبۂ اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز کے صدر پروفیسر مشیر الحق اور ایرانی کلچرل کونسلر مسٹر ایف مجتبائی شامل ہیں ،

شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا: " یہ سمینار عام سمیناروں سے مختلف ہے، ہندوستان میں اسلام ایک نئے موقف اور مسلمان ایک نئے ماحول میں موجود ہے، دیگر ہم وطنوں کی طرح اس کا عہد و پیمان بھی سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم سے اٹل ہے،

جس کا تقاضا ہے کہ وہ ایک نئی نفسیات کا حامل ہو، اپنے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کا احترام کرتا ہو، جمہوری طریق حیات پر عامل ہو، اور سوشلزم کا معاشی وظیفہ رکھتا ہو، ان اقدار کے ڈھانچہ میں جب ہندوستانی مسلمان کے ذہن کی ساخت و پرداخت ہوگی تو اس کے تمام افکار و تصورات میں تبدیلی اور توسیع ہوگی، مذہبی فکر کے بھی ان سانچوں اور ڈھانچوں پر جو سیکڑوں برس پہلے مخصوص حالات میں وضع کیے گئے تھے، از سر نو غور کرنا ہوگا، ہندوستانی مسلمان کا انداز فکر ایک ہی مسلکِ دین کا پیرو ہونے کے باوجود ایک عرب، ایک ایرانی اور ایک پاکستانی سے مختلف ہوگا، اسے تشریح، تفسیر اور تعبیر کے نئے مقامات سے گزرنا ہوگا، مذہبی فکر کی تشکیل نو کے اس عمل میں اسے ضمنی و حقیقی، فروعی و اصلی اور موقتی و ابدی اقدار کے فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا، ظاہر ہے ان کے نازک امتیازات کی تمیز کا حق صرف 'مکمل عالم' کو پہنچتا ہے، جو ایک طرف دینی علوم اور ان کے متعلقات کا ادراکِ کامل رکھتا ہو، اور دوسری طرف عصر جدید کے ان تقاضوں، عوامل اور محرکات کا واقف کار بھی ہو، جو حیات اجتماعی کو سیاسی، معاشرتی اور معاشی اعتبار سے زیر و زبر رکھتے ہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ ایسے ہی عالموں کی تخلیق چاہتی ہے، جو جدید و قدیم کے ماہر ہوں، جنکا اپنے محوروں سے راست تعلق ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ حیات اجتماعی کی کلیت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور دورجاتِ علم پر مربوط انداز میں سوچنے کی اہلیت جو وارداتِ قلبی کی باطنیت کے ہم راز ہوں لیکن باخبر ہوں اس طبعی، معاشی اور معاشرتی ماحول سے جو ان کے اردگرد پھیلا ہوا ہے، جن کی فکر نہ صرف اسلام بلکہ دیگر مذاہب سے تجرید کر سکتی ہو ان اقدار عالیہ اور مطلقہ کی جو اس ملک کی روایات اور طرز حیات میں صدیوں سے پیوستہ ہیں اور جو ہر لحظہ ہمارے عمل و کردار کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔

اس کے بعد انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ضیاء الحسن فاروقی نے انسٹی ٹیوٹ کا مختصر تعارف

کراتے ہوئے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ جس قدر آج پیچیدہ ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا لیکن یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو علماے اسلام اور مسلم دانشور زیادہ دن تک نظر انداز نہیں کر سکتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ علماء وقت کے علوم اور زمانہ کے نئے تقاضوں سے پورے طور پر آگاہ نہیں ہیں، اور جدید تعلیم گاہوں سے نکلے ہوئے افراد علوم اسلامی سے کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتے ہیں، ضرورت ہے کہ ان دو مختلف حلقوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے، اس سیمینار کے انعقاد کا یہی مقصد ہے۔

اس کے بعد ایرانی سفارت خانہ کے کلچر کونسلر ڈاکٹر مجتبائی نے سمینار کے موضوع پر انگریزی میں ایک مختصر تقریر کی، پھر پروفیسر مشیر الحق، جوائنٹ ڈائرکٹر سمینار اور صدر شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز جامعہ ملیہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس افتتاحی اجلاس کے بعد سہ پہر سے مقالات کے جلسے شروع ہوئے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) پہلا اجلاس ۲۶ دسمبر ۱۹۷۶ء ۳ ½ بجے سہ پہر سے ۸ بجے شب تک

صدر: جناب پروفیسر علی محمد خسرو، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی دار المصنفین، اعظم گڈھ	اسلامی شریعت اور وقت کے تقاضے،
۲۔ جناب پروفیسر مشیر الحق صاحب صدر شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی	علم کلام اور شریعت کی نئی تعبیر

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۳۔ ڈاکٹر بدر الحسن عابدی بنارس ہندو یونیورسٹی	نئے ہندوستان میں اجتہاد کا مسئلہ ذہنی نقطۂ نظر
۴۔ محمد رحمت علی صدر شعبۂ معاشیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	اسلام اور دولت کی منصفانہ تقسیم

(۲) دوسرا اجلاس، ۲ دسمبر ۶۷ء ۹ بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک۔

صدر: جناب مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، مشیر علمی دار المصنفین اعظم گڈھ و سابق ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ	جدید فکر اسلامی کی تشکیل میں تصوف کا حصہ
۲۔ جناب مولانا مجیب اللہ ندوی مہتمم جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ	فکر اسلامی کی تشکیل جدید اسکے محرکات اور ضرورت
۳۔ جناب حسن الدین احمد اکاڈمی آف اسلامک اسٹڈیز، حیدرآباد	حدیث پر نظر ثانی کی ضرورت
۴۔ جناب ڈاکٹر یوسف کوکن، مدراس یونیورسٹی	امام ابن تیمیہ کا مجتہدانہ موقف
۵۔ جناب ڈاکٹر انور معظم عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد	جمال الدین افغانی اور علماء
۶۔ جناب ڈاکٹر عبد الحق انصاری وشوا بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن	علم کلام کا ایک تنقیدی جائزہ

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۷۔ جناب مولانا برہان الدین سنبھلی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	تقلید مثبت و منفی پہلو

(۳) تیسرا اجلاس، ۲۷ دسمبر ۱۹۷۶ء، ۲½ بجے سہ پہر سے ۶ بجے شام تک۔

صدر: جناب بدر الدین طیب جی سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب پروفیسر سید مقبول احمد صدر شعبۂ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی	روایت اور تجدد: جدید نقطۂ نظر
۲۔ جناب نجات اللہ صدیقی شعبۂ معاشیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	نئے ہندوستان میں اجتہاد کا دائرۂ عمل
۳۔ جناب مولانا وحید الدین خاں، دہلی	جدید علم کلام اور اس کی اہمیت
۴۔ ڈاکٹر طاہر محمود شعبۂ قانون دہلی یونیورسٹی۔	عالم عربی میں قانونی اصلاحات
۵۔ جناب انوار علی خاں سوز شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	نو راسخ العقیدگی اور فکر اسلامی کی تشکیل جدید
۶۔ ڈاکٹر رفیق سید، شعبۂ سوشل ورک جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	اسلام میں فکر کی تشکیل نو: عمرانیاتی نقطۂ نظر

(۴) چوتھا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۷۶ء، صبح ۹ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک

صدر: جناب ڈاکٹر سید عابد حسین سکریٹری اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی۔

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب پروفیسر وحید الدین انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی	اسلامی فکر کی تشکیل نو اقبال کی نظر میں

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۲۔ جناب مولانا پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی و مدیر برہان	شاہ ولی اللہ کا نظریۂ اجتہاد
۳۔ جناب مولانا محمد رضا انصاری شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	مولانا عبد الحیٔ کا فقہی موقف اور نئے ہندوستان میں اس کی معنویت
۴۔ جناب ڈاکٹر کرسچین ٹرال۔ ودیا جیوتی، دہلی	سر سید احمد خاں اور علم کلام کا احیاء

(۵) پانچواں اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۷۰ء، سہ پہر ۳½ بجے سے ۷ بجے شام تک۔

صدر : جناب ڈاکٹر یوسف حسین سابق پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری شعبۂ سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	اسلامی قانون سازی: اصول و طریقۂ کار
۲۔ جناب ڈاکٹر غیاث الدین اڈلفی ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ	الربط بین الاسلام والنصرانیہ
۳۔ جناب مولانا ریاست علی، دار العلوم دیوبند	فقہ حنفی میں فہم معانی کے اصول
۴۔ جناب ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	اجماع
۵۔ جناب مولانا سعید احمد پالنپوری، دار العلوم دیوبند	فکر اسلامی کی تشکیل جدید: ضرورت اور لائحۂ عمل
۶۔ جناب مولانا عزیز احمد قاسمی، دار العلوم دیوبند	فکر اسلامی اور شریعت کی نئی تعبیر

(۶) چھٹا اجلاس ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۱ء، صبح ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک

صدر: جناب حیات اللہ انصاری، ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی۔

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	حدیث کا تنقیدی مطالعہ
۲۔ جناب ڈاکٹر محمود الحق شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	مفتی محمد عبدہ کا مجتہدانہ موقف
۳۔ جناب مولانا ابوالعرفان ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	قیاس، استحسان اور عرف

وقت کی کمی کے باعث پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اور ڈاکٹر محمد سالم قدوائی ندوی (ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز عرب ایرانین اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ) اپنے مقالات نہیں پڑھ سکے، ان کے مقالوں کے عنوان بالترتیب اس طرح ہیں: "عربی مدارس، نصاب تعلیم اور فکر اسلامی"، "سرسید کا مذہبی نقطۂ نظر ان کی تفسیر کی روشنی میں"۔

تمام مقالات بہت دلچسپی سے سنے گئے۔ سامعین میں مقالہ نگاروں اور مندوبین کے علاوہ مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام اور دانشوروں نیز مقامی حضرات نے بہت بڑی تعداد میں شرکت کی، ان میں پروفیسر محمد شفیع پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی؛ پروفیسر انوار الحق حقی ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی؛ ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی، ریڈر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پروفیسر سید حسین محمد جعفری امریکن یونیورسٹی بیروت قابل ذکر ہیں، پروفیسر سید حسین محمد جعفری نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر ایک مختصر تقریر بھی کی،

فروری ۱۹۶۸ء ... بحث و گفتگو بڑی اچھی فضا میں ہوئی، جدید و قدیم درسگاہوں کے فضلا نے ایک
مقالات پر بحث و
سمجھنے کی پوری کوشش کی، سب سے پہلا مقالہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی
دوسرے کے نقطۂ نظر کو
موصوف نے فرمایا "مسلمان اسلام کو خدا کا آخری دین، قرآن مجید کو
صاحب کا تھا، اپنے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو آخری پیغمبر سمجھتے ہیں، ایسی صورت میں
آخری کتاب اس طرح جامد سمجھا جا سکتا ہے، جب قیامت تک قرآن مجید زندگی کا
دستور اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت معیار عمل ہے تو ان کے اندر قدرتاً ایسی
لچک ہونی چاہئے کہ اس تغیر پذیر دنیا میں اسلامی احکام پر عمل میں کوئی دشواری محسوس نہ ہو۔"
آپ نے وضاحت کی کہ "دین کے اصل ماخذ کتاب و سنت ہی ہیں، اجماع اور قیاس کا درجہ
انکے بعد ہے، ان میں یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ کتاب و سنت سے انحراف نہ ہونے پائے،
حقیقی اجماع خلافت راشدہ کے ابتدائی دور کے بعد نہیں ہو پایا، البتہ ایسا ہوتا رہا ہے
کہ اہل علم یا اربابِ حل و عقد نے غور کرکے کوئی بات طے کر لی اور جب اس کا اعلان ہوا
تو کسی نے اختلاف نہیں کیا، اس طرح رفتہ رفتہ اس نے تواتر عملی کی شکل اختیار کر لی، ایسے
اجتماعی فیصلے کی بھی بڑی اہمیت ہے، لیکن بعد کے زمانے میں جب حالات و مصالح کی
نوعیت وہ نہ رہ گئی جس کی بنا پر پہلا اجتماعی فیصلہ کیا گیا تھا اور اس کے برعکس موجودہ حالات
و مصالح کا تقاضا کچھ اور ہو تو اس پر اہل علم نظر ثانی کر سکتے ہیں، البتہ کتاب و سنت کا خیال
ہر حال میں رکھنا پڑے گا۔" مولانا عبدالسلام صاحب نے موجودہ حالات میں اجتماعی فیصلوں کے
لیے ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل کی تجویز پیش کی جس میں علوم اسلامیہ کے ماہرین کے ساتھ ایسے جدید تعلیم یافتہ
حضرات بھی شامل ہوں جو عصر حاضر کے مسائل سے گہری نظری واقفیت کے ساتھ مکمل عملی تجربہ بھی رکھتے ہوں۔
جناب پروفیسر مشیر الحق اپنے مقالہ میں زمانۂ حال اور مستقبل میں رونما ہونے والے تقاضوں کے

ش نظر اُن علتوں پر اظہار خیال کیا جو کہ مختلف احکامات کے تحت منصوصات میں بیان کی گئی ہیں'
نے فرمایا "ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی کو بذات خود تو دوام اور قطعیت کا درجہ حاصل ہے لیکن اس کا جو
فہوم ذہن انسانی نے متعین کیا ہے، اس کی وہ حیثیت نہیں ہے علم الٰہی کا احاطہ انسان کے بس
ں نہیں ہے، اسکی عقل تغیر پذیر حالات وکیفیات کی تابع ہے' وہ زمان ومکان کے دائرہ سے باہر نہیں
اسکتی ہے۔ منشائے ایزدی کا مکمل ادراک اس کے لیے ناممکن ہے، غور سے دیکھا جائے تو قرآنی آیات
ں ایسے اشارات موجود ہیں، حسب ضرورت علل وحکم بھی بیان کیے گئے ہیں، سلسلۂ کلام میں احکام
یراث اور اسلامی قانون شہادت سے متعلق آیات کا ذکر آگیا تو آپ نے فرمایا کہ" اس سے کسی کو یہ غلط فہمی
ہو کہ میں قانونِ میراث یا قانونِ شہادت میں کسی قسم کی تبدیلی کا مطالبہ کر رہا ہوں، میرے مضمون کی
رض یہ نہیں ہے۔ میں تو ایک کلامی مسئلہ سے بحث کر رہا ہوں کہ انسان کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے علم کا
مل ادراک نہیں کر سکتا، آیاتِ الٰہی کا حقیقی مطلب وہی جانتا ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی
کتاب کو ہر زمان ومکان کے لیے نامۂ ہدایت تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارا اس بات پر
بھی ایمان ہو کہ وحیِ الٰہی میں ماضی ومستقبل کی تمام ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور جس طرح قدیم مفسّرین
نے اپنے زمانہ میں اپنے علم وفہم کے مطابق اس کا مفہوم متعین کیا ہے، اسی طرح حال اور مستقبل کے مفسر اپنے
اپنے دور میں آیاتِ الٰہی کا مطلب بیان کرتے رہیں گے اور احکامِ الٰہی کے نفاذ میں ماحول کی رعایت
اور زمان ومکان کے تقاضوں کا لحاظ رہے گا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے اپنے مقالہ میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید یا علم کلام اور
شریعت اسلامی کی نئی تعبیر کے تین محرکات: مرعوبیت۔ ترقی پسندی اور برسر اقتدار طبقہ کا دباؤ
پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ" اسلام کوئی اقلیدس کا فرضی نقطہ یا کوئی ایسا مجرد نظام نہیں ہے جس کا
عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ رہا ہو، وہ کیمیا اور طبیعیات کے دوربینی اور خوردبینی مشاہدات

کی طرح نہیں ہے جن میں روزانہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے بلکہ وہ انبیاء کے مشاہدات ہیں جن میں لاکھوں برس سے کوئی فرق نہیں ہوا ہے۔" مولانا نے علم کلام اور شریعت اسلامی کی نئی تعبیر پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: "موجودہ دور میں ایک نئے علم کلام کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ اس کا دائرۂ کار کیا ہوگا، میرے نزدیک نئے علم کلام کا کام یہ ہے کہ وہ اسلامی عقائد کی ایک ایسی صاف ستھری تعبیر کرے جس سے انسانی زندگی کے مادی اور روحانی پہلو باہم مربوط نظر آئیں۔ اختلاف اس میں نہیں ہے کہ شریعت میں اجتہاد کی گنجائش ہے بلکہ اختلاف اسکے دائرۂ اختیار اور معاشرہ کی سیاسی و معاشی فلاح کے حدود کے تعین میں ہے۔"

مولانا برہان الدین سنبھلی نے تقلید کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا: "تقلید عام انسانوں کی ایک عملی ضرورت ہے اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ سواد اعظم بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر انسان اکثر حالات میں "تقلید" ہی کی سواری پر اپنی زندگی کا سفر طے کرتا اور منزل سے ہمکنار ہوتا ہے۔" مجتہد ہونے کے لیے جن علوم میں مہارت کی ضرورت ہے انکی فہرست بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "ہر شخص کے بارے میں براہ راست قرآن و سنت سے احکام معلوم کرسکنے کی توقع رکھنا عملاً محال ہے" لیکن اس کے ساتھ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ "بعض اوقات تقلید کے بارے میں غلو سے کام لیا گیا، حد اعتدال سے تجاوز کی بنا پر ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے متعدد علماء تقلید کو ناپسندیدہ بلکہ ناجائز قرار دینے پر مصر ہو گئے۔"

نئے ہندوستان میں اجتہاد کے دائرۂ عمل پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اپنے مقالہ میں فرمایا کہ "اجتہاد کا دائرۂ عمل اسلامی مشن کے سیاق میں متعین کیا جائے تو اسکا مزاج اس اجتہاد سے جس پر آخری زمانے کے علماء نے قناعت کرلی تھی اور اس تجدد سے جس کا مظاہرہ بعض روشن خیال مفکرین کی طرف سے ہوتا رہتا ہے بالکل مختلف ہوگا، صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ اصل اہمیت دعوت کو دیا جائے اسلامی زندگی کو اسکا ذریعہ سمجھا جائے اور اجتہاد کا کام یہ قرار پائے کہ وہ ہندوستان کے موجودہ

حالات میں مسلمانوں کے لیے ایک فعال اور ترقی پذیر زندگی کے ایسے طور طریقے تجویز کرے جو اسلامی اصول زندگی کے زیادہ سے زیادہ آئینہ دار ہوں۔"

جناب انوار علی خاں سوز نے اپنی نئی اصطلاح نو راسخ العقیدگی کی وضاحت اس طرح کی:

"نو راسخ العقیدگی کی اصطلاح میں نے نوفلاطونیت (Neo-Platonism) اور نو کلاسیکیت (Neo-classicism) کی مروجہ اصطلاحوں کی روشنی میں اختیار کی ہے۔ جیسا کہ نو راسخ العقیدگی کی لفظی ساخت ہی سے ظاہر ہے، میری مراد اس سے راسخ العقیدگی ہی ہے۔ مگر ایک نئے انداز کی راسخ العقیدگی۔ نو راسخ العقیدگی وہ نقطۂ نظر ہے جو روایت سے انحراف کے بجائے، روایت کی توسیع کا قائل ہے، جو دینی ورثہ کو کسی قیمت پر دریابرد کرنے کیلئے تیار نہیں ہے لیکن قدامت پسندی کے باوجود مجتہدانہ انداز میں سوچنے کے لیے تیار ہے"۔ آپ نے مزید فرمایا "نو راسخ العقیدگی پورے قرآن کو اللہ کا کلام اور تمام انسانیت کے لیے حجت سمجھتی ہے، مگر ہر مسلمان کو یہ حق بھی دیتی ہے کہ وہ اسے بطور خود اور بقدر استطاعت سمجھنے کی کوشش کرے بلا لحاظ اس کے کہ وہ روایتی معنوں میں عالم ہے یا نہیں"۔

جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریۂ اجتہاد کو شرح وبسط کیساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا: "جدید معاملات ومسائل کے لیے قرآن وسنت، تعامل صحابہ، اجماع امت اور فقہی نظائر وشواہد کی روشنی میں استنباط واستخراج احکام کا سلسلہ برابر جاری رہے گا اور اس طرح شریعت کے ذخیرے میں نشو ونما اور اضافہ ہوتا رہے گا، اور اس سلسلہ میں لوگوں کے سوالات کے تشفی بخش جواب دیے۔"

ڈاکٹر کرسچین ٹرال نے اپنے مقالہ میں سرسید احمد خاں کے مذہبی نقطۂ نظر کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہا: "اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھیں اس بات کا احساس تھا کہ اسلامی علوم اور مذہبی مآخذ کا تنقیدی مطالعہ

کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان مغربی فلسفہ اور جدید سائنس کی طرف سے اپنی نظریں موڑے۔"

مولانا ابو العرفان ندوی نے فرمایا: "جس نظام قانون میں اجماع و قیاس کو استنباط و استخراج کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اسے جامد کس طرح کہا جا سکتا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں جو نئے مسائل سامنے آئیں گے، ان کو ہم قیاس و استحسان، عرف عام اور اجماع امت کے ذریعہ حل کریں گے، یہ کام ماضی میں بڑے پیمانے پر ہوا ہے، اور انفرادی حیثیت سے اب بھی ہو رہا ہے، لیکن اس کام کے لیے علم و صلاحیت کی ضرورت ہے، میرے خیال میں کتاب و سنت کی حدود کے اندر زمانہ کی ضروریات کے مطابق مسائل میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن یہ کوشش تعمیر کے لیے ہونی چاہئے تخریب کے لیے نہیں۔"

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ناظم دار المصنفین نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا کہ اگر تصوف کو کھلے دل سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پھر اس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذریعے ہر زمانہ میں اسلامی طرز فکر کی تشکیل ہوئی ہے، اور آج بھی یہ اسلامی طرز فکر کو متاثر کر سکتا ہے، انھوں نے تصوف کو ایک روحانی ضابطۂ اخلاق قرار دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس روحانی اخلاق کے ذریعہ سے اسلامی طرز فکر کی نئی تشکیل میں آسانی ہو سکتی ہے، اور اگر اسی روحانی اخلاق کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا جائے تو اسلامی اخلاق کا ایک اعلیٰ روحانی فلسفہ بھی مرتب ہو سکتا ہے، انھوں نے اپنے مقالہ میں اقبال کے تصوف پر روشنی ڈالی اور بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ ان کے یہاں مصدر حیات، مقصود حیات اور لامتناہی حیات کے تخیل میں جو صبغۃ اللّٰہی رنگ ہے وہ نٹشے، کانٹ، شوپنہار، جیمس وارڈ اور ولیم جیمس وغیرہ کے ذریعہ سے نہیں آیا بلکہ برابر دم کے صوفیانہ اور عارفانہ خیالات کے مطالعہ سے آیا، آخر میں یہ کہا کہ اگر یہ دانائے راز، ناہید نفس شاعر اور مشرق کو خواب گراں سے بیدار کرنے والا فلسفی صوفیائے کرام کی تعلیمات سے متاثر ہو سکتا ہے تو پھر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اگر موجودہ دور میں کسی میں حضرت ابو الحسن علی ہجویریؒ

کا تفکر، خواجہ معین الدینؒ کا پیام حق، حضرت بختیار کاکیؒ کا حبِ رسول، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی صلاحیتِ دل، شیخ نظام الدین اولیاؒ کا حقوق العباد، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا جذب و سلوک، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ادراک، تقویٰ اور معرفت نفس، سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی تسلیم و رضا، حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا تزکیۂ اخلاق، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دعوت و عزیمت اور خود ڈاکٹر اقبالؒ کے عشق کی نوائے زندگی اور سوز دمبدم جمع ہو جائیں تو اس سے نئے ہندوستان میں اسلامی طرز فکر کی ایسی نئی تشکیل ہو سکتی ہے جس سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ اس ملک کے معاشرتی بلکہ سیاسی زندگی میں بھی ایک نئی روح اور زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔

مولانا سعید احمد پالنپوری نے اپنے مقالہ میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی وجوہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "اب استدلال میں عقلی دلائل کی جگہ محسوسات کو زیادہ پسند کیا جانے لگا ہے، اس لیے تشکیل نو میں ضروری ہے کہ دلائل و براہین کا پیرایۂ بیان بدلا جائے"۔ اسلامی فکر کا اصل سرچشمہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ ہیں، ان میں جو فکر بسیط انداز میں بیان کی گئی ہے اسے علمی اور فنی حیثیت سے سامنے لانا چاہئے، اس میں تعبیر کی حد تک تو تغیر و تبدل گوارا ہو سکتا ہے مگر اس میں ہماری فکر کی دخل اندازی کسی طرح برداشت نہیں کیا سکتی اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جبکہ فہم قرآن و حدیث کے اصول موضوعہ سے صرف نظر نہ کیا جائے۔ اگر کوئی ذیلی اجتہاد ناگزیر ہو تو وہ بھی اسی دائرہ میں رہ کر کیا جائے، ایسا اجتہاد جس سے فکر اسلامی کی ساری گذشتہ بساط ہی الٹ جائے کسی طرح مناسب نہیں ہے، اجتہاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ماضی سے فکری رشتہ کاٹ لیا جائے، تمام مجتہدین امت نے ہمیشہ ماضی سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے، کیونکہ ایسا کرنے ہی سے نئے مجتہدات اصل سرچشمہ سے منسلک ہو سکتے ہیں"۔

ڈاکٹر طاہر محمود نے عرب ممالک کے قوانین میں جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً کی گئی ہیں انھیں اختصار کے ساتھ بیان کیا،

پروفیسر ڈاکٹر مقبول احمد نے روایت اور تجدد کے موضوع پر اپنا مقالہ سنایا جس میں قدیم نقطۂ نظر کے ساتھ غور و فکر کی غرض سے کچھ جدید پہلوؤں کا ذکر بھی کیا، یہ مقالہ دلچسپی سے سنا گیا۔ آخر میں حاضرین کے استفسار پر مقالہ نگار نے مجمل بیانات کی تفصیل پیش کی اور کہا کہ کتاب و سنت اصل بنیاد ہیں، جو کچھ بھی رائے قائم کی جائے گی اور جو مسائل مستنبط کیے جائیں گے ان میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ کتاب و سنت سے انحراف نہ ہو۔

حسن الدین صاحب کے مقالہ کا عنوان حاضرین کو مناسب نہیں معلوم ہوا، مندرجات بھی محل نظر محسوس ہوئے، احادیث کے سلسلہ میں جو کام ابتک ہوا ہے اس سے لوگوں نے انھیں باخبر کیا،

جناب ڈاکٹر رفیق سید شعبۂ سوشل ورک جامعہ نے انگریزی میں اسلام میں فکر کی تشکیل نو پر عمرانی نقطۂ نظر سے ایک جچا تلا مضمون سنایا،

جناب رحمت علی صاحب صدر شعبۂ معاشیات جامعہ کا مقالہ اسلام اور دولت کی منصفانہ تقسیم پر دلچسپی سے سنا گیا،

اختصار کے باعث صرف چند مقالات کے انتخابات ہی دیے جاسکے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اور قدیم طرز کی درسگاہوں کے فارغ التحصیل دونوں طبقوں کے خیالات کی حتی الوسع نمایندگی ہو جائے، ادارہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے جب مفصل رپورٹ چھپے گی تو ناظرین مقالات اور ان پر بحث و مباحثہ کی پوری روداد پڑھ سکیں گے۔

علمی جلسوں کے بعد ۲۹ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو ساڑھے گیارہ بجے دن میں شیخ الجامعہ

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی صدارت میں ایک کاروباری جلسہ ہوا، اس میں انھوں نے مختصر الفاظ میں سمینار کے موضوع کے بارہ میں اپنے خیالات ظاہر کیے اور اس کی کامیابی پر مندوبین اور منتظمین کو مبارکباد دی، اس کے بعد سمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے حسب ذیل تجاویز پیش کیں جو بالاتفاق منظور کی گئیں،

۱۔ صحیح فکرِ اسلامی کی اساس ہر دور میں کتاب و سنت رہی ہے، وہ اسلامی عقائد جن کی ہمارے اسلاف نے قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کی ہے، ہمارا دینی سرمایہ ہیں، آج بھی فکرِ اسلامی کا جو نقشہ مرتب ہوگا وہ کتاب و سنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان ہی خطوط پر ہوگا۔

۲۔ مفکرین اسلام، فقہا، اور مجتہدین نے ہمیشہ زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے، آج بھی مذکورہ اصولوں کی روشنی میں جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنا اور ان کا قابلِ قبول حل ...... تلاش کرنا ہے،

۳۔ یہ عہد علم و فن کی دنیا میں تخصیص کا عہد ہے اور بہت سے نئے علوم وجود میں آگئے ہیں، اور دینی مدارس اور جدید درسگاہوں سے آج ایسے رجالِ کار نہیں نکل رہے ہیں جو بیک وقت قدیم و جدید علوم میں رسوخ رکھتے ہوں، بہتر صورت تو یہ ہوتی کہ دینی مدارس کے احاطوں میں ہی ایسا انتظام ہوتا کہ مختلف دینی و دنیوی علوم کے ماہرین فن پیدا ہوتے لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے، اس لیے سمینار کے شرکاء اس بات پر متفق تھے کہ جب تک علماء اور جدید طرز کی تعلیم پائے ہوئے دانش ور دونوں مل کر فکرِ اسلامی کی تعبیر نو اور ایک جدید علم کلام کی تشکیل و تدوین کا کام ہاتھ میں نہیں لیں گے اس وقت تک اس سلسلہ میں کوئی ایسی پیش رفت ممکن نہ ہو سکے گی جسے اعتبار اور سند حاصل ہو۔

۴۔ سمینار میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ جس طرح جامعہ ملیہ کے اس سمینار میں قدیم اور جدید طرز کے عالموں اور دانشوروں کو تبادلۂ خیال کا موقع ملا ہے اسی طرح دوسرے تعلیمی اداروں میں ایسے مواقع کی صورت نکالی جائے تاکہ دونوں طبقوں میں تبادلۂ خیال بار بار ہوتا رہے، اور عصر حاضر کے مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے میں آسانی ہو۔

۵۔ سمینار میں شریک تمام مندوبین اس بات کے حق میں تھے کہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز دونوں طبقوں کے نمائندہ حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کرے جو مذکورہ مقاصد کے حصول کے لیے ایک پروگرام اور لائحۂ عمل تیار کرے، اس سلسلہ میں یہ بھی طے پایا کہ کمیٹی کام کا جو نقشہ مرتب کرے اس میں سر دست اولیت مندرجہ ذیل امور کو حاصل ہو:۔

(الف) مختلف لوگوں کے داعیوں اور خاص طور سے جدید ذہنوں میں مذہب اور اس کی ضرورت سے متعلق جو سوالات اٹھتے رہتے ہیں ان سے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جائیں اور ان کے جواب جدید علم کلام میں شامل کیے جائیں۔

(ب) علوم عصریہ اور مغربی تہذیب و تمدن کی وہ بنیادیں متعین کی جائیں اور واضح کی جائیں جو اسلامی عقائد، اسلامی تہذیب کے اصولوں اور روح اسلام کے تقاضوں سے متصادم اور متخالف ہیں ان کی تنقیح و تنقید کی جائے اور ان سے متعلق سیر حاصل بحث کر کے کسی قابل قبول نتیجہ تک پہنچا جائے، اس مسئلہ کو بھی جدید علم کلام کا موضوع بنایا جائے۔

(ج) اسلامی عقائد و اعمال میں سے جو مسائل مسلمانوں یا غیر مسلموں میں موضوع بحث بنے ہوئے ہیں مثلاً مسلمانوں کی عائلی زندگی، بنک کاری، اسٹاک ایکسچینج اور مساوات مرد و زن اور حسن و قبح اشیاء کی عقلی و شرعی حیثیت وغیرہ۔ ان سے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں ملک و ملت کی صحیح رہنمائی کی جائے۔

اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سمینار کی تجاویز

از ڈاکٹر انوار الحق حقی، صدر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سمینار کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی اسی انداز کا ایک سمینار ہوا، جس کا افتتاح مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کیا، اس کی پوری روداد تو معارف کیلئے ابھی تک موصول نہیں ہوئی ہے، لیکن معلوم ہوا کہ جناب انوار الحق حقی صاحب، صدر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی اور ان کے شرکائے کار کی خوش انتظامی کی بدولت یہ سمینار بہت کامیاب رہا، یہ راقم اپنی علالت کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکا، جس کا بڑا افسوس ہے۔ اس سمینار میں جو تجاویز منظور ہوئی ہیں وہ جناب حقی صاحب نے یہاں بھیجی ہیں، ناظرین معارف کیلئے ذیل میں درج کیجاتی ہیں۔ "ص ع"

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے ایم، اے، او کالج کی صد سالہ تقریبات کے دوران "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" کے موضوع پر ۲۲ جنوری تا ۲۵ جنوری ۱۹۷۳ء ایک سمینار منعقد ہوا، اس سمینار میں علماء، مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے حصہ لیا، جن میں علی گڑھ کے وائس چانسلر جناب علی محمد خسرو صاحب کے علاوہ محترم جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب، جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب، جناب بدرالدین طیب جی صاحب اور جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب بھی شامل ہیں، سمینار کے مباحثوں میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، جامعۃ الرشاد، جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، وشوا بھارتی یونیورسٹی، مرٹھواڑ یونیورسٹی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، کلکتہ یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اور خود مسلم یونیورسٹی کے نمایندے شریک رہے۔

سمینار میں مذہب، قانون، سیاست، معیشت اور تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر جدید حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی تعلیمات سے متعلق چالیس سے زائد مقالے پیش کیے گئے اور ان مباحث پر تفصیلی مذاکرہ رہا، اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ دنیا کے تغیرات کے تفصیلی جائزے اور تجزیے کا عمل جاری رہنا چاہیے، اور تغیر کے مطالعے کے ساتھ یہ بھی تحقیق ہونا چاہیے کہ انسانی زندگی میں کون سے عناصر کو ثبات حاصل ہے، زندگی ثبات و تغیر دونوں سے عبارت ہے، اور فکر و عمل میں دونوں ہی کی رعایت ملحوظ رکھنا ضروری ہے، زندگی کا متوازن لائحۂ عمل وہی ہے جو تغیرات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ فطرت کے پائیدار عناصر اور زندگی کے دائمی تقاضوں کو بھی پورا کرتا رہے،

ربانی ضابطۂ ہدایت میں ثبات و تغیر دونوں کی مناسبت سے ایک طرف کچھ منصوص اور ناقابل ترمیم احکام دیے گئے ہیں تو دوسری طرف تمدنی زندگی کے متعلق اصولی ہدایات دی گئی ہیں، جنھیں بدلتی ہوئی دنیا میں نئی تعبیر و تطبیق کے ذریعے نئے مسائل کے حل کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے،

مباحثے کے بعد مندوبین سمینار جن نتائج پر پہنچے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلامی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ پیش آنے والے مسائل کے بارے میں اجتہاد کے ذریعے اسلامی ہدایات سے اخذ و استنباط کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے، پچھلے

سنوسال میں مختلف عوامل کی بنا پر عمل اجتہاد میں ایک نئی زندگی نمایاں ہے،

(۲) اسلام کے اصول اجتہاد اس بات کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں کہ جدید مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہوسکیں۔

(۳) اسلام نے سیاست و حکمرانی کے لیے جو اصولی ہدایات دی ہیں انھیں آج بھی ہمارا رہنما ہونا چاہیے، قانون الٰہی کی برتری، باہمی مشورے کے ذریعہ فیصلہ، آزادی ضمیر وغیرہ ایسے اسلامی اصول ہیں جنھیں نئے حالات میں نئے طریقوں سے زیر عمل لانا چاہیے۔

(۴) اسلام عدل کے ساتھ ترقی کے قومی محرکات فراہم کرتا ہے۔ اور اس میں عوام کی فعّال شرکت کا ضامن ہے۔

(۵) معاشی ترقی کی اسلامی راہ کا تقاضا ہے کہ مسلمان اقوام بیش از بیش باہمی تعاون کا طریقہ اختیار کریں اور ان ممالک کو بھی اس عمل میں شریک کریں جو شمالی افریقہ، مغربی ایشیا، جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں ان کے پڑوسی ہیں،

(۶) ماضی قریب کی مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کے فیض سے اب عالم اسلام میں ایک عام فکری بیداری پیدا ہو چلی ہے، متعدد اسلامی تحریکات اور اسلامی ادب کے جدید رجحانات ایک خوش آیند مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔

(۷) مغربی علوم و افکار نے جہاں بعض ناپسندیدہ نقوش علم و ثقافت کی دنیا پر مرتسم کیے ہیں وہیں علم و تحقیق کی بعض نئی راہوں کی طرف اشارے بھی کیے، انکے صالح اثرات کو جذب کرنا اور غیر صالح اثرات پر نقد و نظر کا عمل کرنا حکمت دینی کا تقاضا ہے، ہر حکمت کی بات ملت اسلام ہی کی متاع گمشدہ ہے۔

(۸) ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ حالت اور ضروریات کے پیش نظر اوقاف

کی اصلاح و ترقی کے لیے اور انھیں مفید تر بنانے کے واسطے سنجیدہ کوشش کی ضرورت ہے۔

مزید برآں مندوبین نے ذیل کے عملی اقدامات پر بھی اتفاق رائے کیا:۔

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اصلاح و ترقی اور تعلیمی مسائل پر اجتماعی طور سے غور کر کے عملی تجاویز مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کیجائے۔

(۲) جہاں تک ممکن ہو دینی درسگاہوں کے نصاب میں جدید علوم و افکار کو بھی مناسب جگہ دی جائے، اور اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ جدید علوم کے و افکار متعلقہ امور میں دینی رہنمائی اور اسلامی علوم سے بہرہ ور ہو سکیں، اس سلسلے میں مرکزی اہمیت رکھنے والی درسگاہوں سے مزدوری تعاون حاصل کیا جائے۔

(۳) جدید تمدن اور معیشت کے پیدا کردہ مسائل مثلاً انشورنس، حکومتی قرضے اور بنکنگ پر اسلامی تعلیمات اور موجودہ حقائق کی روشنی میں خصوصی طور سے غور و فکر کیا جائے، اور رہنمائی فراہم کی جائے۔

(۴) اس سیمینار سے حاصل ہونے والے فوائد کے بپیش نظر اس کی کوشش کی جائے کہ آیندہ بھی مختلف اداروں کی جانب سے ایسی مجالس مذاکرہ کا اہتمام کیا جاتا رہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، اٹھارہ[۱۸] ابواب میں نظریۂ خلافت، مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی، حقوق رعایا، بیت المال، احتساب، حرب دفاع، خارجی معاملات وغیرہ قریب قریب اسلامی دستور کے تمام اصول اور اساسی پہلو آگئے ہیں، آخری باب میں موجودہ سیاسی نظریات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

مؤلفہ مولنا محمد اسحٰق سندیلوی۔ ضخامت ۳۰۰ صفحے۔ قیمت للعہ[۹] پیسے - منیجر

مطبوعاتِ جدیدہ

بجھتے چراغ:۔ مرتبہ جناب محمد اکبرالدین صدیقی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۸۶۔ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۶/۵۰ پتہ: چار کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲ آندھرا پردیش۔

اردو کی خدمت و ترقی میں دکن کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، ڈاکٹر زور، مولوی نصیرالدین ہاشمی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم دکن کے خدمات ادب پر بڑا کام کر چکے ہیں جناب اکبرالدین صدیقی کا تعلق بھی اسی خطہ سے ہے اسلئے وقتاً فوقتاً وہ مختلف رسالوں میں دکنی ادب پر مضامین لکھتے رہے ہیں، اب انھوں نے اس قسم کے تیئیس ۲۳ مضامین کا یہ مجموعہ کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اکثر مضامین میں دکن کے قدیم شعرا، خواجہ بندہ نواز، برہان الدین جانم، نصرتی، وجہی، حاتمی اور طبعی وغیرہ کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام پر بحث اور ان کی غزل گوئی، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی نگاری پر تبصرہ کیا گیا ہے، چند مضامین میں بعض امرائے دکن کی علم نوازی، اہل بیجاپور کی ادبی اور خواجہ بندہ نواز کے سلسلہ کے بزرگوں کی علمی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک مضمون میں لچھمی نارائن شفیق کے ایک نادر و کمیاب "تذکرہ شام غریباں" کا تعارف ہے اور ایک مضمون بیجاپور کی امین درگاہ کے کتبہ کے متعلق ہے، یہ سب مضامین تلاش و محنت سے لکھے گئے ہیں، اور ان سے دکن کے قدیم ادبی و علمی کارناموں کے بعض پہلو سامنے آتے ہیں، اس حیثیت سے یہ دکنی ادب پر ایک اچھی کتاب ہے، مصنف اردو کے کہنہ مشق اہل قلم ہونے کے علاوہ متعدد کتابوں کے

مصنف اور ماہنامہ سب رس کے اڈیٹر بھی ہیں، مگر اس کے باوجود انھوں نے زبان وبیان کی صحت کا خیال نہیں رکھا، مثلاً اس کی توضیح وتشریح اس تعلیمات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے (ص ۲۴) اور چونکہ حضرت جانم کی عمر اس وقت اٹھارہ تا بیس سال ہو تو آپ کی پیدائش کا سنہ ۹۵۴ھ تا ۹۵۶ھ ہوگا" (ص ۳۰) جس سے ۹۹۰ھ مستخرج ہوتے ہیں (ص ۳۷) وہاں زیارت کی کسی مرد آدمی کو اجازت نہیں ہے (ص ۳۸) حضرت برہان الدین نے..... حضرت امین الدین اعلیٰ کی تعلیم وتربیت اور اتالیقی انھیں کے تفویض کی تھی (۴۰) ڈاکٹر حفیظ سید مرحوم نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے رسالے میں شائع کر رہا ہے (ص ۵۵) اپنے والد کے وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے (ص ۶۲) میں ایسی زمین خریدنا چاہتا ہوں جو اکل حلال سے خریدی ہوئی ہے (ص ۸۲) جو چیزیں آپ نے رکھ چھوڑی ہیں اس میں کیا اسرار ہے (ص ۸۵) اس کا اردو کلیات ابھی تک بھی دستیاب نہ ہو سکا (ص ۱۰۰) حضرت نے بھنگ کی بجائے پانی یا شربت کا پیالہ عنایت کیا (ص ۱۱۳) خالص فارسی الفاظ کی بجائے (ص ۱۱۳) جو مخطوطے کتب خانوں میں دستیاب ہوتے ہیں وہ تحریف وتصرف کے اندیشے سے خالی نہیں ہیں (ص ۱۳۱) مزید تین مراثی الامی اعلیٰ اور غلامی کے مرثیے بھی پیش ہیں (ص ۲۰۰) امیدی کا یہ قصہ اچھی اور طبع زاد ہے (ص ۲۱۳) بحری کی چار غزلوں کی تضمین کی ہے (ص ۲۲۷) یہ غزل یہاں کے کتبخانوں میں بیاضوں میں بھی موجود ہے (ص ۱۳۲) اپنے مریدوں کو تعلیم وتدریس کیلئے فارسی کیسا تھ ساتھ اس زبان کو اپنایا (ص ۲۳۵) جس کے تین مثنویاں ملتی ہیں (ص ۲۴۲) وجدی کے مثنویاں (ص ۵۱) اپنے دربار میں متعین کر لیا (ص ۲۵۲) شفیق کے اجداد کا تعلق لاہور سے تھا وہ اورنگزیب عالمگیر کے ہمراہ دکن آئے (ص ۲۷) مشائخ وعمائد جمع ہیں مگر مصنف نے مشائخوں، مشائخین اور عمائدین لکھا ہے، اور مشائخ کو واحد استعمال کیا ہے، جیسے "یہاں کے ایک مشائخ" (ص ۱۵۹) لکھتے ہیں "یہ مثنوی چھپ چکی ہے، ڈاکٹر زور مرحوم نے اسکو مرتب کیا تھا ابھی منظر عام پر نہ آسکی" (ص ۲۰۲) چھپنے کے باوجود منظر عام پر نہ آنے کا کیا مطلب ہے۔ وہ لکھتے ہیں "سال کے ۳۶۰ دن کے مطابق" (ص ۲۱۵) قمری سال ۳۵۵ اور شمسی سال ۳۶۵ یا ۳۶۶ دن کا ہوتا ہے۔ انکے علاوہ بھی غلطیاں ہیں، ممکن ہے کچھ کتابت وطباعت کی بھی ہوں۔ قیمت بھی زیادہ ہے۔

(ع م)

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے
مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات
تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے،

یین جلد دوم قیمت: ۹-۱۳

صحابہ جلد ۶ " ۴-۹

یین کے حالات زندگی کے ضمن میں

ٔ معرکہ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

لصحابہ جلد ۷،

بیین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۵۰-۱۲

اسلام اول (عہد رسالت و خلافت راشدہ)

قیمت: ۵۰-۱۲

اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰-۱۱

اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول)

قیمت: ۰-۱۴

اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)

قیمت: ۰۰-۱۵

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت ۹۵-۱۵

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دین رحمت قیمت: ۰۰-۱۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۷۵-۴

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی علمی تعلیمی قومی ملی سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلاویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا مثنی، دلکش، دلچسپ قابل مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۵۰-۲۷

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰	مارچ سنہ ۱۹۶۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ۔ عبد السّلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۱۹ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۷ء عدد ۳

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

شذرات

گذشتہ دسمبر اور جنوری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دو بہت اچھے سمینار ہوئے، دونوں کے یہاں کے مباحث کی نوعیت یکساں تھی، جامعہ اسلامیہ میں "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" پر بحث تھی، مسلم یونیورسٹی میں موضوع "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" تھا، ان دونوں مذاکرات کا خوش آیند پہلو یہ تھا کہ ان میں قدیم خیالات کے علما اور جدید رنگ کے ارباب علم کی خاطر خواہ نمایندگی تھی،

ایسی مجلسوں میں علماء پر ذمہ داری زیادہ عائد ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اپنے نبی کے وارث، اسلام کے محافظ اور پشتیبان سمجھے جاتے ہیں، ان میں انکی شرکت محض نمایندگی کی خاطر نہیں بلکہ جہاد لسان اور جہاد تحریر کے جذبے میں ہونی چاہئے، آجکل جدید طبقہ مذہبی معاملات میں ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے، اس کو وہ محض بے راہ روی اور گمرہی کہکر ٹال نہیں سکتے، انکی باتیں اب محض اسلیے نہیں قبول کیجا سکتی ہیں کہ وہ کسی مذہبی مدرسہ کے سند یافتہ عالم یا فقیہ یا محدث ہیں، جدید طبقہ اپنے شکوک و اوہام کا مریض ضرور ہے، مگر وہ اپنی عقل کو اپنی گرفت میں رکھکر عقلیاتی اور منطقیانہ انداز میں ہر چیز کو سمجھنا اور پرکھنا چاہتا ہے، علما کو ان ہی کے انداز میں ان کی ذہنی الجھنوں کے زہر کا تریاق پیش کرنا ہے،

علما، محراب و منبر کی زینت ضرور بنے رہیں، مگر گرتے ہوئے کو سنبھالنے، بگڑے ہوئے کو سنوارنے اور بھٹکتے ہوئے کو راہ راست پر لانے کی دعوت کو بھی لیکر آگے بڑھیں، انکی دعوت میں عزیمت ہو، اور عزیمت میں دلجوئی اور دلنوازی ہو، واعظانہ تبلیغ، تہدید کے بجائے روادارانہ افہام و تفہیم کے ساتھ مصلحانہ انداز تخاطب ہو،

ع : کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے

ہمارے علما پر یہ اعتراض برابر ہوتا رہا ہے کہ کسی مسئلہ پر ان کا متحد ہونا آسان نہیں، خود حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان پر یہی اعتراض کیا ہے، جہانگیر جب تخت پر بیٹھا تو اکبر کے دین الٰہی کے فتنہ کے سد باب

کے لیے اس سے حکومت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کو کہا گیا، اس نے حکم دیا کہ چار دیندار عالم منتخب کیے جائیں تاکہ انکے مشورے سے ملکی نظم ونسق قائم کیا جائے، اسکی اطلاع حضرت مجدد الف ثانی کو دی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ چار کے بجائے ایک ہی عالم کا انتخاب کیا جائے تو بہتر ہے ورنہ ان میں اپنی بڑائی جتانے کی کوشش میں اختلاف پیدا ہوگا، موجودہ دور کے علما کو اپنے مقصد میں اتحاد اور یکجہتی پیدا کرکے اس دیرینہ اعتراض کو بھی دور کرنا ہے،

ایسے سیمنار میں ایسے ارباب علم بھی جمع ہوتے ہیں جو ملک یا بیرونی ملک کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور موجودہ اصطلاح میں دانشور کہلاتے ہیں، ان میں بعض مقالہ نگار اور مقرر اپنے خیالات مسائل حاضرہ کو سامنے رکھکر نظر کی وہ بینی فکر کی گہرائی اور بصیرت کی مآل اندیشی کے ساتھ پیش کرتے ہیں، ان کی تحریروں اور باتوں میں مذہبی درد و اخلاص بھی ہوتا ہے، انکو قدیم خیال کے علما محض اسلیے نظر انداز کر دیں کہ وہ سند یافتہ عالم نہیں ہیں تو یہ مناسب نہیں، مگر ان ہی میں کچھ ایسے دانشور بھی ہوتے ہیں، جن کے خیالات سنکر یہ شک ہونے لگتا ہے کہ ان میں واقعی اسلام کا درد ہے یا محض اپنی برق طبعی اور شعلہ مقالی کا ثبوت دے رہے ہیں، یا کسی سیاسی مصالح یا کسی ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر یا مستشرقین کی تلبیسات سے مرعوب ہوکر اظہار خیال کر رہے ہیں، یہ شک اور بھی بڑھ جاتا ہے جب اسی مجلس میں کسی نہ کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اسلامی شعار اور طرز فکر کے پابند نہیں،

ایسے اجتماع میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب نماز کے لیے وقفہ کیا جاتا ہے تو کچھ دانشور نماز پڑھنے کے بجائے سگار اور سگریٹ کے دھوؤں میں اپنی اسلامی فکر کے ذہنی عقاب کو اڑتے ہوئے دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں، اگر کوئی ان سے یہ سوال کر بیٹھے کہ تارک صوم وصلوٰۃ کو ایسے سیمنار میں شریک ہونے کا حق نہیں تو کیا یہ ضمیر کی آزادی اور نجی معاملات میں مداخلت پر محمول کیا جائے گا؟

ڈاکٹر اقبال تقریباً ساٹھ سال پہلے توحید ری اور دولت عثمانی کو یاد کرکے اپنے زمانے کے ذوق کی تن آسانی، انداز مسلمانی اور اسلاف کی نسبت روحانی سے محرومی پر بہت ہی مضطرب ہوکر خداوند تعالیٰ کی طرف سے کہہ اٹھے تھے، ؎

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہوکر — اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

اس کا مخاطب کون ہے؟ مسلمانوں کے عوام یا ان کے خواص یا ان کے علماء یا ان کے دانشور؟

مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عزت حاملِ قرآن ہی ہوکر حاصل کرسکتے ہیں، جو کچھ مشکل نہیں لیکن ایسا سمجھا جاتا ہے، اگر یہ آسان نہیں تو کم از کم ان مسائل کا حل تو نکالا جاسکتا ہے، جو زمانہ کے بدلے ہوئے حالات میں متنازعہ فیہ بن گئے ہیں، یہ حل اچھے علماء اور اچھے دانشوروں ہی کے اجماع سے نکل سکتا ہے، مگر ہندوستان میں اجماع کی مثال بہت ہی کم ملتی ہے، علماء اپنے اپنے طور پر فتاویٰ دیتے رہے ہیں، ان میں اختلاف رائے بھی ہوتا ہے، جس سے عام مسلمان بعض مسائل کو متفقہ طور پر جائز یا ناجائز سمجھنے سے بالکل ہی قاصر رہتے ہیں اور وہ اپنے کو زمانہ کے ساتھ بہنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، پھر ان کو یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ وہ اسلام کو نہیں چھوڑ رہے ہیں بلکہ اسلام ان کو چھوڑ رہا ہے، مسلمانوں کو اسی ذہنی انتشار سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

وہ زبانِ حال سے سوال کررہے ہیں کہ کیا اسلام کے نزدیک مسائلِ فقہ میں کسی اصلاح اور تغیر کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا اجتہاد کا دروازہ بالکل ہی بند ہوچکا ہے؟ اگر کسی مجتہد نے اپنے زمانہ کے رواج کے مطابق اجتہاد کیا تھا تو بدلے ہوئے حالات میں اس مجتہد سے اختلاف کرنا صحیح نہیں؟ رواج زمانہ کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اگر کوئی نیا رواج پیدا ہوجائے تو زمانہ کے علماء کا اس کے موافق فتویٰ دینا جائز ہے یا نہیں؟ گذشتہ دور کے مجتہد اگر موجودہ زمانہ میں ہوتے تو کیا وہی سب کچھ کہتے جو اپنے زمانہ میں کہہ چکے تھے؟ ظاہر مذہب پر حکم دیتے یا رواج کو چھوڑ دیتے؟ اگر احکام زمانہ کے اختلاف سے بدل سکتے ہیں، تو اس کی کیا حد ہو؟

نئے مسائل پہلے بھی پیدا ہوتے رہے، ان کا حل بھی نکالا جاتا رہا، مولانا شبلیؒ نے علامہ شامیؒ کے رسالہ نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف کے حوالے سے لکھا ہے کہ عام رواج کی بنا پر کلیات کا حکم خاص کردیا جاتا ہے، سوال یہ نہیں کہ علامہ شامیؒ اور مولانا شبلیؒ نے اپنے زمانہ میں کیا کہا سوال یہ ہے کہ اب کیا ہونا چاہئے؟ اس کے لیے اچھے علماء اور اچھے دانشوروں کے اجماع کی سخت ضرورت ہے، جو اگر نہیں کیا گیا تو یہ ایک بڑی ملی کوتاہی اور غفلت پر محمول کیا جائے گا۔

مقالات

اسلام میں مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی، ان پر دو آدمیوں کے قتل کا خونبہا واجب الادا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مطالبہ کے لیے ان کے پاس تشریف لے گئے تو ایک یہودی نے ایک کوٹھے پر سے پتھر لڑھکا کر آپ کو شہید کرنے کی کوشش کی، مگر آپ کو اس کی خبر ہوئی تو بچ کر لوٹ آئے، چند دنوں کے بعد یہودیوں میں سے بنی قریظہ نے گذشتہ معاہدہ کی تجدید کر لی، بنو نضیر سے بھی اس کی تجدید کرنے کو کہا گیا تو وہ راضی نہیں ہوئے بلکہ اس کے بجائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر تشریف لائیں، وہ بھی تین عالم ساتھ لائیں گے، اگر ان کے عالم آپ پر ایمان لے آئے تو وہ بھی آپ پر ایمان لے آئیں گے، آپ نے منظور فرما لیا، لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ انھوں نے اس بہانہ سے شہید کرنے کیلیے بلایا ہے، ان کی اس سرکشی سے مجبور ہو کر آپ نے ان کا محاصرہ کیا، پندرہ دن کے بعد انھوں نے صلح کر لی، اور اپنے مال و متاع کے ساتھ خیبر منتقل ہو جانے کے طلبگار ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دیدی، اور پھر جس طرح

وہ مدینہ سے رخصت کئے گئے ہیں اس کی تصویر مولانا شبلی نے اس طرح کھینچی ہے:

بنو نضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں، عروۃ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا، وہ بھی ساتھ ساتھ تھی، اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سروسامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گذری تھی۔

ہتھیاروں کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا اس میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں، ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنھوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا اور یہودی ان کو اتحاد مذہب کی وجہ سے ساتھ لیے جاتے تھے، انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری لا اکراہ فی الدین (بقرہ - ۲۵۶) یعنی مذہب میں زبردستی نہیں۔

(ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام۔ سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۷۹)

دشمنوں سے یہ رواداری کی مثال کسی اور قوم کی تاریخ میں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملے گی، یہودیوں کی کتاب توریت میں لڑنے والے دشمنوں کے متعلق یہ حکم ہے کہ وہ سب کے سب قتل کر دیے جائیں، ان کی عورتیں اور بچے گرفتار کر لیے جائیں اور ان کا سارا سامان مال غنیمت سمجھا جائے۔

یہودیوں کی شرانگیزی جاری رہی، بنی قریظہ سے معاہدہ کی تجدید ہوگئی تھی مگر وہ بھی نچنت نہیں بیٹھے، بنی نضیر نے ان کو توڑ لیا جس کے بعد بنی نضیر، بنی قریظہ، قریش اور دوسرے قبیلوں نے مل کر چوبیس ہزار کی فوج تیار کی اور مدینہ پر چڑھائی کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے گرد خندق کھود کر ان کا مقابلہ کیا، اسی لیے یہ جنگ احزاب یا غزوۂ خندق کے نام سے موسوم ہوئی، ایک مہینہ تک یہ محاصرہ جاری رہا، کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا تو مسلمانوں

پر کئی فاقے گذر گئے، ایک دن صحابہ نے بے تاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہوئے ہیں، آپ نے اپنا شکم مبارک کھول کر دکھایا تو اس پر ایک کے بجائے دو پتھر بندھے ہوئے تھے، اسی حالت میں صحابۂ کرام دشمنوں کا مقابلہ بڑی بہادری اور جرأت سے کرتے رہے، یہاں تک کہ دشمنوں نے خود سامانِ رسد کی کمی، موسم کی ناخوشگواری اور یہودیوں کی بے وفائی سے عاجز ہو کر میدان چھوڑ دیا، بنی قریظہ جنگ سے واپس ہونے لگے تو مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن حیّی بن اخطب کو اپنے یہاں لیتے گئے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بڑھے تو وہ عہد شکنی پر نادم کیا ہوتے الٹے آپ کو گالیاں دینی شروع کیں، جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا اور جب انھوں نے سپر ڈالدی تو ان کی سرکشی اور بدعہدی کی سزا ان کو توریت کے حکم کے مطابق دی گئی۔ توراۃ کتاب تثنیہ ۱۰ اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے :۔

> "جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھکو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے، باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لیے مال غنیمت ہوں گی"

یہودیوں کی اسلام دشمنی کا مرکز خیبر میں منتقل ہو گیا، جو مدینہ منورہ سے دو سو میل پر واقع ہے، یہاں ان کے چھوٹے بڑے قلعے سالم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق اور مربطہ تھے، ان پر یہودیوں کو بڑا غرور تھا، اسی لیے خیبر کو بڑا مرکز بنا کر اسلام کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا، بنی نضیر یہاں جلاوطن ہو کر آئے تو یہاں کے یہودیوں سے مل کر تمام عرب میں اسلام کے خلاف بغاوت

برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، مکہ جا کر قریش کو ابھارا، جنگ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف مدد پہنچائی، احزاب میں اسلام کے دشمنوں کو شکست ہوئی، تو مدینہ پر حملہ کرنے کی سازش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دلآزاری کے لیے آپ کی چراگاہ سے اونٹنیاں چرا کر لے گئے ان کو روکنے میں ایک جھڑپ ہوئی تو حضرت ابوذرؓ کے صاحبزادے کا قتل ہوگیا انکی بیوی یہودیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عفو و درگذر سے کام لیتے رہے لیکن ان کی سازشیں خطرناک ہوتی چلی گئیں تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا، خیبر کی جنگ میں حضرت علیؓ نے جو بہادری، جرأت اور پامردی دکھائی وہ اسلام کی تاریخ کا ایک بڑا روشن باب ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لڑائی کا علم دینے لگے تو انھوں نے عرض کیا کہ کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنالیں، ارشاد ہوا، نرمی سے ان کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمھاری ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ (صحیح بخاری، سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۶۴)

حضرت علیؓ کی جانبازی سے خیبر فتح ہوا تو مسلمانوں نے وہاں کی زمینوں پر قبضہ کرلیا، یہودیوں نے درخواست کی کہ زمینیں ان کے قبضہ میں رہنے دی جائیں، وہ پیداوار کا نصف حصہ ادا کیا کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی التجا کو منظور کیا، بٹائی کا وقت آیا تو غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا اور یہودیوں سے کہا گیا کہ ان میں سے جو حصہ چاہیں وہ لے لیں، یہود اس عدل پر متاثر ہوکر بول اٹھے کہ زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۲۷، طبری جلد ۳ ص ۸۹۔ سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۸۳ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی جلد اول ص ۶۵)

اس جنگ میں رئیس خیبر کی لڑکی صفیہ گرفتار ہوئیں تو ایک صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ کے

حصہ میں پڑیں، لیکن لوگوں نے اعتراض کیا کہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ کسی اور کے حصہ میں نہیں جا سکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی اس کا اہل نہیں، اس اعتراض پر آپ نے صفیہ کو پہلے آزاد کیا، پھر اپنے عقد میں لے لیا، آپ نے اس خاتون کے رتبہ کے لحاظ سے اپنی کنیز بنانا پسند نہیں فرمایا، (مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپ نے ان کو اختیار دیا کہ آزاد ہو کر اپنے یہاں چلی جائیں یا نکاح میں آنا قبول کریں، انھوں نے دوسری صورت پسند کی اور آپ کے نکاح میں آگئیں، اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شبلی نے تحریر فرمایا ہے

> یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر ہو گیا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلہ نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کیے جا چکے تھے، اس حالت میں ان کے پاس خاطر، حفظ مراتب اور دفع غم کیلئے اسکے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت صلعم انکو اپنے عقد میں لے لیں وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں لیکن آنحضرت صلعم نے انکی خاندانی عزت کے لحاظ سے اُن کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھا، حسن خلق رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ سازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی، اس قسم کے طرز عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے (سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۹۲)

جان، عزت، آبرو اور مذہب کے دشمنوں کے یہاں رشتہ قائم کرنا خطرے سے خالی نہ تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے قلوب کی تسخیر کی خاطر یہ رواداری اور فراخدلی دکھائی، رسول اللہؐ کو حضرت صفیہؓ سے بڑی محبت رہی، نکاح کے بعد ان کو اپنے اونٹ پر سوار کیا اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا، برابر ان کی دلجوئی فرماتے تھے، ایک بار آپ سفر میں تھے کہ حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہو گیا، آپ کی ازواج مطہرات میں سے حضرت زینبؓ کے پاس ضرورت

سے زیادہ اونٹ تھے، آپ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہ کو دیدو، حضرت زینبؓ بول اٹھیں
کہ کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر ناراض ہوئے
کہ دو مہینے تک ان کے پاس نہ گئے، ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہؓ کے
پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں، ان کے رونے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ
عائشہؓ اور زینبؓ کہتی ہیں کہ وہ آپ کی چچازاد بہن بھی ہیں اس لیے وہ تمام ازواج میں افضل
ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے یہ کیوں نہ کہدیا کہ ہارونؑ میرے باپ، موسیٰؑ میرے چچا اور
محمدؐ میرے شوہر ہیں، اس لیے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہو سکتی ہو (سیرۃ النبی جلد ۲ ص ۴۰۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کے یہودیوں کے جان و مال، امن و اماں کے ضامن ہوئے
مگر وہ اپنی شر انگیزیوں سے باز نہیں آئے، ایک دن ایک یہودی عورت زینب نے چند صحابہ
کے ساتھ آپ کی دعوت کی، وہ یہودیوں کے سردار مرحب کی بھاوج تھی، جو حضرت علیؓ کے
ہاتھوں خیبر کی لڑائی میں ہلاک ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط کرم میں زینب کی دعوت
قبول فرمائی، زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپ نے کھانا بہت کم نوش فرمایا، مگر ایک صحابی
بشر بن براءؓ یہ کھانا کھا کر زہر کے اثر سے وفات پا گئے، رسول اللہ صلعم نے زینب کو بلا کر پوچھا
تو اس نے اپنے جرم کا اقبال کیا، یہودیوں نے بھی اقرار کیا کہ ہم نے اس لیے زہر دیا کہ اگر
آپ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا، اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپ سے نجات مل جائے گی
رسول اللہ صلعم نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا لیکن بشر بن براءؓ کی وفات پر
زینب قصاص میں قتل کر دی گئی، (سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۹۳)

ایک دفعہ دو صحابی خیبر گئے، یہودیوں نے ان میں سے ایک صحابی عبداللہؓ کو قتل کر کے
نہر میں ڈالدیا، دوسرے صحابی محیصہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی تو

آپ نے ان سے پوچھا کہ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے عبداللہ کو قتل کیا، محیصہ نے عرض کیا کہ یہودی تو پچاس مسلمانوں کو قتل کر کے جھوٹی قسمیں کھا لیں گے، رسول اللہؐ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے، اس لیے یہودیوں سے تعرض نہیں کیا، اور بیت المال سے مقتول کا خونبہا دلایا (سیرۃ النبی جلد اول ص ۹۳ ـ ۴۹۲)

قرآن مجید میں یہودیوں کی بدطینتی اور بدکرداری کے متعلق جو کچھ کہا گیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عملی زندگی میں اس کا عملی ثبوت ملتا رہا، مگر آپ کا دل یہودیوں کے برے برتاؤ کے باوجود سخت ہونے کے بجائے نرم رہا، آپ نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ بھی دیا، حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، تو آپ نے اس میں کوئی مزاحمت نہیں فرمائی، (سیرۃ النبی جلد ۶ ص ۲۴۱)

آپ نے ہمسایہ کا حق ادا کرنے کی جو تلقین کی اس میں یہودی اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں رکھی، اور آپ کی اس تعلیم پر صحابۂ کرام برابر عمل کرتے رہے حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبرئیل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے تھے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حق دار بنا دیں گے۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب فی حق الجوار، سیرۃ النبی جلد ۶ ص ۲۸۶)

ایک دفعہ ایک یہودی نے بر سر بازار کہا قسم اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو تمام انبیا پر فضیلت دی، ایک صحابی نے یہ سنکر پوچھا "محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی" اس نے کہا "ان پر بھی" صحابی نے غصہ میں اس کو ایک تھپڑ مار دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

عدل و انصاف کی شہرت تھی، وہ یہودی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور صحابی کی شکایت کی، آپ نے صحابی پر برہمی ظاہر فرمائی (صحیح بخاری سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۰)

ایک دفعہ چند یہودی آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تجھ پر موت) کہا، حضرت عائشہؓ موجود تھیں، انھوں نے جواب میں کہا، وعلیکم السام واللعنۃ یعنی تم پر موت آئے اور تم پر لعنت ہو، آپ نے ان کو روک کر فرمایا عائشہ! بدزبان نہ بنو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے، (صحیح مسلم کتاب الادب ج ۲ ص ۲۳۹ سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۰۱) تاریخ اخلاق اسلامی از مولانا عبد السلام ندوی ص ۱۸۸)

ایک بار آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، تو ایک یہودی کا جنازہ گذرا، اس کو دیکھ کر آپ کھڑے ہو گئے (صحیح بخاری کتاب الجنائز، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۰۱)

آپ یہودیوں سے لین دین کرنے میں تامل بھی نہ فرماتے، گو وہ آپ سے سختی اور گستاخی سے پیش آتے رہے، زید بن سعنہ جب یہودی تھے، تو ایک بار آپ نے ان سے قرض لیا، ابھی قرض کی واپسی کی میعاد بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ تقاضے کے لئے آگئے، آپ کی چادر پکڑ کر سخت سست کہا، حضرت عمرؓ موجود تھے، انھوں نے کہا او دشمن خدا، رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا، عمر! تم سے کچھ اور امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں قرض ادا کر دوں، اس کے بعد یہودی کا قرض ادا کر کے بیس صاع کھجور اور زیادہ دیے (سیرۃ النبی جلد ۲ ص ۳۵۸ بحوالہ بیہقی، ابن حبان، طبرانی و ابو نعیم)

ایک دفعہ ایک یہودی سے ایک جوڑا کپڑا قرض منگوا بھیجا، اس گستاخ نے کہلا بھیجا کہ وہ میرا مال یونہی اڑا لینا چاہتے ہیں، یہ سنکر رسول اللہ نے صرف اتنا فرمایا، وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں (جامع ترمذی کتاب البیوع، سیرۃ النبی ج ۲ ص ۳۵۸)

رسول اکرمؐ نے اپنے ابتدائی دور میں صحابۂ کرام کو یہود ونصاریٰ سے روایت کرنے اور ان کی کتابوں کے دیکھنے کی ممانعت فرمائی تھی، مگر بعد میں جب التباس واختلاط کا خوف جاتا رہا تو ان سے روایت کرنے کی اجازت دیدی، اور خود ان کی کتابوں کے واقعات بیان فرماتے (بخاری باب ماذکر عن بنی اسرائیل مع فتح الباری وتاریخ اخلاق اسلامی از مولانا عبدالسلام ندوی ص ۲۳۵ - ۲۳۲)

آپ نے اپنے پڑوسیوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کرنے کی تلقین فرمائی، اس میں کافر، مسلمان، عابد، فاسق، دوست، دشمن، مسافر اور شہری کی کوئی قید نہیں رکھی، آپ نے صحابۂ کرام کی ایک مجلس میں فرمایا خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، وہ ایمان نہیں لایا، وہ ایمان نہیں لایا، صحابۂ کرام نے پوچھا کون ایمان نہیں لایا، آپ نے فرمایا جو پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا ہے، ایک اور موقع پر فرمایا، وہ شخص مسلمان نہیں جو اپنا پیٹ بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو، (بخاری کتاب الادب باب الوصیۃ بالجار، ادب المفرد باب لایشبع دون جارہ، تاریخ اخلاق اسلامی ص۱۷۶ - ۱۷۷)

رسول اللہ صلعم اور عیسائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی لڑائی عیسائیوں سے نہیں ہوئی، ان سے معاہدے ہوتے رہے، ۲ھ میں آپ نے سیناء پہاڑی کے عیسائی راہبوں کو جو سینٹ کیتھرائین کی خانقاہ میں رہتے تھے، بڑی مراعات دیں، یہ رواداری کی ایک شاندار مثال ہے، اس چارٹر میں آپ نے اپنے پیرووں کی طرف سے یہ ضمانت لی کہ عیسائیوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائیگا ان کے گرجے اور ان کے پادریوں کی رہائش گاہوں کی پوری حفاظت کی جائے گی، ان پر غیر منصفانہ طور پر ٹیکس نہ لگائے جائیں گے، کوئی بشپ اپنے منصب سے معزول نہ کیا جائے گا، کسی عیسائی کو جبر سے اس کے مذہب سے منحرف نہ کیا جائے گا، کوئی راہب اپنی خانقاہ سے نہ نکالا جائے گا، کوئی عیسائی اپنے مقدس مقامات کی زیارت کو جائیگا تو اس

عدل و انصاف کی شہرت تھی، وہ یہودی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور صحابی کی شکایت کی، آپ نے صحابی پر برہمی ظاہر فرمائی (صحیح بخاری، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۰)

ایک دفعہ چند یہودی آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تجھ پر موت) کہا، حضرت عائشہؓ موجود تھیں، انھوں نے جواب میں کہا، وعلیکم السام و اللعنۃ یعنی تم پر موت آئے اور تم پر لعنت ہو، آپ نے ان کو روک کر فرمایا عائشہ! بد زبان نہ بنو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے، (صحیح مسلم کتاب الادب ج ۲ ص ۲۳۹ سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۱) تاریخ اخلاق اسلامی از مولانا عبد السلام ندوی ص ۱۸۸)

ایک بار آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، تو ایک یہودی کا جنازہ گذرا، اس کو دیکھ کر آپ کھڑے ہو گئے (صحیح بخاری کتاب الجنائز، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۱)

آپ یہودیوں سے لین دین کرنے میں تامل بھی نہ فرماتے۔ گو وہ آپ سے سختی اور گستاخی سے پیش آتے رہے، زید بن سعنہ جب یہودی تھے، تو ایک بار آپ نے ان سے قرض لیا، ابھی قرض کی واپسی کی میعاد بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ تقاضے کے لئے آگئے، آپ کی چادر پکڑ کر سخت سست کہا، حضرت عمرؓ موجود تھے، انھوں نے کہا او دشمنِ خدا، رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا، عمر! تم سے کچھ اور امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہیئے تھا کہ میں قرض ادا کر دوں، اس کے بعد یہودی کا قرض ادا کر کے بیس صاع کھجور اور زیادہ دیے (سیرۃ النبی جلد ۲ ص ۳۵۸ بحوالہ بیہقی، ابن حبان، طبرانی، ابن اللہ سیوطی)

ایک دفعہ ایک یہودی سے ایک جوڑا کپڑا قرض منگوا بھیجا، اس گستاخ نے کہلا بھیجا کہ وہ میرا مال یوں ہی اڑا لینا چاہتے ہیں، یہ سنکر رسول اللہ نے صرف اتنا فرمایا، وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں (جامع ترمذی کتاب البیوع، سیرۃ النبی ج ۲ ص ۳۵۸)

رسول اکرمؐ نے اپنے ابتدائی دور میں صحابۂ کرام کو یہود و نصاریٰ سے روایت کرنے اور ان کی کتابوں کے دیکھنے کی ممانعت فرمائی تھی، مگر بعد میں جب التباس و اختلاط کا خوف جاتا رہا تو ان سے روایت کرنے کی اجازت دیدی، اور خود ان کی کتابوں کے واقعات بیان فرماتے (بخاری باب ماذکر عن بنی اسرائیل مع فتح الباری و تاریخ اخلاق اسلامی از مولانا عبدالسلام ندوی ص ۲۳۵ - ۲۳۲)

آپؐ نے اپنے پڑوسیوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کرنے کی تلقین فرمائی، اس میں کافر، مسلمان، عابد، فاسق، دوست، دشمن، مسافر اور شہری کی کوئی قید نہیں رکھی، آپؐ نے صحابۂ کرام کی ایک مجلس میں فرمایا خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، وہ ایمان نہیں لایا، وہ ایمان نہیں لایا، صحابۂ کرام نے پوچھا کون ایمان نہیں لایا، آپ نے فرمایا جو پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا ہے، ایک اور موقع پر فرمایا، وہ شخص مسلمان نہیں جو اپنا پیٹ بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو، (بخاری کتاب الادب باب الوصیۃ بالجار، ادب المفرد باب لا یشبع دون جارہ، تاریخ اخلاق اسلامی ص ۱۷۰-۱۷۱)

رسول اللہ صلعم اور عیسائی | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی لڑائی عیسائیوں سے نہیں ہوئی، ان سے معاہدے ہوتے رہے، ۲ھ میں آپ نے سینا، پہاڑی کے عیسائی راہبوں کو جو سینٹ کیتھرائین کی خانقاہ میں رہتے تھے، بڑی مراعات دیں، یہ رواداری کی ایک شاندار مثال ہے، اس چارٹر میں آپ نے اپنے پیرووں کی طرف سے یہ ضمانت لی کہ عیسائیوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائیگا ان کے گرجے اور ان کے پادریوں کی رہائش گاہوں کی پوری حفاظت کی جائے گی، ان پر غیر منصفانہ طور پر ٹیکس نہ لگائے جائیں گے، کوئی بشپ اپنے منصب سے معزول نہ کیا جائے گا، کسی عیسائی کو جبر سے اس کے مذہب سے منحرف نہ کیا جائے گا، کوئی راہب اپنی خانقاہ سے نکالا جائے گا، کوئی عیسائی اپنے مقدس مقامات کی زیارت کو جائیگا تو اس

ریاست میں اس کی کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی، کسی گرجے کو منہدم کر کے مسجد یا کسی مسلمان کا گھر نہ بنایا جائے گا، جو عیسائی عورتیں مسلمانوں کے نکاح میں ہیں ان کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی پوری اجازت ہوگی، ان پر مذہب کی تبدیلی کیلئے کوئی جبر اور زور نہ ڈالا جائے گا، اگر عیسائیوں کو اپنے گرجوں، خانقاہوں اور مذہبی عمارتوں کی مرمت کے لیے امداد کی ضرورت ہوگی تو مسلمان ان کو مالی امداد دیں گے، ان شرائط کی خلاف ورزی مسلمان کریں گے تو ان کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ (اے شارٹ ہسٹری آف دی سارسنس از امیر علی ص ۱۴-۱۵)

عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلعم نے ہمیشہ اچھا سلوک کیا، حاتم طائی کے بیٹے عدی اپنے قبیلہ کے سردار اور مذہباً عیسائی تھے جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں، یہ بھاگ کر شام چلے گئے، ان کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا، وہ اپنے بھائی کے پاس گئیں اور کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو، وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ ہر حال میں ان کے پاس جانا مفید ہے، عدی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے ایسے متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کر لیا،

(ابن ہشام، اسلام عدی بن حاتم، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۴۲-۴۱)

نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ رہا وہ بھی رواداری کی ایک بڑی اچھی مثال ہے، نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا اور ان کو اپنے طریقے پر مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دیدی (زاد المعاد، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۷۱)

سنہ ۱۰ھ جب پورا جزیرۃ العرب آپ کے زیر نگیں ہو گیا تو نجران کے عیسائیوں کو جو حقوق دیے گئے وہ یہ تھے: نجران اور اس کے اطراف کے باشندوں کی جانیں، ان کا مذہب،

ان کی زمینیں، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کے سفراء، ان کی عورتیں اللہ کی امان اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا، اور نہ ان کے حقوق میں سے کسی حق میں دست اندازی کی جائے گی اور نہ مورتیں بگاڑی جائیں گی، کوئی اسقف اپنی اسقفیت، کوئی راہب اپنی رہبانیت، کنیسہ کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا۔ اور جو بھی کم یا زیادہ ان کے قبضہ میں ہے اسی طرح رہے گا، ان کے زمانہ میں جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا۔ ان سے نہ فوجی خدمت لی جائے گی اور نہ ان پر عشر لگایا جائے گا، اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی، ان میں سے جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا، اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ (فتوح البلدان، بلاذری ص ۷۱، مطبوعہ مصر، کتاب الخراج امام ابو یوسف و دین رحمت مطبوعہ دار المصنفین ص ۳۰-۲۳۷)

رواداری کا مفہوم رواداری قابل تعریف صفت ہے، مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی حال میں بھی رواداری سے انحراف نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ رحمان ہے، رحیم ہے، ستار ہے، غفار ہے، تواب ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ قہار بھی ہے، وہ اپنی ستاری اور غفاری میں کفر اور شرک کو بھی برداشت کیے ہوئے ہے، مگر جب اس کی قہاری بروئے کار آتی ہے تو بستیاں کی بستیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں، پوری قوم صفحہ دنیا سے ختم ہو جاتی ہے، حضرت نوحؑ، حضرت یونسؑ، حضرت لوطؑ، حضرت یوشعؑ، حضرت شیثؑ کی قومیں ایسی نیست و نابود کر دی گئیں کہ ان پیغمبروں کا نام لینے والا بھی کوئی باقی نہیں رہا، جس سے یہ ظاہر ہے کہ رحم و کرم اور رواداری ہر موقع پر مفید اور موثر نہیں ہوتی، مختلف حالتوں میں مختلف صورتیں پیش آتی رہتی ہیں، اس لیے انسانیت کو سنوارنے کے لیے کبھی ایسا بھی رویہ اختیار

کرنا پڑتا ہے، جو ظاہر بین نگاہوں میں سخت سمجھا جاتا ہے، ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مدبرانہ سختی کی بھی مثالیں ملیں گی، آپ نبی آخر الزماں تھے، آپ جامعیت کے پیکر بنا کر مبعوث ہوئے، اس لئے جہاں گذشتہ تمام پیغمبروں کی صفتیں آپ کو ودیعت کی گئیں ...
. . . . حضرت عیسیٰ کا نرم اخلاق اور حضرت موسیٰ کی سختی بھی ملی (تفصیل کے لیے دیکھو خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی باب جامعیت)

حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تعلیم دی گئی کہ تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بیگار لیجائے تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے تو تو اسکو اپنا کرتا بھی دیدے مگر انکے ماننے والوں نے اس تعلیم کو نظر انداز کر دیا، یورپ اور امریکہ میں حضرت عیسیٰ کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے، مگر کیا وہ اس تعلیم پر عمل کر رہے ہیں، ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اس شہر کو تباہ کرنے والے وہی تھے، جو حضرت عیسیٰ کا دم بھرتے تھے، ان کے یہاں شہروں کو برباد کرنے والے انسانوں کے خون کی ندیاں بہانے والے اسلحہ کے طرح طرح کے کارخانے کیا اس لیے کھولے جارہے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو فروغ دیں،

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جہاں نرم اخلاق رہا وہاں آپ میں سختی بھی رہی، مگر اس کی نوعیت یہ تھی کہ آپ اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرتے اور ان کا بھلا چاہتے، لیکن خدا کے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے، اور حق کا راستہ روکنے والوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتے رہتے، میرے استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی اپنے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ حضرت موسیٰ کے پاس ہم کو سرگرم شجاعانہ قوتوں کا خزانہ مل سکتا ہے، مگر نرم اخلاق کا نہیں، حضرت عیسیٰ کے یہاں نرم اخلاق کی بہتات ہے، مگر سرگرم اور عملی

ا حرکت پیدا کرنے والی قوتوں کا وجود نہیں، اس دنیا میں ان دونوں قوتوں کی ضرورت ہے اور دونوں کی جامع اور معتدل مثالیں صرف ہمارے پیغمبر اسلام میں مل سکتی ہیں (خطبات مدراس ص ۱۳)

سلام کی لڑائیاں آپ کے یہاں دشمنوں سے معرکہ آرائی کی مثالیں بھی ملیں گی، مگر کون قوم اور کون ملک ہے جس کی تاریخ میں لڑائیوں کی مثالیں نہیں ملتی ہیں، آج کی متمدن دنیا تو اسکی قائل ہے کہ انسانی فروغ کے لیے جنگ لازمی ہے۔ بیسویں صدی کی متمدن دنیا میں دو ایسی لڑائیاں لڑی گئیں جو پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے نام سے یاد کیجاتی ہیں، ان لڑائیوں میں کیا کچھ نہیں ہوا، انسانی خون کا سمندر بہایا گیا۔ انسان لنگڑے، لولے اور اندھے ہوئے، شہروں کی عمارتیں، عبادت گاہیں اور شفا خانے تباہ ہوئے، لاکھوں عورتیں بیوہ ہوئیں، اتنے ہی تعداد میں بچے یتیم ہوئے، دنیا میں اقتصادی بدحالی آئی، جنگ کے بعد جب صلحنامہ پر دستخط ہوئے تو ملکوں کے حصے بخرے کئے گئے، لاکھوں آدمی گھر سے بے گھر ہوئے، بعض ممالک کے گلوں میں سامراجیت کی غلامی کا طوق ڈالا گیا۔ ان کے باشندوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کیا گیا۔ ان کے ضمیر، زبان، مذہب کی آزادی پر پابندی عائد کی گئی، ان کے ملکوں کی دولت سے سامراجیت کے خزانے کو پر کیا گیا، اب ان ہی لڑائیوں کے فاتحوں کے کارناموں کو زریں قرار دے کر ان پر بے شمار جلدیں قلمبند کی جا چکی ہیں اور کیجا رہی ہیں۔

ہمارے رسول اکرمؐ نے بھی لڑائیاں لڑیں، مگر یہ لڑائیاں جنگ و جدل کی تاریخ کے لیے نمونہ بن سکتی ہیں، آپ کے غزوے سکندر اعظم کی طرح ذاتی شان و شوکت اور دبدبہ کے لیے نہ تھے، اور نہ شارلیمن کی طرح محض فتح و تسخیر کے لیے تھے، نہ نپولین کی طرح محض ملک گیری کی خاطر تھے، اور نہ ہٹلر کی طرح انتقام کے جذبے کو تسکین دینے کی خاطر تھے، نہ تاج و تخت کے لیے تھے، نہ اپنے ہمراہیوں اور علاقے کی معاشی خوشحالی کے لیے تھے، بلکہ آپ کو آپکے سارے

غزوات کی اجازت خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس لیے دی گئی کہ آپ پر ظلم کیا گیا اور آپ کے ساتھ آپ کے حامیوں کو ان کے گھروں سے اس لیے نکال دیا گیا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب خدا ہے (سورہ حج ۶)

مکہ میں جن لوگوں نے فتنہ و فساد برپا کر رکھا تھا اور لوگوں کو امن و امان کیساتھ زندگی بسر کرنے نہیں دیتے تھے، ان کے خلاف بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کا اعلان کر دینے کا حکم دیا گیا (انفال ۵)

پھر ان لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا جو نہ تو خود خدا اور جزا و سزا پر اعتقاد رکھتے اور نہ دوسروں کو ان پر یقین کامل رکھنے کی اجازت دیتے، مگر ایسے لوگوں کو طرح طرح سے ستاتے اور ان پر ظلم کرتے (توبہ ۴)

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اگر فرانس جمہوریت، مساوات اور اخوت کے نام پر خونیں انقلاب لاکر اپنے سربرآوردہ رہنماؤں کو سولی پر چڑھا سکتا ہے، اس انقلاب کے بعد مراکش، الجزائر اور شام کو غلام بنائے رکھ سکتا ہے، انگلستان اپنے سامراجی جذبہ کو تسکین دینے کی خاطر امریکہ، کنیڈا، ہندوستان، مصر، عدن، روڈیشیا، جنوبی افریقہ کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال سکتا ہے، ہالینڈ محض زر اندوزی کی خاطر انڈونیشیا کو اپنی آہنی گرفت میں لا سکتا ہے۔ پرتگال اپنی آبادی کی مادی خوشحالی کے لیے ایشیا اور افریقہ کے علاقوں پر بیجا تسلط اور قبضہ جما کر اپنی توسیع پسندی پر ناز کر سکتا ہے، اور امریکہ جمہوریت کے نام پر ویٹ نام پر ستر لاکھ ٹن سے زیادہ ہلاکت آفریں اور زہریلے بم گرا سکتا ہے، روس اپنی بولشویزم کو کامیاب بنانے کے لیے انسانی خون سے ہولی کھیل سکتا ہے اور مشرقی یورپ اور مشرقی جرمنی کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکتا ہے اور برلن کے بیچ شہر میں یا جوج

رکھڑی کر کے اس شہر اور ملک کے اعزہ کو ملنے جلنے سے روک سکتا ہے، نیشنلزم کو فروغ دینے کے
دنیا کی دو بڑی لڑائیاں لڑ کر ساری دنیا کو سیاسی اور معاشی بدحالی میں مبتلا کیا جا سکتا ہے،
ان لوگوں کے خلاف لڑائیاں لڑی گئیں جو ان پر ظلم کرتے تھے، اور یہ کہتے کہ ان کا رب خدا
، اور جس کام کو خدا نے حرام قرار دیا تھا، اس کو وہ حرام نہیں سمجھتے تو ایسی لڑائیاں کیوں
نہ سمجھی جائیں،

ہم کچھ ایسے احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہم اسلام اور اسلامی تعلیمات کو مدافعانہ
معذرت خواہانہ رنگ میں پیش کرنے کے عادی ہو گئے آجکل کی جارحیت ہی میں اصلی
قوت ہوتی ہے، اگر اسلام نے حق و صداقت کی ترویج کے لیے جارحانہ رنگ اختیار کیا
اس پر شرمانے کی ضرورت بھی نہیں،

انسانیت کو اسلام کا پیغام | اسلام کی یہ تعلیم رہی کہ انھیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح
اور کامیابی کے دروازے کھولے جائیں گے جنھیں ربانی حقائق کا یقین ہے اور اس
یقین کے ساتھ ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، فلاح و نجات کا حصول کسی نسل اور قومیت
موقوف نہیں، اور نہ کسی مذہب و ملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الٰہی پر یقین
کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے، عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی
تباہی اور ایمان اور نکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری ہے، خدا کے سوا نہ تو آسمان میں نہ
زمین میں، نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ
اور رکوع و قیام کی مستحق ہے، ہر عبادت صرف اسی کے لیے اور ہر پرستش صرف اسی کی
خاطر ہے، عبادت کے لیے خدا اور بندے کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص
شخصیت کی وساطت کی حاجت نہیں، خدائے عز و جل کے سامنے اپنی بندگی اور

عبودیت کا نذرانہ پیش کرنا ہی عبادت ہے، اسی کے ساتھ ہر وہ نیک کام جو خاص خدا اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لیے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے وہ بھی عبادت ہے، وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدے کیلئے کرے وہ بھی عبادت ہے، اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم اور مرکزی رشتہ اتحاد قائم کرنا بھی عبادت ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر قلبی عبادت ہے، تقویٰ یہ ہے کہ دل میں خیر و شر کی تمیز کیلئے خلش ہو، اور اخلاص یہ ہے کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا خیال ہو، توکل یہ ہے کہ کسی کام میں خواہ کتنی رکاوٹیں پیدا ہوں خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے، صبر یہ ہے کہ اگر کامیابی ہو تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے، جس کا اقرار کرنا شکر ہے۔ اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، اخلاق کی خوبی اس کے علم و فلسفہ میں نہیں، بلکہ اس کے عمل میں ہے، اخلاق کی غرض و غایت یہ ہے کہ یہ ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہو، غم خواری اور تیمارداری انسانیت کا ایک فرض ہے، لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا بھی انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ میں حائل نہ ہو، انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہیں اسکا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے، سخاوت اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے، اس سے ہم جنسوں کیساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، عفت و پاکبازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے جس کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، یہ انسان کے چہرہ کا نور ہے، انسانوں میں سب سے اچھا انسان رحم کرنے والا ہے، اخلاق کی ترازو میں عدل و انصاف کا پلہ کچھ کم بھاری نہیں

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں، اور جو قول و قرار کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے ٹوٹ جائے مگر جو عہد کیا جائے اس کو ضرور پورا کیا جائے، کسی کی بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے، عفو و درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے، کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے، بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان یہ ہے کہ وہ تواضع اور خاکساری اختیار کریں، اخلاص کا بڑا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، اسی کا نام ایثار ہے، باطل کو مٹانے اور ظلم و ستم کو روکنے میں شجاعت اور بہادری دکھائی جائے، حق بات کے سلسلے میں چاہے جتنی مشکلیں پیش آئیں، مخالفین ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے، حق گوئی کا اظہار سب سے زیادہ قابل ستائش ہے، خیانت بدترین گناہوں میں سے ہے، غداری، دغابازی، بدعہدی بدترین قسم کی برائیاں ہیں، ناپ تول میں کمی بیشی کرنا ملک میں فساد پھیلانے کے برابر ہے، خدا نے شراب اسکے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لیے نچوڑنے والے، اپنے لیے نچوڑنے والے، اس کے لیجانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے سب پر لعنت فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی بخشائش نہ ہوگی جو دل میں کینہ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ظلم کو اپنے بندوں کے لیے حرام کیا ہے، جو شخص اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کرتا ہے اسکا ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا یعنی اس کا اندھا پن قیامت کے ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہوگا، تکبر مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہے، مغروروں

کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اعمال کی راستی و ناراستی، اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، اگر کوئی عمل صرف نمود و نمائش کے لیے ہے تو یہ ریا ہے، جس سے عمل کی ساری عمارت بودی اور کمزور ہو جاتی ہے۔ کفر کے بعد نفاق اور ریا کا درجہ ہے، فضول خرچی سے بداخلاقی پیدا ہوتی ہے، اور قومی سرمایہ بھی برباد ہوتا رہتا ہے۔ تمام بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے۔ اور اس سے ہر حال میں پناہ مانگنے کی ضرورت ہے، فحش گوئی اور بدزبانی سے آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے، رفق و ملاطفت شریفانہ اخلاق ہیں الخ الخ

انسانیت کو سنوارنے کے لیے لڑائیاں اسلام کی یہی تعلیمات ہمارے ادارہ دارالمصنفین کی سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں میں پیش کی گئی ہیں، اوپر جو تعلیمات مختلف طریقہ پر پیش کی گئی ہیں، ان کی تفصیلات ان چھ جلدوں میں ملیں گی، اسلام میں اخلاق کے سارے فضائل کی تلقین اور سارے رذائل کی مذمت کی گئی ہے، کیا یہ تعلیمات صرف مسلمانوں کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے ہیں یا ان سے دوامی فیضان حاصل کرکے ساری انسانیت سنواری جا سکتی ہے، اگر ان سے انسانیت سنواری جا سکتی ہے تو ان تعلیمات سے انحراف یا انکار کرنے کا نام کفر ہے۔ اور اس کفر کو دبانے اور مٹانے میں جن لوگوں نے رکاوٹ پیدا کی تو ان کے خلاف ضرور جنگ کی گئی، جو کسی حال میں عدم رواداری کا ثبوت نہیں بلکہ ان لڑائیوں سے انسانیت کی گردن پر احسانات کا ایک بڑا بوجھ ڈال دیا گیا ہے،

اس سلسلہ میں اسلام کی نیام سے جو تلواریں نکلیں اس پر مسلمانوں کو شرمانے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس پر وہ فخر کر سکتے ہیں۔ دنیا کی کون ترقی یافتہ قوم ہے جس کی نیام سے تلوار نہیں نکلی۔

لڑائیوں کے لیے اسلامی قانون جنگ و صلح

اسلام نے لڑائیوں کے لڑنے کے جو حسب ذیل ضوابط و قوانین مرتب کیے، اُن پر بھی انسانیت فخر کر سکتی ہے۔

(۱) زیادتی کرنے والوں سے لڑائی لڑی جائے (الحجرات، آیت ۸)

(۲) جو لوگ دین کے بارے میں لڑیں ان سے بھی لڑائی کی جائے، جو لوگ گھروں سے نکال باہر کریں ان سے اور ان کی مدد کرنے والوں سے بھی جنگ کی جائے (الممتحنہ رکوع ۲)

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہم پر فوج روانہ فرماتے تو سردار فوج کو جو احکام دیتے ان میں ایک لازمی حکم یہ تھا کہ کسی بوڑھے، کسی بچے یا کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین، سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۰۸)

(۴) جب دشمنوں سے لڑائی ہو تو لشکر کی صفیں سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح ہوں (سورۃ الصف رکوع ۱) اس سے یہ مراد ہے کہ صف آرائی میں پوری تنظیم ہو، تال میل میں کوئی کسر نہ ہو، عقیدے اور مقصد میں اتحاد ہو، سرفروشی اور جانبازی کا پورا جذبہ ہو،

(۵) جنگ کے موقع پر دشمنوں کے علاقے میں جو تخریبی کارروائی کی جائے، اس کو فساد فی الارض سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا (سورۃ الحشر آیت ۵)

(۶) جنگ کے زمانہ یا فتح کے بعد زمینوں، فصلوں اور نسلوں کو تباہ کرنا کسی حال میں جائز نہیں (البقرہ۔ ۲۰۵)

(۷) دورانِ جنگ میں دشمن کے مال اور خاندان کو لوٹنے کی سخت ممانعت کیگئی،

کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اعمال کی راستی وناراستی، اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، اگر کوئی عمل صرف نمود ونمائش کے لیے ہے تو یہ ریا ہے، جس سے عمل کی ساری عمارت بودی اور کمزور ہوجاتی ہے، کفر کے بعد نفاق اور ریا کا درجہ ہے، فضول خرچی سے بداخلاقی پیدا ہوتی ہے، اور قومی سرمایہ بھی برباد ہوتا رہتا ہے، تمام بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، اور اس سے ہر حال میں پناہ مانگنے کی ضرورت ہے، فحش گوئی اور بدزبانی سے آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہوجاتا ہے، رفق وملاطفت شریفانہ اخلاق ہیں الخ الخ

انسانیت کو سنوارنے کے لیے لڑائیاں | اسلام کی یہی تعلیمات ہمارے ادارۂ دارالمصنفین کی سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلدوں میں پیش کی گئی ہیں، اوپر جو تعلیمات مختلف طریقہ پر پیش کی گئی ہیں، ان کی تفصیلات ان چھٹی جلدوں میں ملیں گی، اسلام میں اخلاق کے سارے فضائل کی تلقین اور سارے رذائل کی مذمت کی گئی ہے، کیا یہ تعلیمات صرف مسلمانوں کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے ہیں یا ان سے دوامی فیضان حاصل کرکے ساری انسانیت سنواری جاسکتی ہے، اگر ان سے انسانیت سنواری جاسکتی ہے تو ان تعلیمات سے انحراف یا انکار کرنے کا نام کفر ہے، اور اس کفر کو دبانے اور مٹانے میں جن لوگوں نے رکاوٹ پیدا کی تو ان کے خلاف ضرور جنگ کی گئی، جو کسی حال میں عدم رواداری کا ثبوت نہیں بلکہ ان لڑائیوں سے انسانیت کی گردن پر احسانات کا ایک بڑا بوجھ ڈال دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں اسلام کی نیام سے جو تلواریں نکلیں اس پر مسلمانوں کو شرمانے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس پر وہ فخر کرسکتے ہیں۔ دنیا کی کون ترقی یافتہ قوم ہے جس کی نیام سے تلوار نہیں نکلی۔

لڑائیوں کے لیے اسلامی قانون جنگ و صلح | اسلام نے لڑائیوں کے لڑنے کے جو حسب ذیل ضوابط و قوانین مرتب کیے، اُن پر بھی انسانیت فخر کر سکتی ہے۔

(۱) زیادتی کرنے والوں سے لڑائی لڑی جائے (الحجرات، آیت ۸)

(۲) جو لوگ دین کے بارے میں لڑیں ان سے بھی لڑائی کی جائے، جو لوگ گھروں سے نکال باہر کریں ان سے اور ان کی مدد کرنے والوں سے بھی جنگ کی جائے (الممتحنہ رکوع ۲)

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہم پر فوج روانہ فرماتے تو سردارِ فوج کو جو احکام دیتے ان میں ایک لازمی حکم یہ تھا کہ کسی بوڑھے، کسی بچے یا کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین، سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۰۸)

(۴) جب دشمنوں سے لڑائی ہو تو لشکر کی صفیں سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح ہوں (سورۃ الصف رکوع ۱) اس سے یہ مراد ہے کہ صف آرائی میں پوری تنظیم ہو، تال میل میں کوئی کسر نہ ہو، عقیدے اور مقصد میں اتحاد ہو، سرفروشی اور جانبازی کا پورا جذبہ ہو،

(۵) جنگ کے موقع پر دشمنوں کے علاقے میں جو تخریبی کارروائی کی جائے، اس کو فساد فی الارض سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا (سورۃ الحشر آیت ۵)

(۶) جنگ کے زمانہ یا فتح کے بعد زمینوں، فصلوں اور نسلوں کو تباہ کرنا کسی حال میں جائز نہیں (البقرہ۔ ۲۰۵)

(۷) دورانِ جنگ میں دشمن کے مال اور خاندان کو لوٹنے کی سخت ممانعت کی گئی،

آپ نے یہ منادی کرا رکھی تھی کہ جنگ کے موقع پر جو دوسروں کے گھروں میں جا کر وہاں کے رہنے والے کو تنگ کرے یا لوٹے مارے تو اس کا جہاد قبول نہیں کیا جائے گا،
(ابوداؤد کتاب الجہاد جلد اول ص ۳۵۲، سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۱۲)

یہ بھی فرمایا کہ جو شخص محض لوٹ مار کر کے مال غنیمت حاصل کرنے کی خاطر جہاد کرتا ہے، اس کو کوئی ثواب نہیں ملے گا، جہاد اس شخص کا ہے جو اس لیے کرتا ہے کہ خدا کا (مراد کلمۃ اللہ) کا بول بالا ہو (بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا و صحیح مسلم کتاب الامارۃ، سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۱۵)

ایک دفعہ ایک لڑائی میں صحابی انتہائی تنگ حالی میں مبتلا ہو گئے، فاقہ کی نوبت آ گئی، بکریوں کا ایک ریوڑ نظر آیا، تو سب اس پر ٹوٹ پڑے، بکریوں کو ذبح کر کے گوشت پکانا شروع کیا تو آپ تشریف لائے۔ اور اپنی کمان سے گوشت کی ہانڈی الٹ دی اور فرمایا لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے (ابوداؤد کتاب الجہاد جلد ثانی باب فی النہی عن النہبی اذا کان فی الطعام قلۃ و سیرۃ النبی ج اول ص ۶۱۰)

(۸) مقتولوں کا سر کاٹ کر گشت کرانے۔ یا دشمن کو گرفتار کر کے کسی چیز سے باندھکر اس کو تیروں کا نشانہ بنانے یا تلوار سے قتل کرنے کی سخت ممانعت کی گئی (المبسوط)

(۹) جب دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام ان سے لڑ کر ان کو کچل کر رکھ دینا ہے، اس کے بعد قیدیوں پر مضبوطی کے ساتھ قبضہ کرنا ہے، (سورہ محمد آیت ۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دشمن کی جنگی طاقت توڑ دیجائے، پھر انکے آدمیوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کیجائے،

(۱۰) جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوں ان کے لیے اختیار دیا گیا ہے کہ ان پر احسان کیا جائے یا ان سے فدیہ لیا جائے، لیکن ان کو قتل نہ کیا جائے، ایک بار چند قیدیوں کے قتل کیے جانے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا (ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۰، سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۰۸)

ایک قیدی سہیل بن عمر بڑا آتش بیان مقرر تھا، آپ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، جب وہ قیدی بنا کر لایا گیا تو آپ سے کہا گیا کہ اسکے دانت توڑ دیے جائیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ اگر میں اس کے دانت تڑوا دوں تو اللہ تعالیٰ میرے دانت توڑ دے گا، اگرچہ میں نبی ہوں،

(۱)

یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال جب گرفتار ہو کر آئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کو عمدہ کھانا اور دودھ برابر دیا جاتا رہا،

جنگ بدر کے قیدیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں کے حوالے یہ کہہ کر کیا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، ان کو کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو، چنانچہ صحابہ خود کھجوریں کھا لیتے لیکن قیدیوں کو پورا کھانا کھلاتے، حبش کی جنگ کے چھ ہزار قیدیوں کو آپ نے کپڑے کے چھ ہزار جوڑے دیے،

ذی قرد کی جھڑپ کے موقع پر حضرت سلمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ کر آیا ہوں، اگر ستر آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کر لاتا ہوں، آپ نے رحمت عام کے لحاظ سے فرمایا قابو پا جاؤ تو عفو سے کام لینا، (بخاری و مسلم، سیرۃ النبی جلد اول ص ۵۴۴)

(۱۱) دشمن اگر صلح کے لیے جھکیں تو ان سے صلح کر لیجائے (انفال ۶۱)

(۱۲) معاہدہ کا پیام لے کر کوئی قاصد آئے تو اس کی جان کی پوری حفاظت کی جائے، اگر اس سے اختلاف بھی ہو تو اس کو کسی حال میں قتل نہ کیا جائے،

(۱۳) دشمنوں کے لیے جاسوسی کرنا کسی حال میں جائز نہیں، اس جرم کے ارتکاب میں جسمانی عقوبتیں، طویل قید اور قتل کی بھی سزا تجویز کی جاسکتی ہے،

(۱۴) دشمنوں سے معاہدہ کی پابندی ہر حال میں کی جائے گی، صلح حدیبیہ میں یہ طے پایا تھا کہ کافروں یا مسلمانوں میں کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا، اس صلح کے بعد حضرت ابو جندلؓ قریش سے تنگ آکر مدینہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے آئے اور اپنے جسم کا داغ رو رو کر دکھایا، حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ انکی تکلیف سے متاثر ہوے، حضرت ابو بکرؓ نے ان کیلئے رسول اکرمؐ سے بار بار سفارش کی، مگر آپ نے پابندی عہد کے خیال سے انکو پا بزنجیر واپس کیا۔ (سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۶۰)

(۱۵) اگر دشمن معاہدہ کی خلاف ورزی کریں تو ان کے خلاف جنگی کارروائی جائز ہے۔

(۱۷) قیدی اور مفتوح علاقہ کے لوگ جزیہ دینا قبول کرلیں تو وہ مسلمانوں کی طرح آزاد شہری بن کر رہ سکتے ہیں اور ان کو یہ حقوق دیے جائیں: کوئی ان پر حملہ کرے تو ان کی پوری مدافعت کی جائے ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے، جزیہ دینے کے لیے ان کو محصل کے پاس جانے کی زحمت نہ دی جائے، ان کی جان، ان کی عزت، ان کے مال کی حفاظت کی جائے، ان کے قافلے اور تجارت کے کارواں کو محفوظ رکھا جائے، ان کی زمین ان ہی کے پاس رہے، جو چیزیں ان کے قبضے میں ہوں سنبھال رکھی جائیں، ان کے پادری، رہبان اور پجاری ان کے عہدوں سے برطرف نہ کیے جائیں، صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے، ان سے عشر نہ لیا جائے، ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائے، ان کا مذہب اور عقیدہ بدلوایا نہ جائے، ان کے حقوق زائل نہ کیے جائیں۔ (فتوح البلدان ص ۷۵-۵۹ مقالات شبلی جلد اول ۱۸۸-۱۸۹)

کیا اس سے بہتر جنگ و صلح کے قوانین آج کل کی اقوام متحدہ کی مجلس پیش کر سکتی ہے، مستشرقین الزام رکھتے ہیں کہ جزیہ کا ٹیکس لگا کر مسلم اور غیر مسلم شہریوں میں تفریق پیدا کی گئی، یہ تفریق پیدا کرنے کی خاطر نہیں تھا، بلکہ حفاظتی ٹیکس تھا، اگر غیر مسلم ممالک اپنے ان مسلمان باشندوں پر جو اقلیت بن کر ان کے یہاں آباد ہیں، ایسے حفاظتی ٹیکس لگا ئیں تو وہ شاید اس کے خلاف کوئی ناراضگی کا اظہار نہ کریں، لیکن موجودہ دور کی فریب کار سیاست میں قول اور فعل کا تضاد ہوتا ہے، روس انسانی مساوات اور اخوت کا پیام لے کر اٹھا تو وسطی تہذیب و تمدن کو جس کی بنیادیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں برس میں پختہ کی گئی تھیں مسمار کر کے رکھ دیا، سنگین کی نوکوں سے

خدا کے وجود سے انکار کرایا گیا۔ گرجاؤں اور مسجدوں میں جانے سے روکا گیا۔ انجیل مقدس کے اوراق کو سگریٹ کے کاغذ کے لیے استعمال کیا گیا، گرجاؤں اور خانقاہوں کے مال و اسباب لوٹے گئے، مذہبی مدارس کھولنے کی اجازت منسوخ کی گئی، کارل مارکس نے یہ نعرہ دیا کہ مذہب انسان کے دل و دماغ پر وہی اثر پیدا کرتا ہے جو افیون کرتی ہے، نکاح اور شادی کے دستور کو ختم کیا گیا، شادی کے رجسٹریشن کو بھی ضروری قرار نہیں دیا گیا، دو عورت مرد زن شو کی طرح جب تک چاہیں زندگی بسر کریں، جب چاہیں علٰحدہ ہو جائیں، شراب پینا اور جوا کھیلنا بداخلاقی قرار نہیں دی گئی، شخصی ملکیت کا حق ختم کر دیا گیا، اور جو لوگ اسکے دعویدار ہوں ان کا خاتمہ کردیا جائے، جو شریف کہلاتا تھا انکو رذیلوں سے بدتر بنا دیا گیا، کفر و الحاد کی مستی کو اصلی عقیدہ قرار دیا گیا، ان تمام انقلابات کو لانے کے لیے ہر قسم کے ہنگامے اور سازش کو جائز قرار دیا گیا، خواہ ان ہنگاموں اور سازشوں میں خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہیں لینن اہنسا اور سچ کا قائل نہیں تھا، وہ اپنے مقصد کی برآری کیلئے جائز و ناجائز سب طریقے اختیار کرنا لازمی سمجھتا تھا، اسکے نزدیک اخلاق اور کردار کی اہمیت نہ تھی، اسکا خیال تھا کہ اخلاق اور کردار ضرورت اور مصلحت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، وہ مذہب کو کفر سے بھی بدتر سمجھتا، اس کے خیال میں یہ اوہام پرستی اور قدامت کی طرف لیجاتا ہے۔ اس نئی زمین اور نئے آسمان بنانے کے سلسلہ میں جو انقلاب لانے کی کوشش کی گئی، اس کے مخالفوں اور حریفوں کو دار پر چڑھا دینا ایک معمولی سی بات ہو گئی، ابھی کچھ دنوں پہلے روس کے وزیر اعظم خروشچیف نے انکشاف کیا کہ اسٹالن نے اپنے ہزاروں رقیبوں کو قتل کرا کے اس طرح چپکے سے دفن کرا دیا کہ عام لوگوں کو خبر نہ ہوئی، یہ انکشاف روس کی برسر اقتدار حکومت کو پسند نہ آیا، خروشچیف کو معزول کر کے ذلت اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔

(باقی)

آلِ مقسم قیقانی سندھی

امام ابن عُلیّہ بصری اور دیگر علماء و محدثین

از

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۳)

امام اسمٰعیل بن ابراہیم المعروف بہ ابن عُلیّہ بصریؒ

ابو بشر اسمٰعیل بن ابراہیم بن مقسم بصری، عُلیّہ بنت حسان کے بطن سے بصرہ میں پیدا ہوئے، ابن سعد اور خطیب وغیرہ نے ان کی پیدائش سنہ ۱۱۰ھ میں بتائی ہے، لیکن ابن ندیم نے ۱۱۶ھ لکھا ہے[۱]، جیسا کہ معلوم ہوا وہ اور ان کا خاندان اسد بن خزیمہ کے موالی میں شمار ہوتے ہیں، اس نسبت سے وہ اسدی مولیٰ بنی اسد اور مولیٰ عبدالرحمٰن بن قطبہ اسدی کہلاتے ہیں لیکن تہذیب الکمال میں اسدی کے بعد قرشی بھی درج ہے[۲]، شاید یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ اسد بن خزیمہ کو اسد بن عبدالعزیٰ سمجھے اور اس بنا پر ان کو قرشی قرار دیا، مگر ابن حزم نے جمہرۃ انساب العرب میں بنو اسد ابن عبدالعزیٰ کا ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے ابن علیہ یا ان کے باپ دادا کے بارے میں اسکی کوئی تصریح نہیں کی ہے، خلاصہ تذہیب الکمال کے علاوہ کسی کتاب میں ابن علیہ کا اسدی قرشی ہونا مذکور نہیں ہے، اسمٰعیل کی والدہ علیہ کے بارہ میں خطیب نے علی بن حجر کا رجحان بتایا ہے کہ

---

[۱] الفہرست ص ۳۱۰، [۲] خلاصہ تذہیب الکمال ص ۲۷

وہ ان کی نانی تھیں[1]، مگر تمام تذکرہ نویسوں نے علیہ کو ان کی ماں لکھا ہے، وہ بصرہ کی مشہور صاحب علم خاتون تھیں، ان کا مکان علماء و مشائخ کا مرجع تھا، اس لیے اسمٰعیل باپ ابراہیم کے بجائے ماں ہی کی طرف منسوب ہو گئے، ابراہیم بن مقسم تجارتی کاروبار میں مصروف رہا کرتے تھے، اس لیے تعلیم و تربیت کا انتظام ماں ہی کو کرنا پڑا، اسمٰعیل ماں کے بجائے باپ کی طرف نسبت پسند کرتے تھے، یہانتک کہ کہتے تھے کہ

من قال ابن علیۃ فقد اغتابنی　　جس نے مجھے ابن علیہ کہا اس نے میری غیبت کی،

مگر یہ نسبت زبانوں پر ایسی چڑھ گئی کہ لوگ ابن ابراہیم کے بجائے ابن علیہ ہی کہتے رہے،

ابن علیہ بصرہ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی، لیکن ان کے باپ دادا کوفہ میں مقیم تھے، اس لیے بصرہ کے ساتھ کوفہ کا ذکر بھی ان کے نام کے ساتھ ہوتا رہا، اللہ تعالیٰ نے انھیں ظاہری حسن و جمال سے بھی نوازا تھا، وہ بصرہ کے خوبصورت ترین لڑکے سمجھے جاتے تھے،[2]

تعلیم و تربیت ابن علیہ کے والد ابراہیم بن مقسم کی دولت و ثروت کا ذکر ہو چکا ہے، کوفہ سے بصرہ تک ان کی تجارت کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، ماں کے علم و فضل کا بھی شہرہ تھا، اور بصرہ کے سبھی علماء و مشائخ اور محدثین و فقہا ان کے فضل و کمال کے معترف تھے، اس لیے انھیں اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے ہر قسم کی سہولتیں حاصل تھیں،

امام ابن علیہ نے ۱۱۰ھ میں بصرہ میں آنکھ کھولی، اس زمانہ میں پورا عالم اسلام علمی اور دینی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، اموی خلافت کا عروج تھا، اسلامی فتوحات کا سیل رواں مشرق سے مغرب تک موجیں مار رہا تھا، فقہاء و محدثین علوم اسلامیہ کی تعلیم اور تدوین

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۰ [2] ایضاً ص ۲۳۱

میں مصروف تھے. بصرہ علم کا بڑا مرکز تھا. اس کے ہر گلی کوچہ میں درس و تدریس کی مجلسیں آراستہ تھیں. اگرچہ اس وقت امام حسن بصری اور امام محمد بن سیرین بصری وغیرہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر ان کے حلقہ نشین اور تربیت یافتہ شیوخ موجود تھے، خود ابن علیہ کا گھر اہل علم و فضل کا مرجع تھا، چونکہ وہ آزاد کردہ باندی تھیں اس لئے کھل کر اہل علم سے ملتی جلتی تھیں اور علمی و دینی مسائل پر گفتگو کرتی تھیں، اپنے بچے کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیے ان کی نگاہ انتخاب امام عبد الوارث بن سعید بصری متوفی ۱۸۰ھ پر پڑی جو خود بھی قبیلہ بنو تمیم کی شاخ بنو عنبر کے آزاد کردہ غلام تھے، بنایت ثقہ اور حدیث میں حجت کا درجہ رکھتے تھے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ غلام الطرفین بچہ کے پہلے استاد و مربی بھی غلام تھے، علیہ اپنے بیٹے کو ان کی خدمت میں لے گئیں، عبد الوارث کا بیان ہے

اتتنی علیة بابنها فقالت	علیہ اپنے بیٹے کو لیکر میرے پاس آئیں اور
هذا ابنی یکون معك ویأخذ	کہا کہ یہ میرا بیٹا آپ کے ساتھ رہے گا اور
باخلاقك، قال: وکان من	آپ سے آداب و اخلاق کی تعلیم حاصل کرے گا،
اجمل غلام بالبصرة. قال:	یہ لڑکا بصرہ کے لڑکوں میں سب سے زیادہ حسین
فکنت اذا مررت بقوم جلوس	و جمیل تھا، جب میں محدثین کی کسی جماعت
قلت له: تقدم فکنت اجیٔ	کے یہاں جاتا تھا تو اس سے کہتا تھا
بعد، الی المحدث.	کہ پہلے تم آگے بڑھو، اس کے بعد میں حلقہ درس میں آگے بڑھ جاتا تھا

امام عبد الوارث نے اپنے عزیز شاگرد کی تعلیم و تربیت کی جانب ایسی توجہ کی اور اسلامی اخلاق کی تعلیم و تربیت سے اپنے شاگرد کو اپنے سے اونچا کر دیا، امام ابراہیم حربی کا بیان ہے:

فخرج ابن علیة، واهل البصرة	ابن علیہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو اہل بصرہ

لایشکون انہ اثبت من — اس میں شک نہیں کرتے تھے کہ وہ
عبدالوارث[1] — اپنے شیخ عبدالوہاب سے زیادہ مستند ہیں۔

اساتذہ ابن علیہ تحصیل علم کے لیے بصرہ سے باہر نہیں گئے، اپنے وطن ہی کے شیوخ و محدثین سے تعلیم حاصل کی، تذکرہ نگاروں نے ان کے اساتذہ و شیوخ میں حسب ذیل اصحاب کا نام لیا ہے:

(۱) ابوعبیدہ عبدالوارث بن سعید بصری مولی بنی عنبر متوفی محرم ۱۸۰ھ بعہد خلیفہ ہارون رشید (۲) ابوالتیاح یزید بن حمید ضبعی، ان سے ایک حدیث کا سماع کیا ہے، یہ بصرہ کے نامور فقیہ تھے، ۱۲۸ھ میں انتقال ہوا (۳) عبدالعزیز بن صہیب سے بہت زیادہ احادیث کی روایت کی ہے، وہ اور ان کے والدین حضرت انس بن ملک کے غلام تھے، ان کی ثقاہت و بزرگی کا یہ حال تھا کہ قاضی ایاس بن معاویہ نے ان کی تنہا شہادت کو کافی قرار دیا ہے، (۴) ابوعون عبداللہ بن عون بصری، انھوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی زیارت کی تھی، نہایت ثقہ، کثیرالحدیث اور متقی محدث تھے، رجب ۱۵۱ھ میں وفات پائی (۵) ابوبکر ایوب بن ابی تمیمہ کیسان سختیانی بصری، بنو عنزہ کے آزاد کردہ غلام تھے، حدیث میں ثقہ ثبت، جامع اور عدل ہونے کے ساتھ نہایت پاکباز، متقی اور کثیرالعلم تھے، ۶۳ سال کی عمر میں ۱۳۱ھ میں انتقال کیا، (۶) ابومعتمر سلیمان بن طرخان تیمی بصری قبیلہ بنی تیم کے ساتھ رہنے کی وجہ سے تیمی مشہور ہوئے، نہایت ثقہ، کثیرالحدیث اور عبادت و ریاضت میں بہت بڑھے ہوئے تھے، بصرہ میں ۱۴۳ھ میں فوت ہوئے، (۷) ابوبکر داؤد بن ابی ہند دینار بصری بنو قشیر کی شاخ آل الاعلم کے مولی اور کثیرالحدیث ثقہ محدث تھے، ۱۳۹ھ میں انتقال کیا (۸) ابوعبیدہ حمید بن ابی حمید طرخان الطویل، کثیرالحدیث ثقہ محدث تھے، ۱۴۲ھ میں

[1] تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۲۳۰، میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۱۰۱

فوت ہوئے، (۹) ابو یسار عبد اللہ بن ابی نجیح یسار کی مولی اخنس بن شریق، کثیر الحدیث اور صالح الحدیث تھے، ان پر بعض لوگوں نے قدری ہونے کا الزام لگایا ہے، لیکن درست نہیں ہے، ۱۳۱ھ میں فوت ہوئے، (۱۰) ابو یزید سہیل بن ابی صالح ذکوان السمان مدنی حدیث میں ثقہ و ثبت اور اہل مدینہ کے شیوخ حدیث میں حکم کا درجہ رکھتے ہیں، ۱۳۸ھ میں انتقال کیا بعض کتابوں میں سہل بن ابی صالح ہے جو صحیح نہیں ہے، (۱۱) لیث بن ابی سلیم کوفی مشہور فقہا میں سے تھے، اپنے شہر میں مناسک کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے تھے، دار قطنی نے ان کو صاحب سنت کہا ہے، ۱۴۳ھ میں انتقال کیا، (۱۲) ابو مسعود سعید بن ایاس جریری بصری اور اہل بصرہ کے مسلم محدث ہیں، ابن علیہ نے ان سے سب سے زیادہ روایت کی ہے، ۱۴۴ھ میں فوت ہوئے، (۱۳) ابو الحسن علی بن زید بن جدعان بصری قرشی تیمی، پیدائشی نابینا ہونے کے باوجود کثیر الحدیث تھے، محدثین نے ان کو ضعیف بتایا ہے، ۱۲۹ھ یا ۱۳۱ھ میں انتقال کیا، (۱۴) ابو عبد اللہ محمد بن منکدر تیمی مشہور ہیں، علم و فضل کے ساتھ معدن صدق اور صدر نشین صلحا سمجھے جاتے ہیں، ان کے مناقب و فضائل بہت ہیں، چھہتر سال کی عمر میں ۱۳۱ھ میں انتقال فرمایا، (۱۵) ابو السائب عطاء بن سائب ثقفی کوفی نے حضرت انس بن مالک اور اکابر تابعین سے روایت کی ہے، ۱۳۱ھ یا ۱۳۶ھ میں فوت ہوئے، (۱۶) ابو عبید یونس بن عبید بصری، قبیلہ عبد القیس کے آزاد کردہ غلام ہیں، حضرت انسؓ کی زیارت کی ہے، اور حضرات تابعین سے روایت کی ہے، ۱۴۰ھ میں انتقال کیا، (۱۷) ابو عبد الرحمن عاصم بن سلیمان الاحول بصری، بنو تمیم کے غلام ہیں، کثیر الحدیث اور ثقہ عالم ہیں، خلیفہ منصور کے زمانہ میں مدائن کے قاضی رہ چکے ہیں، ۱۴۱ھ یا ۱۴۲ھ میں فوت ہوئے، (۱۸) ابو عروہ معمر بن راشد بصری قبیلہ ازد کے غلام تھے، بصرہ سے یمن چلے گئے تھے، امام عبد الرزاق صنعانی کے

مخصوص تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں، ۱۶۵ھ میں انتقال کیا، (۱۹) ابوسہل عوف بن ابی جمیلہ اعرابی بصری قبیلہ طے کے غلام تھے، کثیرالحدیث اور ثقہ عالم تھے، امام حسن بصری کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، ۱۴۶ھ میں فوت ہوئے، (۲۰) یحییٰ بن سعید تیمی کوفی نے امام شعبی وغیرہ سے روایت کی ہے، حدیث میں ثقہ و امام اور صاحب سنت تھے، ۱۴۵ھ میں فوت ہوئے، (۲۱) ابوغیاث روح بن قاسم تمیمی عنبری بصری نہایت مستند حافظ حدیث تھے، احادیث کی تلاش و حفظ میں مشہور تھے، ۱۴۱ھ میں انتقال کیا، (۲۲) ابوریحانہ بصری کا نام عبداللہ بن مطر ہے، انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ سے روایت کی ہے، ان شیوخ واساتذہ کے علاوہ اور بہت سے ائمۂ حدیث سے ابن علیہ نے روایت کی ہے، ان کے تذکرہ نگاروں نے ان چند ناموں کے بعد "عن خلق" اور "خلق کثیر" لکھا ہے[1]۔

طالب علمی اور جوانی | ابن علیہ اپنی جوانی کے زمانہ ہی میں بصرہ کے عباد و زہاد میں شمار ہونے لگے تھے[2]۔

وہ اپنی ذہانت، حافظہ اور رسوخ فی العلم کی وجہ سے زمانۂ طالب علمی ہی میں مرجع انام بن گئے تھے، حاتم بن وردان کا بیان ہے کہ یحییٰ، اسمٰعیل، وہیب اور عبدالوارث امام ایوب سختیانی کی مجلس درس میں جاتے تھے اور وہاں سے اٹھنے کے بعد یہ سب اسمٰعیل ابن علیہ کے گرد بیٹھ کر ان سے پوچھتے تھے کہ ایوب سختیانی نے فلاں فلاں حدیثیں کیسے بیان

[1] یہ نام تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۲۹، تاریخ کبیر ج ۱ ص ۳۴۳، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۹، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۵، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۳، تہذیب الکمال ص ۲۰ سے اور ان کے مختصر حالات کتاب المعارف ابن قتیبہ، کتاب العبر، تہذیب التہذیب، تاریخ بغداد وغیرہ سے لیے گئے ہیں [2] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۸

کی ہیں، اور ابن علیہ سب کے جوابات دیتے تھے، [1]

دینی علوم میں جامعیت | امام ابن علیہ اسلامی علوم کے جامع تھے، خاص طور سے حدیث، لغت حدیث، جرح و تعدیل اور فقہ میں ان کا مقام بہت بلند تھا، امام شعبہؒ نے انکو سید المحدثین اور ریحانۃ الفقہا کے لقب سے یاد کیا ہے، ایک مرتبہ اہل بصرہ کے حفاظ حدیث جمع تھے، کوفہ والوں نے ان سے کہا کہ اسمٰعیل بن علیہ کو چھوڑ کر تم لوگ جس کو چاہو ہمارے مقابلہ میں لے آؤ، امام احمد ابن حنبل کا بیان ہے کہ مجھے امام مالک کی مجلس نہیں ملی تو اللہ تعالیٰ نے سفیان بن عینیہ کو دیا، اور حماد بن زید کی شاگردی نصیب نہ ہو سکی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے میں اسمٰعیل بن علیہ کو دیدیا، غندر کا بیان ہے کہ جس وقت میں حدیث کے حصول میں مشغول تھا، کوئی عالم حدیث میں اسمٰعیل بن علیہ سے بڑھ کر نہیں تھا، حماد بن زید کا حال یہ تھا کہ اگر کسی حدیث میں عبد الوارث ثقفی اور وہیب ان کی مخالفت کرتے تو وہ مطلق پروا نہ کرتے اور جب ابن علیہ مخالفت کرتے تو ہیبت زدہ ہو جاتے، یہی حال حماد بن سلمہ کا تھا، چنانچہ عفان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ طلبۂ حدیث حماد بن سلمہ کی خدمت میں موجود تھے، وہ کسی دوسرے کے قول کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس مجلس میں انھوں نے ایک حدیث میں غلطی کی اور کسی نے کہا کہ اس حدیث میں آپ کے خلاف کہا گیا ہے، حماد نے پوچھا کہ کس نے اس کے خلاف کہا ہے، لوگوں نے کہا حماد بن زید، اس پر انھوں نے توجہ نہیں کی، اور جب ایک آدمی مجلس سے بولا کہ ابن علیہ نے اس حدیث میں آپ کے خلاف بات کہی ہے تو یہ سنتے ہی حماد بن سلمہ اٹھکر اندر گئے اور باہر آکر کہا کہ اسمٰعیل بن علیہ نے جو بات

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۲

گئی ہے وہی درست ہے، قتیبہ بن سعد کا بیان ہے کہ اہل علم کہتے تھے کہ حفاظ حدیث چار ہیں، اسمٰعیل بن علیہ، عبدالوارث، یزید بن زریع اور وہیب،

یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ جس وقت میں بصرہ میں گیا وہاں کوئی محدث ایسا نہیں تھا جو حدیث میں ابن علیہ پر فوقیت رکھتا ہو،

عثمان ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ ابن علیہ حماد بن زید اور حماد بن سلمہ دونوں سے زیادہ اثبت و معتبر ہیں، میں کسی بصری عالم کو ان پر مقدم نہیں کر سکتا، نہ یحییٰ بن معین کو نہ عبدالرحمٰن بن مہدی کو، نہ بشر بن مفضل کو،

ابن سعد نے اسمٰعیل بن علیہ کو حدیث میں ثقہ، ثبت، حجت بتایا ہے، علی بن مدینی کا قول ہے کہ میں کسی کو ابن علیہ سے زیادہ اثبت و معتبر نہیں کہتا ہوں، علی بن مدینی کے علاوہ یحییٰ بن معین، عبدالرحمٰن بن مہدی اور دیگر ائمۂ جرح و تعدیل نے نہایت شاندار الفاظ میں ان کی ثقاہت و عدالت کا اعتراف کیا ہے،[1]

خصوصیات وامتیازات امام ابوداؤد کا بیان ہے کہ سعید بن ایاس جریری سے سب سے زیادہ روایت اسمٰعیل بن علیہ نے کی ہے، وہیب کا بیان ہے کہ اسمٰعیل بن علیہ نے عبدالوارث کی کتاب زبانی یاد کر لی تھی، زیاد بن ایوب نے کہا ہے کہ میں نے ابن علیہ کے پاس کبھی کتاب نہیں دیکھی، وہ زبانی احادیث کی روایت کرتے تھے، اور ایک ایک لفظ اور حرف گن گن کر روایت کرتے تھے، عبداللہ بن سلیمان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اسمٰعیل بن علیہ اور بشر بن مفضل کے علاوہ محدثین میں کوئی ایسا نہیں ہے جس نے غلطی نہ کی ہو، علی بن مدینی کا قول ہے کہ سب محدثین نے روایت میں غلطی کی ہے،

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۲۳۳ - ۲۳۴، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۰ - ۱۰۱، طبقات ابن سعد ج ۷ ص وغیرہ

سوائے چار کے، یزید بن زریع، ابن علیہ، بشر بن مفضل اور عبدالوارث بن سعید،
احمد بن سعید دارمی نے کہا ہے کہ حضرت جابرؓ کی حدیث مدبر میں ایک غلطی کے علاوہ
ابن علیہ کی کوئی غلطی معلوم نہیں ہوئی، اس حدیث میں انھوں نے مولیٰ کے نام کی جگہ
غلام کا اور غلام کی جگہ مولیٰ کا نام لیا ہے، امام احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ زید بن
حباب نے مجھ سے کہا کہ ابن علیہ کے علم سے مجھے فائدہ پہنچاؤ، میں ابن علیہ کی احادیث
و مرویات کی کچھ کتابیں ان کے پاس لایا، تو انھوں نے ان کتابوں میں سے صرف
ابن عون عن محمد، خالد عن ابی قلابہ اور دوسرے علماء کے اقوال و آراء میں سے کچھ
رکھ لیا، پھر خود ابن علیہ کے پاس جاکر ان کتابوں کی احادیث کے بارے میں سوال کیا،
ابن علیہ اس بات کو بہت پسند کرتے تھے کہ ان سے مسند احادیث اور اسناد کے بارے
میں سوال کیا جائے،

امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ یزید بن ہارون
نے ایک حدیث عن حماد بن زید عن ایوب عن مجاہد بیان کرکے کہا کہ علی بن مدینی
نے اس کی تخریج کی ہے، میں نے ان سے کہا کہ ابن علیہ نے اس حدیث کو عن ایوب عن
مجاہد بیان کرکے کہا ہے کہ اس کی تخریج علی بن مدینی نے کی ہے، انھوں نے سمجھا کہ
میں نے ابن علیہ کے بجائے ابن عیینہ کہا ہے، اس لیے کہا کہ ابن عیینہ ہمارے نزدیک
ایوب سے روایت کرنے میں حماد بن زید کے مانند نہیں ہیں تو انھوں نے کہا کہ میں نے تو
ابن علیہ کا نام لیا ہے، انھوں نے تعجب سے پوچھا ابن علیہ؟ پھر خاموش ہو گئے[1]

زہد و تقویٰ اور وقار | امام ابن علیہ ورع و تقویٰ اور وقار و تمکنت میں بہت آگے تھے،

---

[1] تاریخ بغداد اور میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب وغیرہ۔

ان کے معاصرین نے ان کے ان اوصاف وکمالات کا اعتراف و اقرار کیا ہے، اور اس بارے میں اپنے اپنے مشاہدات بیان کیے ہیں، ابوعبداللہ احمد بن نعیم نے اپنے بعض دوستوں سے نقل کیا ہے کہ ابن علیہ بیس سال تک نہیں ہنسے، عمرو بن زرارہ کا بیان ہے کہ میں چودہ سال تک ابن علیہ کی صحبت میں رہا ہوں، میں نے اس مدت میں ان کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، اور سات یا آٹھ سال تک ان کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا، علی بن مدینی کا بیان ہے کہ میں ابن علیہ کے یہاں رات کو رہا کرتا تھا، صدقات بصرہ کی ولایت ملنے کے بعد میں نے ان کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، حماد بن سلمہ کا قول ہے کہ ہم لوگ اسمٰعیل ابن علیہ کے اخلاق و عادات کو یونس بن عبید کے اخلاق و عادات سے تشبیہ دیتے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے بصرہ کی ولایت قبول کرلی، عفان نے کہا ہے کہ ابن علیہ جس زمانہ میں جوان تھے، بصرہ کے عباد میں شمار کیے جاتے تھے، ابن معین کا بیان ہے کہ ابن علیہ ثقہ، مامون، صدوق، مسلم اور پاکباز و متقی تھے، ابن مدینی کا بیان ہے میں ایک رات ابن علیہ کے یہاں سویا تو دیکھا کہ انھوں نے نوافل میں تہائی قرآن پڑھا، میں نے کبھی انکو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، سلیمان بن حرب نے ایک مرتبہ کہا کہ حماد بن زید نے ایوب سختیانی سے سب سے زیادہ روایت کی ہے، اس پر عبدالوارث نے کہا کہ میں نے ایوب کے انتقال کے بعد انکی مرویات و احادیث کو اپنی یادداشت سے لکھا ہے، اور ایسی حدیثوں میں جو ہوتا ہے ہوا، اسکے بعد سلیمان بن حرب نے وہیب بن خالد کی تعریف و توصیف کی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ تاجر تھے، دوکان اور بازار نے ان کو علم سے باز رکھا، اور اسمٰعیل بن علیہ کا ذکر کرکے ان کی ولایتِ بصرہ پر اعتراض کیا، ایک دن ایک بغدادی آدمی سلیمان بن حرب کے یہاں جاکر ابن علیہ کا تذکرہ تعظیم و تکریم کے ساتھ کرنے لگا، سلیمان بن حرب نے کہا کہ

بعض لوگ ان پر سکر کا اتہام لگاتے تھے، بغدادی نے کہا ابوایوب! جب میں ابن علیہ کے چہرہ کو دیکھتا ہوں تو وقار نظر آتا ہے، اور ان کو پیچھے سے دیکھتا ہوں تو خشوع وخشیت نظر آتی ہے، سلیمان بن حرب نے یہ سنکر کہا، ایسی بات ہے تو ان کو فلاں فلاں کی مجلس سے الگ ہوجانا چاہیئے، علی بن خشرم نے بھی انکے بارہ میں نبیذ نوشی کا ذکر کیا ہے، مگر یہ ان کی غلط فہمی ہے، یہ نشہ آور نبیذ نہیں پیتے تھے، بلکہ کھجور کا ایسا مشروب پیتے تھے، جس میں سکر (نشہ) نہیں ہوتا تھا[1]

حماد بن سلمہ اور حماد بن زید کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کپڑے کی تجارت کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اگر پانچ آدمی نہ ہوتے تو میں یہ کام نہ کرتا، پوچھنے پر بتایا کہ وہ پانچ سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، فضیل بن عیاض، محمد بن سماک اور ابن علیہ ہیں، ابن مبارک خراسان جاکر کپڑے کی تجارت کرتے تھے، اور منافع میں سے بال بچوں اور حج کا نفقہ نکال کر باقی رقم اپنے ان ہی پانچوں بھائیوں کو دیدیا کرتے تھے،

حسب دستور ایک مرتبہ ابن مبارک بغداد آئے تو ان کو معلوم ہوا کہ ابن علیہ نے عہدۂ قضا قبول کرلیا ہے، اس لیے نہ ابن علیہ کی ملاقات کو گئے اور نہ ہی ہر سال کی طرح رقم کی تھیلی بھیجی، جب ابن علیہ کو ان کی آمد کی خبر ملی تو ملاقات کے لیے گئے مگر ابن مبارکؒ نے بات کرنا تو درکنار ان کی طرف دیکھا بھی نہیں، ابن علیہ اس وقت کچھ کہے سنے بغیر چلے گئے، دوسرے دن خط لکھ کر اس بے اعتنائی کا سبب دریافت کیا، اسکے جواب میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے حسب ذیل اشعار لکھے،

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۵ تا ۲۳۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۶، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۱ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۷ تا ۲۷۹، خلاصہ تذہیب الکمال ص ۲۷، العبر ج ۱ ص ۳۱۰ -

یاجاعل العلم له بازیا ۔۔۔۔۔۔۔ یصطاد اموال المساکین

اے علم کو شکاری باز بنا کر مسکینوں کا مال شکار کرنے والے!

احتلت للدنیا ولذاتھا ۔۔۔۔۔۔۔ بحیلة تذهب بالدین

تم نے دنیا اور اسکی لذتوں کے لیے ایسا بہانہ تلاش کیا ہے جو دین کو ختم کردیگا۔

وصرت مجنونا بھا بعدما ۔۔۔۔۔۔۔ کنت دواء للمجانین

تم اس وقت دنیا کے دیوانے بن گئے ہو حالانکہ تم دیوانوں کے لیے علاج تھے۔

این روایاتك فیما مضی ۔۔۔۔۔۔۔ عن ابن عون وابن سیرین

امراء وسلاطین کے دروازوں سے دور رہنے کی تمھاری وہ احادیث و روایات کہاں گئیں جن کو پہلے ابن عون، ابن سیرین سے بیان کیا کرتے تھے،

این روایاتك فی سردھا ۔۔۔۔۔۔۔ فی ترك ابواب السلاطین

ان قلت: اکرھت فما کان ذا ۔۔۔۔۔۔۔ زل حمار العلم فی الطین

اگر تم کہو کہ مجھے مجبور کیا گیا تو اس سے کیا ہوتا ہے، علم کا گدھا کیچڑ میں پھسلکر پھنس گیا،

اللہ اکبر اس وقت سلاطین و امراء سے نفور اور سرکاری عہدوں سے اجتناب کا کیا عالم تھا، آج ہم طلاب دنیا اور حریصانِ منصب وجاہ اس کا اندازہ نہیں کرسکتے ہیں، لیکن وہ مردانِ حق حکمرانوں کے سایہ سے بھی گریزاں تھے، انھوں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالکر علم کی آبرو رکھی اور دین کو حکومت کے مصالح پر قربان ہونے سے بچایا،

ابن علیہ زار و قطار رونے لگے اور فوراً مجلس قضا سے اٹھکر خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں پہنچے اور کہا کہ امیرالمومنین! خدا کے لیے میرے بڑھاپے پر رحم کیجئے، میں اپنی غلطی کو اب برداشت نہیں کرسکتا، ہارون رشید نے حضرت عبداللہؒ بن مبارک کا نام لیکر

کہا کہ شاید انھوں نے آپ کو بھڑکایا ہے، ابن علیہ نے کہا خدا کے لیے مجھے نجات دیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کو نجات دے، انکے شدید اصرار پر ہارون رشید نے استعفا منظور کرلیا۔ جب ابن مبارک کو یہ معلوم ہوا تو خوش ہو کر ابن علیہ کے پاس حسب معمول ان کی تھیلی بھیج دی،

ایک روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ قضاء بغداد کے وقت کا نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق بصرہ کی ولایتِ صدقات سے ہے، حافظ ابن حجر نے اسی کو صحیح بتایا ہے، اور قرینہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، ابن علیہ قیام بصرہ کے زمانہ میں حاجت مند تھے، اس لیے ابن مبارک ان کی مالی امداد کرتے تھے، آخر عمر میں بغداد آئے اور خلافت کی طرف سے ان کا اعزاز ہوا، انھوں نے یہاں ذاتی گھر بنایا، نیز ابن مبارک کے اشعار میں "اموال المساکین" کے الفاظ سے بھی صدقاتِ بصرہ کی ولایت معلوم ہوتی ہے۔[1]

بصرہ میں ولایت صدقات اور بغداد میں ولایت مظالم	ابن علیہ کے ماں باپ دونوں غلام تھے، مگر دونوں صاحبِ جاہ و ثروت تھے والد ابراہیم بن مقسم کوفہ کے کپڑے کے مشہور

تاجر تھے، جن کی تجارت بصرہ تک تھی والدہ علیہ بنت حسان بصرہ کے علاقہ عوذہ میں ایک بڑے اور شاندار مکان کی مالک تھیں، جو ان ہی کے نام سے مشہور تھا، اسکے باوجود ابن علیہ نے معمولی زندگی بسر کی، بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بزاز تھے، یعنی کپڑے کی تجارت کرتے تھے، خطیب نے ان کے بارے میں امام ابوداؤد سجستانی کا یہ قول نقل کیا ہے،

هو رجل من اهل الكوفة — وہ کوفہ کے بزاز اور بنو اسد کے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۵، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۶ و ۲۷۸، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۱ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۱ ص ۲۵۵

بزاز، ھو مولی بنی اسد[1] (آزاد کردہ) غلام تھے،

ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد ان کا خاندانی پیشہ بزازی ہو، لیکن دوسری روا
سے خود ابن علیہ کے تجارت کرنے کا پتہ نہیں چلتا ہے، نیز حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ
جن پانچ محدثین کے بارے میں فرمایا ہے کہ

"اگر پانچ عالم نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا"[2]

ان میں ابن علیہ بھی تھے، اس بنا پر بھی ان کے بڑے تجارتی کاروبار کا خیال بعید
ہوتا، بعد میں پھر دنیاوی راحت و آرام کے اسباب مہیا ہوئے، اور پہلے بصرہ م
اور بعد کو بغداد میں امارت و ولایت ملی، ابن سعد کا بیان ہے جسے خطیب وغیرہ
بھی نقل کیا ہے:

وقد ولی صدقات البصرۃ	ابن علیہ بصرہ کے صدقات (عشر و
وولی ببغداد المظالم	زکوٰۃ وغیرہ) کے امیر ہوئے اور
فی آخر خلافۃ ھارون	ہارون رشید کے آخری دور خلافت
ونزل ھو ولدہ ببغداد	میں بغداد میں محکمۂ مظالم کے والی ہوئے اور وہ
واشتری بھا دارا[3]	اور انکے لڑکے بغداد آئے اور وہاں مکان خریدا،

بصرہ کی ولایت کے بارے میں تو معلوم ہو چکا ہے کہ اس کی مدت نہایت مختصر رہ
اور حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کی سخت تنبیہ کی وجہ سے ابن علیہ نے خلیفہ ہارون کے
سامنے استعفاء پیش کر دیا، ہارون رشید محرم ۱۷۰ھ میں خلیفہ ہوا، اور ابن مبا
۱۸۱ھ میں فوت ہوئے، اس لیے ابن علیہ کی یہ ولایت بصرہ ۱۶۹ھ اور ۱۸۰ھ کے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۰، ۲۳۱ [2] ایضاً ص ۲۳۰ [3] طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۳۲۵
تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۰.

درمیان رہی ہوگی، اس وقت تک وہ بصرہ ہی میں مقیم تھے، اس کے بعد ہارون رشید
کی وفات ۱۹۳ھ سے پہلے یعنی ہارون رشید کے آخری دور خلافت میں بغداد
کی ولایت مظالم ملی، اسی زمانہ میں وہ اور ان کے بال بچے بصرہ سے منتقل ہوکر
بغداد میں مستقل طور سے آباد ہوگئے۔ اور وہیں ایک شاندار مکان خریدا، اس
طرح زندگی کے آخری دن آرام سے گزارے،

فتنۂ خلق قرآن کا الزام | دوسری صدی میں فتنۂ خلق قرآن کیوجہ سے دینی حلقوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی،
معتزلہ نے خلافت کا سہارا لیکر قرآن کریم کے مخلوق اور حادث ہونے کا عقیدہ پھیلانا چاہا، اس
عظیم فتنہ کے مقابلہ کیلئے ائمۂ دین خاص طور سے محدثین سینہ سپر ہوگئے، جن میں امام احمد بن حنبل
خاص طور سے قابل ذکر ہیں، درحقیقت انھیں کی ہمت و جانبازی کی بدولت اس فتنہ کا
استیصال ہوا، امام احمد ابن علیہ کے شاگرد تھے لیکن اسکے باوجود لوگوں نے ابن علیہ پر خلقِ
قرآن کا الزام لگادیا، جس کا ذکر آجتک کتابوں میں درج ہے لیکن بات صرف اتنی تھی کہ ابن علیہ
خلیفہ امین کے دربار میں گئے اور اثنائے گفتگو میں یہ حدیث آگئی،

تجیٔ البقرۃ و آل عمران یوم	قیامت کے دن سورہ بقرہ اور سورۂ آل عمران
القیامۃ کانھا غمامتان یحاجان	بادل کی شکل میں آئیں گی اور اپنے پڑھنے والے
عن صاحبھما	کی طرف سے بحث کریں گی،

ابن علیہ سے کہا گیا کہ کیا ان دونوں سورتوں کے زبان ہوگی؟ اس پر ابن علیہ کی زبان
سے نکل گیا کہ ہاں، ورنہ وہ کیسے گفتگو کریں گی، اسی جملہ کو سنکر ان پر خلق قرآن کا الزام
لگادیا گیا، اور مشہور ہوگیا کہ ابن علیہ خلقِ قرآن کے قائل ہیں،

(باقی)

نفائس الکلام و عرائس الاقلام

راجہ علی خاں فاروقی والی خاندیش (۹۸۴ھ – ۱۰۰۵ھ) کے عہد کی ایک فارسی تصنیف

از

ریحانہ خاتون، ام۔ فل ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میران عادل، راجہ علی خاں بن میران مبارک خاندیش کے شاہان فاروقی کے خانوادے کا گیارہواں سلطان گذرا ہے، سیاسی اعتبار سے اس کا دور نہایت ابتلا کا دور تھا، چنانچہ خود اس کے آخری زمانے میں اس کے ملک کے حصے بخرے ہو گئے تھے، فرشتہ کے بقول ۱۰۰۴ ہجری میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے شاہزادہ مراد خان خاناں کی معیت میں احمد نگر پر حملہ آور ہوا لیکن موسم برسات کی وجہ سے نمایاں کامیابی نہ ہو سکی، راجہ علی خاں فاروقی کی فوجیں مغل افواج کے دوش بدوش احمد نگر کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں، مجبوراً برہان نظام شاہ ثانی والیِ احمد نگر نے مغلوں سے صلح کر لی، طے پایا کہ احمد نگر نظام شاہ کے پاس رہے گا لیکن برار پر شاہزادہ مراد متصرف ہو گا، راجہ علی خاں کو اسیر اور برہان پور کی طرف روانہ کر دیا گیا، اور خان خاناں شاہزادہ مراد کے ساتھ برار میں مقیم رہا۔ اسی درمیان دکنیوں نے شورش کی اور برار پر حملہ آور ہوئے، اس جنگ میں راجہ علی کا کام تمام ہو گیا۔

بہر حال سیاسی ابتری کے باوجود راجہ علی خاں کا دور علمی و ادبی ترقی کے لحاظ سے

خاصا قابلِ توجہ ہے لیکن سیاسی تاریخوں سے اس سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ البتہ اس دور کی بعض تالیفات اس امر پر بخوبی روشنی ڈالتی ہیں کہ اکبری دور کا مشہور شاعر فیضی فیاضی راجہ علی خاں سے خط و کتابت رکھتا تھا، اس کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بادشاہ کو ادب و شعر سے کافی دلچسپی تھی، چنانچہ فیضی نے امیر خسرو کی مثنوی تغلق نامے کی نقل کی سطح درخواست کی ہے[1]

سلطنت و ابہت پناہ سید الاقران، راجہ علی خاں فاروقی والی خاندیش امید کہ نواب معلی القاب، مزکی اوصاف مؤید و منصور باشد، بموجب ضرر داشتہ تمنا نماید کہ از کتاب تغلق نامہ کہ از انفاس مقدسہ امیر خسرو ہست چند ورق از اول و چندے از آخر رفتہ التفات نمودہ دو جزو از ......

اول و ہمیں قدر از آخر بکے از خدمت گاراں امر فرمایند کہ بہر خطے کہ مسودہ نمودہ بجہت بندہ مصحوب حاملان عریضہ فرستند، امید کہ مکارم عالیہ را عذر پذیر ایں جرأت و تصدیع خواہند داشت، ادام اللہ نعمائکم العبد الاقل فیضی"

راجہ علی خاں کے منتسبین میں ایک فاضل حاجی حرمین عبد اللطیف المنشی نام کا تھا، اس نے اس بادشاہ کے نام پر اپنی ایک کتاب بنام نفائس الکلام و عرائس الاقلام معنون کی ہے، اس کتاب سے بادشاہ کی سیرت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

بقول عبد اللطیف، راجہ علی خاں خود بڑا صاحبِ ذوق اور علماء و فضلاء کا بڑا قدر داں تھا، اس کی وجہ سے اطراف و اکناف کے علما اس کے دربار میں جوق در جوق آتے تھے، مؤلف اس طرح رقمطراز ہے[2]:-

---

[1] یہ خط ضمیمۂ تغلق نامہ مطبوعہ ۱۹۷۵ء کے مقدمہ ص ۲۲ میں درج ہے۔ [2] ورق ۹۶ ب

"در بار او مجمع دار د این گجرات و دکن و مطار رجال اہل حجاز و یمن شده ، و سائر اکناف آن دیار از وجود نفائس الجود دانشمندان ہنلوق معزز و جمیع اطراف آن اقطار از صدر نشینان محفل منثور و منظوم منور و متمیز گردید" چنانچه کاملان ذوی التحقیق از حسن سیرت والی آن ولایت بسکونت آن معمور ه بتہیج و مسرور و اصلاں مرتبهٔ درایت و تدقیق از صفاے سیرت آں حامی حامے حمایت متصفت بصفات مسرت الخ "

راجہ علی خاں نے اپنی حکومت کے پانچویں سال یعنی ۹۸۵ھ ہجری میں قرآن مجید حفظ کیا، اور اسی سال تراویح میں پورا قرآن سنایا، عبداللطیف منشی نے اس واقعہ کا بڑی آب و تاب سے ذکر کیا ہے، اور لفظ "حافظ" سے اس کی تاریخ بھی نکالی ہے،[1] اس سے بادشاہ کے دینی ذوق کا بخوبی پتہ چلتا ہے، نفائس الکلام سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ راجہ علی خاں کو سیرتِ رسولؐ سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اس کے مطالعہ میں ملا معین الدین مسکین کی مدارج النبوۃ رہتی تھی، اس کتاب سے بادشاہ کو جس قدر لگاؤ تھا، اس کا بیان نفائس الکلام کے کئی صفحات[2] میں درج ہے،

نفائس الکلام کا ایک نسخہ بانکی پور کے کتب خانے میں ہے، اس کا تعارف فہرست کتب خانہ جلد نہم (ص ۱۹۸ - ۱۹۹) میں ہوا ہے، اس کتاب کا موضوع خاصہ دلچسپ ہے، اس کتاب کی کچھ تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

کتاب کا پورا[3] نام نفائس الکلام و عرائس الاقلام ہے، اگرچہ کتاب باقاعدہ ابواب میں منقسم نہیں ہے، لیکن ہر مبحث کی ابتدا نفائس الکلام کے فقرے سے ہوتی ہے۔ اسی

---

[1] ورق ۳۰ الف، [2] ورق ۹۳ - بعد [3] ورق ۹۶ بعد۔

بنا پر کتاب کا یہی عنوان قرار پایا،

مؤلف نے اپنا نام تنزیل الرحمن عبداللطیف المنشی لکھا ہے[1]، وہ فاضل شخص تھا اور عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں دستگاہ رکھتا تھا، اور دونوں میں شعر بھی کہتا تھا[2]۔ فارسی میں دو ایک جگہ لطفی تخلص کے ساتھ چند اشعار درج ہیں، ان سے واضح ہے کہ یہ تخلص مؤلف کا ہے جو اس کے نام کی مناسبت سے اختیار ہوا ہے،

نفائس الکلام کا عام انداز منشیانہ اور مترسلانہ ہے، ممکن ہے اس مناسبت سے کسی سرکاری عہدے کا حامل بھی رہا ہو، بہر حال پوری کتاب اس کی قادر الکلامی پر دلالت کرتی ہے،

اس کے طرز کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظم کا عنصر نثر کے برابر ہوگا، اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان منظومات کا بیشتر حصہ خود مؤلف کے قلم کا رہین منت ہے،

مؤلف نے سبب تالیف کے تحت[3] کچھ باتیں لکھی ہیں لیکن ان سے یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی کہ اس تالیف کی فوری وجہ کیا تھی، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ وہ بادشاہ کے دربار میں رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا، اس بات کا اندازہ تو ہوتا ہے کہ اس کو تقرب حاصل تھا، مگر کسی عہدے کا حامل تھا یا نہیں، اس کا صراحۃً علم نہیں ہوتا،

کتاب کی تالیف کا سال وہی ہے جو راجہ علی خاں کی تخت نشینی کی تاریخ ہے جیسا کہ

---

[1] ورق ۳ و بعد [2] ایک عربی قطعہ کے لئے دیکھئے ورق ۸، الف [3] دیکھئے ورق ۱۵۶ الف ورق ۱۰۰، [4] ورق ۹۶ ب ۱۰۰ ب۔

آخر کتاب کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے،

نہصد و ہشتاد و چہار از حساب　　رفتہ کہ این نسخۂ عالی خطاب

یافت رقم از مدد فیض پاک　　رونق او تافت برین لوح خاک

لیکن کتاب میں بعض واقعات ۹۸۴ھ کے بعد کے ہیں، مثلاً ایک مشہور واقعہ ۹۸۹ھ[1] کا تفصیل سے درج ہے، اسی سنہ میں بادشاہ نے قرآن حفظ کیا تھا، اور تراویح میں قرآن سنایا تھا، چنانچہ لفظ "حافظ" سے اس کی تاریخ برآمد ہوتی ہے، خیال ہوتا ہے اصل مسودہ تو ۹۸۴ھ میں تیار ہو چکا ہوگا، بعد کو اس میں اضافہ ہوتا رہا ہوگا،

اس کتاب کے اتمام پر مولف بادشاہ کی توصیف[2] اس طرح کرتا ہے،

شکر کہ در کوکبۂ عہدِ شاہ　　یافت بنا این رقم از جہد شاہ

اے کرمت باعثِ فیروزیم　　شد ز صد برگ و نوا روزیم

تا نظر سوے من بیدل است　　ہرچہ مرا دوست مرا حاصل است

بندۂ پروردۂ احسانِ تست　　لطفی بیدل کہ ثنا خوانِ تست

آخری شعر میں اپنا تخلص لطفی صراحۃً لاتا ہے،

کتاب کے خاتمہ پر عذر خواہی[3] کرتا ہے :-

وصیت می کنم خلقِ جہاں را　　جوانمرداں پیدا و نہاں را

کہ این تالیف را ہر کس کہ خواند　　کند بر من دعاے تا تواند

در اصلاح خطاے من بکوشد　　وگرنہ دامنِ عفوے بپوشد

مرا خود واجب آمد عذر خواہی　　کہ دارد خامہ ام رو در سیاہی

---

[1] ورق ۷۳ - الف [2] ورق ۱۰۰ الف [3] ورق ۱۰۰ ب -

پھر لکھتا ہے[1]:-

الٰہی ایں عروسِ حجلۂ غیب | کہ بہر جلوہ سر برکرد از جیب
حریفِ مجلسِ اقبال بادا | رفیقِ بختِ فرخ فال بادا
قبولش دہ کہ منظور شہ آید | براوجِ شادمانی چوں مہ آید
بداوے چوں شبِ قدرش کمالے | فزودے چوں مہ بدرش جمالے
جمالش را دمادم تازہ گرداں | کمالش را بلند آوازہ گرداں

اس کتاب کی اہمیت اس اعتبار سے کافی ہے کہ اس میں اُس دور کے جستہ جستہ واقعات ایسے مل جاتے ہیں جو اور ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے کی بعض تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں؛

راجہ علی خاں فاروقی کا نام قرشی اور عدوی نسبت سے ملتا ہے[2]:-

"میران عادل شاہ بن مبارک شاہ بن عادل شاہ الفاروقی القرشی العدوی"

کہ تا چراغ فلک روشن است روشن باد
جہاں ز پرتو شمع جمال عادل شاہ

تاریخ جلوس[3] دوشنبہ ۲۰ ربیع الاول سنہ اربع وثمانین وتسعمایۃ

شاہ فاروقی حسب عادل شہ والا گہر
چوں تو نبود بر سریر خسروے شاہ دگر
از جلوس شاہیت تاریخ جستم عقل گفت
نہصد و ہشتاد و چار از ہجرتِ خیر البشر

---

[1] ورق ۱۰۱ ب [2] ورق ۴۶ الف، [3] ورق ۸۳ الف،

راجہ علی خاں اپنے بھائی میراں محمد شاہ کی وفات پر تخت نشین ہوا تھا۔ عبداللطیف میراں محمد کی مدح اس طرح کرتا ہے[1]:

جہاں ازیں دو محمد گرفت عزت و جاہ
یکی محمد مرسل کہ ہست ہادی راہ
دگر شہی کہ رواج شریعت او واد
جہان معدلت و مکرمت محمد شاہ

اس کی وفات[2] کی تاریخ ملاحظہ ہو:

چو پرسیدند از من سال فوت آن شہ عادل
کشیدم آہ و گفتم حیف از فوت محمد شاہ = ۹۸۴ھ

پناہ افاضل[3] جز او کس نبود — ازاں سال تاریخ لطفی بدیل
تفحص چو نمود ز الہام غیبی — چنیں گفت آہ از پناہ افاضل

۹۸۴ھ

میراں عادل کے محامد اتنے ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے[4]:

گر فہم آنکہ مرا موے تن زباں گردد — بجاے خامہ زسر تا قدم بیاں گردد
محامدش کہ ز ادراک عقل بیروں است — بگفتن و بنوشتن کجا بیاں گردد

اس کے بعد سلطان مذکور کی تعریف میں ایک طویل قطعہ درج[5] ہے جو بعض لحاظ سے اہم ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

شہی کہ او ز سر صدق ہمچو صدیق است — ز صدق اوست کہ عالم گرفتہ است قرار

---

[1] ورق ۹۴ ب [2] ورق ۵۵ الف [3] ورق ۹۰ الف [4] ورق ۴۳ ب، [5] قصیدہ فریدیہ کے تحت درج کیا ہے: ورق ۴۴، ۴۵

چراغ دولت فاروقیان ازو روشن ‌ ‌ ‌ ‌ ز فرمان لطفش ظالمان در استغفار

بحلم و فضل چو عثمان و حیا باشد ‌ ‌ ‌ ‌ بعلم و جود و شجاعت چو حیدر کرار

نهنگ بحرِ شجاعت سپهرِ عز و کرم ‌ ‌ ‌ ‌ قضا شکوه و قدر قدرت و فلک مقدار

ملاذ و ملجار شاهان هر عادلشاه ‌ ‌ ‌ ‌ رواج یافته ز و دینِ احمد مختار

ز عدلِ اوست که در بحر و بحر الفت انس ‌ ‌ ‌ ‌ گرفته اند بهم گرگ و میش و ماهی و مار

بدور عدلِ تو نوشیروان اگر بودی ‌ ‌ ‌ ‌ کشیدی از ره انصاف پای خود یکبار

خضر خصال سلیمان سریر عیسیٰ دم ‌ ‌ ‌ ‌ خجسته فال حمیده فعال فتح آثار

توئی درخت سرا بوستان هر که هست ‌ ‌ ‌ ‌ مه جمال ترا آفتاب آئینه دار

مدار ملک بود بر سه عادت ای شه عصر ‌ ‌ ‌ ‌ برین سخن همه دارند اهلِ دل اقرار

سخا و عدل و سیاست هزار شکر که هست ‌ ‌ ‌ ‌ همین سه عادت نیکو ترا همیشه شعار

به مجلس تو که رشک ریاضِ خلد بود ‌ ‌ ‌ ‌ خوشا آن کسی که چون رضوان حد و گرفته قرار

من غریب ندانم فلک مرا چه بدی ‌ ‌ ‌ ‌ جدا از در گه آن شه نمود و یار و دیار

فلک همیشه بمن در مقام برهمی است ‌ ‌ ‌ ‌ زمانه در پی کین و هر بر سر آزار

مگر عنایت و الطاف شاه فاروقی ‌ ‌ ‌ ‌ شود معین و کفیل غریب بی مقدار

که بر مراد و تمنای خود ظفر یابد ‌ ‌ ‌ ‌ شود خلاص ز جور سپهر کج رفتار

یگانه ئی که ز روز نخست تا امروز ‌ ‌ ‌ ‌ جهان و خلق جهان را بدولت استظهار

چراغ کشورِ هندوستان که ذاتش هست ‌ ‌ ‌ ‌ چو شمع باصره در دیدهٔ اولی الابصار

از دست گرمی هنگامهٔ مجالسِ انس ‌ ‌ ‌ ‌ از دست نور بچشم سپهر کینه گذار

زهی بنای علو ترا قضا بانی ‌ ‌ ‌ ‌ زهی اساس جلال ترا قدر معمار

بنور رائے تو محتاج شد ممالک ہند | بلے چراغ بود ناگزیر در شب تار
کنند اہل ورع در صوامع طاعات | پس از محامد ذات مہیمن غفار
ثنا و مدحت تو بالغدو و الآصال | دعائے دولت تو بالعشی و الابکار
ہمیشہ تا بود از سیر دیر چرخ نجوم | زمانہ را بدلائل علامت و آثار
بمقتضائے رضائے تو باد سیر نجوم | بوفق رائے تو گردا و گنبد دوار

لیکن قابل توجہ امر یہ ہے کہ عبداللطیف المنشی نے بادشاہ کا نام راجہ علی خاں فاروقی کے بجائے کبھی میران شاہ بن مبارک شاہ بن عادل شاہ فاروقی لکھا ہے، اور کبھی میران عادل شاہ بن مبارک شاہ بن عادل شاہ، لیکن باوجود اس کے تاریخوں میں مذکور راجہ علی خاں وہی ہے جس کو عبداللطیف نے میران عادل شاہ یا صرف میران شاہ لکھا ہے، تاریخوں میں بھی اس خاندان کے اکثر بادشاہوں کو میران اور عادل شاہ یا عادل خاں کے نام سے یاد کیا گیا ہے[۱]،

راجہ علی خاں فاروقی کے جلوس کی محفل ۲۰ ربیع الاول ۹۸۴ھ میں برہان پور میں قائم ہوئی، اس موقع پر عبداللطیف نے بائیس[۲] علماء و فضلاء کا ذکر کیا ہے، جو اس محفل میں خصوصیت سے شامل تھے، چونکہ ان علماء کے ذکر سے تاریخیں خالی ہیں۔ اس لئے ان کا تذکرہ دلچسپی[۳] سے خالی نہ ہوگا،

۱۔ سید محمد بخاری:۔ وہ اپنے زمانہ کے عارفوں میں تھے، اور بخارا کے رہنے والے تھے، "حضرت عرفان شعار ہدایت آثار .... المنظور بنظرات الباری السید محمد البخاری[۴]"۔

---

[۱] دیکھئے فرشتہ ج ۲، ذیل شاہان فاروقیہ خاندیش، [۲] یہ بیان نقائس الکلام کے ورق ۶۵ تا ۷۰ پھیلا ہوا ہے، [۳] ورق ۶۸ - الف

شیخ ہفت اقلیم قطب اولیاء　　واصل کامل ندیم کبریا
ہادی ملت امام شرع ودین　　جان پاکش منبع صدق ویقین
چو محمد نام و عیسیٰ دم شده　　ستر حق را محرم وہمدم شده
فیض عامش شامل حال ہمه　　ہمتش میسور آمال ہمه
مفخر اہل بخارا آمده　　معدن علم و ہدا را آمده
از وجود او ہنوز و دوستان　　جنة الماوی شده ہندوستان

۲- ۶ خان پناہی افادت دستگاہی مولا روح اللہ لاری ، موصوف کی مدح میں نفائس الکلام میں ۶ بیت پر مشتمل ایک عربی قطعہ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے[1] :-

بحر العلوم و من بحسن بیانه　　تنظیم اشکال العویص یسهل

۳- قدوة الاولیاء ، و مرشد الاصفیاء خدام خواجه حسین ، خواجۂ مذکور حضرت معین الدین چشتی اجمیری کی اولاد میں تھے ، عبد اللطیف ان کا ذکر عقیدت سے کرتے ہیں[2] :-

آنکه مبرا بود از جمله شین　　واصل حق حضرت خواجه حسین
قابل آئینهٔ دیدار حق　　حامل گنجینهٔ اسرار حق
نقد مقالات و معانی ہمه　　عقد کمالات نہانی ہمه
عرض خلائق سوی خالق رسان　　بخشش خالق به خلایق رسان

۴- قدوة الواصلین و مرشد السالکین خدام شیخ ابراہیم بروجی بغدادی موصوف

[1] ورق ۸۰ ب ، [2] ورق ۷۹ الف

کی مدح میں صاحبِ نفائس الکلام اس طرح رقم طراز ہیں[1]:-

از آں قسمت کہ بخششہا نمودند — دو ابراہیم را رتبت فزودند
یکے دولت سرا ئے ملت آراست — یکے شد کار خلق از ہمتش راست
از آں گشت آتش سوزندہ ریحاں — ازیں نار ستم شد نور احساں
از آں شد خانۂ در مکہ پر نور — ازیں دلہائے اہل اللہ معمور
شکست آں یک بت آزر بجستی — وزیں یک دینِ احمد را درستی

۵- سید مصطفےٰ دہلوی کی مدح میں نفائس میں یہ ابیات درج ہیں[2]:-

شیخ جہاں نقد وفا و صفا — نجم ہدیٰ مرشد دین مصطفےٰ
مہبط الہام دل پاک اوست — شمع خرد پرتو ادراکِ اوست
کاملِ دین واصل عالی سند — کاشفِ اسرار ازل تا ابد
اے چو نبی کردہ بفقرا فتخار — آمدہ در راہ فنا استوار

۶- سید محمد قادری بھی عرفان کے رمز شناس تھے، اُن کے مدحیہ اشعار اس طرح کے ہیں[3]:-

اے شدہ از جملہ نقائص بری — واصل مجذوب بحق قادری
ساجد محراب جمال اِلٰہ — رہبر او گشت خط لا الٰہ
کثرتِ او گشت بوحدت بدل — جوہر حال آمد و حل شد محل
نکتۂ سربستۂ جاں در جہاں — سلسلہ در سلسلہ راز نہاں

۷- حضرت ہدایت شعار و حقائق آثار ...... قدوۃ السالکین و عمدۃ الواصلین

---

[1] ورق ۹۹ ب [2] ورق ۱۰۰ ا - [3] ورق ۱۰۰ ب

برہان المحققین شیخ برہان بن شیخ محمد غوث گوالیاری اپنے والد ماجد کی طرح بڑے درجے کے عارف تھے۔ عبداللطیف اُن کی مدح میں یوں رطب اللسان ہیں[1]:

اعنی آں عارف معارف دوست	کہ شد اہلِ معرفت را دوست
مالک ملکت ولایت خاص	مرشد و مقتدائے ذوالاخلاص
مورد وارد خفی و جلی	عارفِ سِرِّ حضرتِ ازلی
آن جواد از مذاہبِ غیبی	مورد واردات لاریبی
بر سرِ معرفت بود گنجور	کشف اسرار از و گرفت ظہور
لجۂ فضل و معدنِ ایقان	بحرِ توحید و منبع عرفان
والد ماجدش ملاذ انام	غوث اسلام بود و شیخ کرام
در گوالیر چون بیاسوده	عالمی رُخ بخاک آں سوده

۸۔ سید ابراہیم بھکری کی تعریف عبداللطیف المنشی نے حسبِ ذیل اشعار میں کی ہے[2]:

آنکہ بود رہبرِ ھر صادقے	راہ نمایندۂ ھر عاشقی
ملتمس گوشہ نشینان راز	ہم نفس خلوتیان نیاز
بدرقہ کعبہ روان کمال	راہبر قافلۂ اہلِ حال
شیخ ابراہیم کہ از لطفِ حق	در ورع او بُرده ز جملہ سبق
فخر اہالی بھکر آمده	مرشد ہر سر در و سر آمده
خادم او گشتہ ز صدق و نیاز	شیخ نظام آنکہ بود گنج راز

۹۔ خدام سید بھول کا ذکر ان اشعار میں ہوا ہے[3]:

---

[1] ورق ۱، ب [2] ورق ۲، [3] ورق ۳،

آنکہ بود پیرِ راہ رسول | عارف درگاہ زمان شیخ بہول
کاشف انوار معانی حق | واقف اسرار نہانی حق
چشم خدا بیں بصفا باز کرد | دیدہ بدیدار خدا باز کرد
منظر او آئینۂ نور شد | آ ساں ناظر و منظور شد

۱۰۔ شیخ عبدالکریم بھی اسی دور کے ایک بزرگ تھے، وہ جود و کرم میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، عبداللطیف منشی ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں[۱]:۔

آں بلند آوازہ در برہان بود | دیو جہل و معصیت از وے نفور
عارف حق صاحب طبع سلیم | صاحب بذل و کرم عبدالکریم
پیشوائے طالباں مقبول حق | نہ فلک بر خوان جودش یک طبق

۱۱۔ قدوۃ الواصلین شیخ عبدالحکیم بن شیخ باجن بھی اسی عہد کے ایک صاحب حال بزرگ ہوئے ہیں، نفائس الکلام میں یہ اشعار ان کے لئے پائے جاتے ہیں[۲]:۔

زسیمائے صلاحش چہرہ پر نور | بہ اخلاق گرامی سینہ معمور
نیارد بر زباں جز راستی ایچ | نباشد در کلام او خم و پیچ
بود عبدالحکیمش نام و شہرت | ز جد و حال باشد در مسرت

۱۲۔ حقائق آثار و عرفاں شعار خدام شیخ ابوجیو[۳] خضر بھی راجہ علی خاں فاروقی کی تخت نشینی کے موقع پر موجود تھے، وہ ایک صاحب نسبت بزرگ معلوم ہوتے ہیں، عبداللطیف منشی رقمطراز ہیں[۴]:۔

---

[۱] ورق ۳، ب، [۲] ورق ۴، ا [۳] یہ نام ایک بار ابوجی خضر کی شکل میں ملتا ہے

[۴] ورق ۴، ا

پور خضر خضر رہ سالکاں | واصل حق مرشد اہل زباں
ای گہرت مخزن گنج خدا | پرتو ہمت بجہدا رہ نمائے
مطلع انوار تجلی توئی | آئینۂ صورت و معنی توئی
قبلۂ ذرات جہاں روی تست | روی ہمہ کعبہ رواں سوی تست

۱۳- حضرت ہدایت رتبت خدام شیخ لشکر اپنے دور کے مرشد تھے، ان کے لئے اشعار منقول ہیں[1]۔

مرشد کامل کہ نامش لشکر است | لشکر اہل صفا را رہبر است
شہسوار عرصۂ میدان راز | ہم بدعوی ہم بمعنی سرفراز
اختر تابان برج اولیا | گوہر رخشان درج اصفیا
مقتدای جملۂ اہل وفا | پیشوای زمرۂ صدق و صفا

۱۴- شیخ برہان نعمان کا بھی شمار بڑے مشائخ میں ہوتا تھا، ان کی مدح میں یہ اشعار لکھے گئے ہیں[2]۔

ای دُر صافی کہ ز رہ شرف | آمدہ برتر ز تو صدف
در حق حجت و برہان توئی | نیست شکی وارث نعمان توئی
سر نہانی بتو لائح شدہ | کشف معانی بتو واضح شدہ
کعبۂ اصحاب صفای کوی تست | قبلۂ ارباب وفا روی تست

۱۵- حضرت سیادت رتبت و شرافت مرتبت سید راجن بخاری کی توصیف ان اشعار میں بھری ہوئی ہے[3]۔

---

[1] ورق ۴۰۲، [2] ورق ۵، [3] ورق ۷۶۹

میوهٔ بستانِ مصطفوی — غنچهٔ گلستانِ مرتضوی
شرف و فخر خاندانِ رسل — معنی نکتهٔ فروع و اصول
آں سراپا ہے منبع نور — رہبرِ خلق در جمیع امور
راہی لجهٔ فنا فی اللہ — ماہرِ نقطهٔ بقا باللہ
گشته قابل ہمیشه از ہر ذوق — در کمال سرور و بہجت و شوق
لیس فی الکائنات الا ہو — نکته بشنو ز راجن شاہ[1]

۱۶۔ صدر المدرسین مفید الطالبین شیخ یوسف بنگالی کے لئے یہ اشعار ملتے ہیں،[2]

پیشوائے جملهٔ اہل کمال — شیخ یوسف قدوهٔ اربابِ حال
علم او دریائے بی ساحل بود — لطفِ او مفتاحِ ہر مشکل بود
فیض مطلق گشته او را عین ذات — مستفیض از فیض عامش کائنات
حادیٔ علم و کمالات آمده — ماحیٔ ظلم و جہالات آمده

(۱۷) مولانا عثمان مدرس مختلف علوم میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، عبداللطیف لکھتے ہیں:[3]

حضرت عثمان که زفضل اله — فایق دہر آمده بی اشتباه
پیش رو راہروان رشاد — عارف مبدا بود و ہم معا[د]
مجمع اسرار الٰہی بود — مظہر انوار کماہی بود
ہست بلند اختر و خورشید رای — ہندسه دانست و مجسطی گشای
سوی مطالب شده او را اصول — اوست مخاطب به فروع و اصول
عالم اسرار سماوات و ارض — عارف اشیا شده در طول و عرض

---

[1] ممکن ہے راجن شاہ ہو یہ اضافت اپنی ہو، [2] ورق ۲۶ ب، [3] ورق ۲۷،

(۱۵) حضرت شریعت پناہی غوث ممالک قاضی کبیر محمد، پیشوای قضاۃ اسلام، مقتدای ولاۃ انام، ناصر ملت عزاء مروج شریعت سمحا[۱]:

آنکہ در روز ازل بنوشتہ منشی قضا
از برای حضرتش منشور حکم جاودان
گشتہ احکام شریفش با عدالت ہمنفس
باد ذات بی عدیلش با فضیلت توامان

کی تعریف میں عبد اللطیف منشی نے دو عربی بیت درج کئے ہیں۔

(۱۶) حضرت قاضی عبد الغنی کی مدح میں یہ اشعار ملتے ہیں[۲]:

قضاۃ شرع پرور زیب ملکند	بفر قاب و قایع ہمچو ملکند
اصول دین از ایشاں استوار ست	سریر ملک از ایشاں پایدارست

آنکہ بود مشرب و عیشش ہنی	فاضل دہر آمدہ عبد الغنی
ای چو گل از پردہ راز آمدہ	پردگی گلشن راز آمدہ
حامل انوار حقایق توئی	شامل اسرار دقایق توئی
چرخ فلک کوکبہ آرای تست	دیدۂ انجم بہ تماشای تست
آمدہ خیل علما از صفا	وارث علم ہمہ انبیا
ہست ولی عالم روشن جبیں	صادق صفحۂ علم الیقیں
باطن این طائفہ معمور باد	ظاہر ایشاں ز ریا دور باد

---

[۱] ورق ۷۰ الف [۲] ورق ۷۸ ب

(۲۰) حضرت شریعت پناہ، فضیلت دستگاہ، محیط مرکز علم و کمال، مرکز محیط فضل و افضال ... قاضی روح اللہ ولکنی:

دانندۂ علوم شریعت کہ حضرتش بی اشتباہ مرجع ارباب ملت است

قاضی موصوف کی مدح میں عربی کا ایک قطعہ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے؛[۱]

قاضی القضاۃ امام الناس قاطبۃ محی الشریعۃ عون الدین والملل

(۲۱) علامۃ الزمان مولانا محمد وجیہ الدین کا ذکر عبد اللطیف المنشی نے ان اشعار میں کیا ہے:-[۲]

آں شدہ مرآت ظہور و بطون نیست درون از تو درون و برون

پیش خرام صف مردان عشق بدرقہ راہ نوردان عشق

کعبۂ دیں قبلۂ اصل قبول آنکہ زحق یافتہ قرب وصول

(۲۲) جناب خدام شیخ احمد محتسب آخری فاضل ہیں جن کا ذکر نفائس الکلام میں اس طرح ملتا ہے:[۳]

ای چو خورشید در زمانہ وحید چشم دانش ترا نظیر ندید

ہستی از محرمان بزم حضور از وصالش نگشتہ مہجور

یکسر موحید انہ زاہد در محامد ازاں شدی احمد

ان اہم عصر واقعات کے علاوہ نفائس الکلام میں بعض ایسے امور کا ذکر ہے، جو اسلامی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتے ہیں، ان میں سے چند امور یہ ہیں:

۱۔ لفظ وزیر کی تحقیق، اور وزارت کا بیان:[۴]

---

[۱] ورق ۹، [۲] ورق ۸۰، [۳] ورق ۱۰۱ الف۔

۲۔ خلافت کی توضیح وتشریح،

۳۔ امامت، خلافت اور حکومت۔

۴۔ خلافت خلفاء راشدین

۵۔ خلفاء بنی امیہ

۶۔ ائمۂ دوازدگان

۷۔ صفات امام وخلیفہ، احادیث واقوال کی روشنی میں[1]

۸۔ حکایات اخلاق عربی وفارسی

۹۔ چہل حدیث دربارہ عدل

نفائس الکلام کا واحد نسخہ بانکی پور کے کتابخانے میں محفوظ ہے۔ اسکی تاریخ کتابت ۱۰۹۱ھ ہے۔ کاتب شیخ محمد بن عبداللہ صدیقی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ نسخہ خود مولف کے عہد سے تعلق رکھتا ہے، یہ ضخیم کتاب بڑے سائز کے ۴۰۸ اوراق پر مشتمل ہے،

---

[1] یہ ایک طویل باب ہے جو ورق ۱۹۸ تا ۳۹۲ پھیلا ہوا ہے۔

شعورِ نبوت اور شعورِ اجتہاد کی ضرورت

از مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سمینار میں پڑھا گیا، جو اسلامک اسٹیڈیز کی طرف سے ۲۲ تا ۲۵ جنوری سنہ ء منعقد کیا گیا تھا، جس کا موضوع اسلام تغیر پذیر دنیا میں تھا (معارف)

تغیر پذیر دنیا میں اسلام کے لیے دو قسم کے شعور کی ضرورت ہے،

(۱) شعورِ نبوت اور

(۲) شعورِ اجتہاد

شعورِ نبوت سے مراد علم و حکمت کا نور، اور فہم و ادراک کا وہ کمال ہے جو نبوت کے خلقی وجدان و داخلی شعور کا نتیجہ اور اس کے لیے لازم ہے، اس کو یہ قوت بھی حاصل ہوتی ہے کہ براہِ راست شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر کسبِ فیض کرے اور ما ورائی حقیقت سے حاصل کردہ علم و ادراک کو وحی الٰہی کی شکل میں پیش کرے، یہ شعور علم و ادراک کا نہایت اونچا، محفوظ اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ذریعہ سمجھا جاتا ہے،

شعورِ اجتہاد سے مراد وہ ملکہ یا ہیئت راسخہ ہے کہ جس کے ذریعہ شعورِ نبوت کے علم و ادراک سے اخذ و استنباط پر قدرت حاصل ہو، اس شعور کی تکوین شعورِ عقل اور شعورِ قلب دونوں کے آمیزہ سے ہوتی، اور اس میں عقلی بصارت اور قلبی بصیرت دونوں کی نمود ہوتی ہے،

ختم نبوت پر شعور نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا لیکن یہ اُس وقت ختم ہوا جب کہ شعور اجتہاد اس کی
قائم مقامی کے قابل بن گیا یعنی اس میں اس درجہ پختگی توانائی اور خود اعتمادی پیدا ہوگئی کہ زندگی و معاشرہ
کے مسائل حل کرنے کے لیے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت نہ رہ گئی (جیسا کہ
ختم نبوت سے قبل رسول اور نبی کے ذریعہ آسمانی ہدایت کا انتظار رہتا تھا) بلکہ وہ خود غور
و فکر اور تلاش و جستجو سے یہ مسائل حل کرنے لگا،

لیکن زندگی و معاشرہ کا تجربہ رکھنے والے ماہرین و مفکرین اس حقیقت سے بخوبی
واقف ہیں کہ شعور عقل و شعور قلب کے فیصلے و نتائج طبعی خصوصیات و بشری کمزوریوں سے
خالص و بے آمیز نہیں ہوتے ہیں، بلکہ رسمی حجابات اور وضعی حالات ان دونوں میں اسقدر
پیوست ہوتے ہیں کہ کلی طور پر انکو کسی وقت جدا نہیں کیا جا سکتا ایسی حالت میں لازمی طور پر
شعور اجتہاد (جس کی تکوین میں دونوں کی آمیزش ہے) کے فیصلے و نتائج نہ بالکلیہ خالص
و بے آمیز ہونگے اور نہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لیے اس کو آزاد و خود مختار
چھوڑنے کی اجازت ہوگی۔ بلکہ ہر موڑ اور ہر موقف پر اس کے لیے بلند و برتر رہنما کی تلاش
و ضرورت ہوگی کہ جس کی رہنمائی میں حتی المقدور اپنے فیصلے و نتائج میں نکھار پیدا کر سکے اور
جس کا دامن عصمت اس کی تردامنی کے لیے ذریعۂ نجات بن سکے۔

یہ رہنما شعور نبوت ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کے خالص و بے آمیز
ہونے کی ضمانت نہیں ملتی۔

اس شعور سے رہنمائی حاصل کرنے کا براہ راست سلسلہ اگرچہ ختم ہوگیا لیکن اس سے
حاصل شدہ علم و ادراک کی دونوں قسمیں موجود و محفوظ ہیں،

(۱) وہ علم و ادراک جو برتر شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر شعور نبوت نے حاصل کیا ہے،

جس کا تعلق خارجی و ماورائی حقیقت سے ہے، اس کا اصطلاحی نام "قرآن" ہے۔

(۲) وہ علم و ادراک جو نبوت کے عقلی وجدان و داخلی شعور کا نتیجہ اور قرآن کی معنوی دلالت سے اخذ و استنباط کیا ہوا ہے، اس کا اصطلاحی نام "حدیث" ہے،

ان ہی دونوں کی رہنمائی میں شعور اجتہاد شعور نبوت کی قائم مقامی کا شرف حاصل کرتا اور اپنی چاک دامنی کے لیے رفوگری کا سامان مہیا کر کے فائز المرام ہوتا ہے،

شعور کی اس وضاحت کے بعد اب اسلام اور تغیر پذیر دنیا میں غور کرنا چاہئے، غالباً یہ بات ہم سب کو تسلیم ہے کہ اسلام کی حیثیت انکشاف حقیقت کی ہے، جو بذاتِ خود ایک آئیڈیل ہے، سماجی عمل کی نہیں ہے کہ جس کا اپنا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا بلکہ سماج ہی اس کے در و بست کا مالک ہوتا ہے، جو چیز انکشافِ حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہمیشہ باقی رہتی اور اسی کی روشنی میں تغیر پذیر دنیا کا مطالعہ ہوتا رہتا ہے، اور جو چیز سماجی عمل کی حیثیت رکھتی ہے، وہ اس وقت تک باقی رہتی ہے، جب تک سماج اس کی اجازت دیتا ہے اور اگر اس کی جگہ کوئی اور عمل یا طریقہ اختیار کر لیا گیا تو پھر وہ چیز تاریخی بن جاتی ہے،

اسلام کی یہ حیثیت متعین ہونے کے بعد تغیر پذیر دنیا میں اسلام کے باقی رہنے اور نہ رہنے کا سوال نہیں اٹھتا، بلکہ اصل سوال اس کی تعلیمات اور تغیر پذیر دنیا کی تنظیمات میں ربط و تعلق کا رہتا ہے، یہ دنیا آج نہیں بلکہ ابتدا ہی سے تغیر پذیر ہے، اسلام بھی نیا نہیں، بلکہ شروع ہی سے اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، اس بنا پر ربط و تعلق کا مسئلہ بھی کوئی انوکھا اور نیا نہیں ہے، انبیاء علیہم السّلام شعور نبوت کے ذریعہ یہ ربط و تعلق پیدا کرتے رہے اور ختم نبوت کے بعد اجتہاد کے ذریعہ اس کو بحال رکھنے کی کوشش ہوتی رہی ہے،

تغیر پذیر دنیا آسمان سے نہیں اترتی بلکہ انسان کے ہاتھوں وجود میں آتی ہے جس میں

ر دونوں کا وجود اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ظہور ہوتا ہے، اس سے گھبرانے
رعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جو انسان اس کو وجود میں لاتا ہے، وہی
ن اسلام کی نسبت سے خیر و شر کی حد بندی کر کے اور عدل و اعتدال کی قوت پیدا
، اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی کر سکتا ہے، انبیاء علیہم السلام نے یہی حد بندی اور
، پیدا کر کے اپنے وقت کی تغیر پذیر دنیا کو بطور نمونہ پیش کیا تھا، اور ختم نبوت کے بعد
حد بندی اور قوت کو بحال رکھ کر اسلام کو زندۂ جاوید ثابت کیا گیا تھا۔

ختم نبوت کے بعد جب ایرانی، رومی، حبشی، قبطی، ترکستانی اور سندھی قوموں سے سابقہ
ن کے حالات و معاملات مختلف تھے، معاشی و سیاسی نظام میں تفاوت تھا، کہیں
نی تہذیب و قانون کو دخل تھا، تو کہیں رومی تمدن و قانون کا اثر تھا، غرض عجمیوں کے
لاط سے ایک عجیب کشمکش پیدا ہوگئی، اور ان کے ساتھ معاملات سے نئی نئی ضرورتیں
ر آئیں اور بہت سے نئے نئے مسائل حل طلب قرار پائے، جن کی وجہ سے عرب کی سادگی
دھکا پہونچا اور اسلام کی سادگی کو تمدن کی چاشنی دیکر اس کے دامن کو وسیع
نے کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت بھی یہی "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" کا سوال
ما تھا، لیکن رہنمایان ملت کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ چین نصیب کرے کہ انھوں نے
س انداز سے اس سوال کو حل کر کے اسلام کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے اور نئے
حوال و ظروف کو جس ہمت کے ساتھ اسلام کے وسیع دامن میں سمیٹا وہ ہماری تاریخ
کا نہایت روشن باب ہے، اگر خدانخواستہ ان پر جمود طاری ہوتا یا اسلام کو آزادی
، ینے والی طاقت کے بجائے اس کو معطل کرنے والی آہنی زنجیر سمجھتے تو اسلام صرف عرب
یں محدود ہو کر رہ جاتا، اور ہمیشہ کے لیے اس کی عالم گیریت ختم ہو جاتی، پھر آج وہ اس

قابل نہ رہتا کہ "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" سوالیہ نشان بن کر اس پر سیمینار کیا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ آج کی تغیر پذیر دنیا محض حالات کے اتار چڑھاؤ اور قوموں کی آمد و رفت سے نہیں رونما ہوئی، بلکہ ایک دور کے بعد دوسرے دور کے آنے سے ظہور پذیر ہوئی ہے، اس سے بھی انکار نہیں کہ بات صرف حاجت و ضرورت پر نہیں ختم ہوتی بلکہ منفعت کے حصول اور مضرت کے دفعیہ کے سوال پر اور زندہ رہنے کے لیے موجودہ سر و سامان سے آراستہ ہونے کا معاملہ ہے،

لیکن یہ حقیقت بھی تو مسلم ہے کہ خیر و شر میں امتیاز اور خوبیوں اور خامیوں میں حد فاصل قائم کرنے کے لیے وہ پیمانہ موجود ہے جو شعور نبوت نے پیش کیا ہے، وہ نمونہ موجود ہے، جو ختم نبوت نے پیش کیا ہے، اور وہ طریق کار موجود ہے، جس کے ذریعہ شعور اجتہاد نے اسلام کی سادگی کو تمدن کی چاشنی کا رنگ دیا ہے،

اب اس شعور اجتہاد کے ذریعہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ تغیر پذیر دنیا میں کس چیز کو لینا اور کس چیز کو چھوڑ دینا ہے، کس میں کاٹ چھانٹ کرنا اور کس سے نظر بچا کر نکل جانا ہے، کس کو بعینہ قبول کرنا اور کس کو بالکلیہ نظر انداز کر دینا ہے، کس میں نئی روح پھونکنا اور کس کے لیے نیا قالب تیار کرنا ہے، عبوری مرحلہ کس طرح گزارنا اور ہنگامی حالات کا کیسے مقابلہ کرنا ہے، اور سب سے بڑی بات فطرت کی کاٹ چھانٹ کو سمجھنا اور اس سے عبرت و بصیرت حاصل کرنا ہے، کہ فطرت خود ہر گوشہ میں کاٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر شے کو فٹ کرتی رہتی ہے، جب کوئی شے ایک جگہ فٹ ہو گئی تو وہ کمتر شے کیلئے جگہ نہ چھوڑیگی، بلکہ قبضہ کے لیے اس سے بلند و برتر شے کا ہونا ضروری ہے،

اس "دیکھنے" میں شعور نبوت کی "حکمت عملی" کو اپنانا ہوگا جس نے اپنے وقت کی تغیر پذیر دنیا میں "ازالہ" کے بجائے "امالہ" کی روش اختیار کی اور خذ ما صفا ودع

مآکد" کے اصول پر عمل کرکے جہیز دینی کو قبول کیا،

اس "دیکھنے" میں بنیادی نقطۂ نگاہ یہ بنانا ہوگا کہ اگر اس وقت محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف فرما ہوتے تو منفعت کے حصول اور مضرت کے دفعیہ کا کس قدر لحاظ فرماتے اور تدریج و تخفیف کے کن اصولوں پر عمل کرکے لوگوں کی دلجوئی کرتے۔

اس "دیکھنے" میں ہر نظر و صلاحیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ اس کی نظر و صلاحیت درکار ہوگی جو اس فن کا ہو اور جس کا اصطلاحی نام "فقیہ" ہے،

الفقیہ العالم الذی یشق	فقیہ وہ عالم ہے جو احکام کا تجزیہ کرتا
الاحکام ویفتش عن حقائقہا	ان کے حقائق کی تفتیش کرتا، اور
ما استغلق منہا (جار اللہ زمخشری	ان کے مشکل امور کو واضح کرتا ہے،

کتاب الفائق جز ثانی۔ فقہ)

فقیہ کے لیے معاملہ فہمی و دنیوی مصلحت شناسی بھی ضروری ہے

فقیہاً فی مصالح الخلق فی	دنیوی امور میں خلق خدا کی مصلحتوں
الدنیا۔ (الغزالی احیاء العلوم ج ۱	کا رمز شناس ہو۔

اللفظ الاول الفقہ)

غیر فقیہ سے اس رسائی اور فنی الہام کی توقع نہیں ہے، جو اسلام اور تغیر پذیر دنیا میں ربط و تعلق پیدا کرنے کے لیے درکار ہے،

فقیہ کے لیے اللہ سے گہرا تعلق بھی ضروری ہے کہ اس راہ کے مسافروں نے ہمیشہ اسی سے قوت و مدد حاصل کی ہے، یہ تعلق صرف ضابطہ کا نہیں بلکہ رابطہ کا ہونا چاہیے، جس کے لیے مقررہ احکام کی بجا آوری کے ساتھ آہ سحرگاہی کا التزام بھی نہایت سود مند ہے،

دیکھتے ہیں اس اہتمام و احتیاط کے باوجود قدم قدم پر شدید مخالفت ہوگی، اگر ایک طبقہ تجددپسندی کا الزام لگائے گا، تو دوسرا چاک گریبانی کا طعنہ دیگا، کسی کو جدید سے گھبراہٹ ہوگی تو کوئی قدیم سے برافروختہ ہوگا، اپنوں کی ناراضی اور بیگانوں کی شماتت کا مقابلہ آسان نہیں ہے، لیکن اس راہ کے مسافروں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے گھبرانا اور پریشان نہ ہونا چاہیئے، بس اللہ کا نام لے کر اور اسی کی تائید و نصرت کے بھروسہ پر کام شروع کر دینا چاہیئے، اور پامردی کے ساتھ اسے جاری رکھنا چاہیئے، اور اگر کوئی اس کے لیے تیار نہیں ہے تو اس سے بس اتنا ہی کہنا ہے کہ :-

جس کو ہو جان و دل عزیز، اسکی گلی میں جائے کیوں

اسی شعور اجتہاد (جس کی تکوین عقل و قلب کے آمیزہ سے ہوتی ہے) کے ذریعہ موجودہ تغیر پذیر دنیا میں ان بنیادوں کی نئی تعبیر و تشریح کرنا ہے جن پر اسلامی تعلیمات کا مدار ہے اور ان نظریات کا جواب تلاش کرنا ہے جنھوں نے ایمان و اعتقاد کی بنیادیں ہلا دی ہیں، اور انسان کی نئی توجیہ پیش کر کے اصول دین تک کو مشکوک بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے فتنۂ ارتداد ہمارے گھروں میں گھس چکا ہے، اور ہم بے بس تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں، اس صورت حال کو بدلنے کے لیے بڑے سلیقہ اور دانشمندی کی ضرورت ہے، اب ہمیں چاہیئے کہ

(۱) انسان کی نفسیاتی توجیہ اس انداز سے کریں کہ اس کی نورانی اصل نمایاں ہوجائے اور (۲) تحت الشعور کے ان مخفی تاروں کی نشاندہی کریں جن کا براہ راست تعلق ایک ذی شعور طاقت سے ہے، اور جنکو چھیڑے بغیر زندگی کے ساز میں سوز نہیں پیدا ہوتا، اور بہت سے نغمے خاموش رہتے ہیں، ہمیں یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ (۳) تحت الشعور میں ایک ذی شعور طاقت سے محبت کی کارفرمائی ہے جو حیات اور روح حیات کا سرچشمہ ہے

ں کے ساتھ (۴) اخلاق و اقدار کی حقیقی و دائمی حیثیت کا جدید انداز میں ثبوت فراہم کرنا،
ز (۵) اس ذریعۂ علم کا جدید انداز میں ثبوت فراہم کرنا ہوگا جس کی رسائی ماورا ئے
سوسات تک ہے، اور یہ بتانا ہوگا کہ (۶) خیر و شر اور طیب و خبیث (؟) کی شناخت
کے لیے ایسے پیمانہ کی ضرورت ہے، جو انسانی جذبات و خواہشات کی گرفت سے آزاد ہو۔

مندرجۂ بالا خیالات کے اثبات کے ساتھ ان نظریات کی تردید بھی ضروری ہے جو
ن کے خلاف ہیں مثلاً

(۱) انسان کی ایسی میکانکی توجیہ جو اس کی نفسی ساخت میں خود شعوری کے وصف
اور ایک ذی شعور طاقت کی کارفرمائی سے انکار کرے، اور نورانی کے بجائے اس کی اصل
مادی و حیوانی قرار دے، (۲) تحت الشعور میں جنسی خواہش یا جذبۂ اقتدار کو
اصل الاصول تسلیم کرے، (۳) اخلاق و اقدار کو اضافی قرار دے کر اسلام کو ایک
سماجی عمل ثابت کرے، (۴) ذرائع علم کو صرف محسوسات تک محدود رکھے اور
ماورائے محسوسات سے انکار کر دے، (۵) اخلاق و اقدار، خیر و شر، طیب و خبیث
کے لیے وہ معیار و پیمانہ تسلیم کرے، جو انسانی جذبات و خواہشات کا ساختہ و
پرداختہ ہے، ان افکار و نظریات کی تردید میں بھی بڑی دانائی اور ہوشمندی سے
کام لینا ہوگا۔

اس نئی تعبیر و تشریح اور تردید و تنقید کے لیے فقیہ کی نظر و صلاحیت درکار ہوگی
لیکن یہ اصطلاحی فقیہ نہیں بلکہ قرآنی فقیہ ہے، جو "حکیم" کے ہم معنی ہے، اور جس کی
مناسبت سے فقہ بھی صدر اول میں علم حقیقت (وہ علم جس میں الٰہیات اللہ کی ذات
و صفات سے بحث ہو) علم طریقت (جس میں نجات دلانے والے اور ہلاکت میں

ڈالنے والے اعمال وافعال سے بحث ہو) اور علم شریعت (جس میں ظاہری احکام ومسائل سے بحث ہو) تینوں کو شامل تھا،

اس فقیہ کے لیے حکمت فرنگی کے ساتھ اس حکمتِ ایمانی سے واقفیت بھی ضروری ہے، جو اسلامی اصول سے والہانہ عقیدت اور اللہ ورسول سے شدید محبت کے سرچشمہ سے پھوٹتی ہے، جس کی طرف اشارہ مولانا رومی نے کیا ہے،

چند خوانی حکمتِ یونانیاں (افرنگیاں) حکمتِ ایمانیان راہم بخوان

تلخیص و تبصرہ

طوفانِ نوح آثار قدیمہ کی روشنی میں

از

منصور نعمانی ندوی رفیق دار المصنفین

کویت کے موقر رسالہ مجلہ العربی کے جنوری کے شمارہ میں آثار قدیمہ کی روشنی میں طوفان نوح کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے، ذیل کی سطور میں اسکا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں برٹش میوزیم کے مسٹر جارج اسمتھ کی نگرانی میں نینوا کے قدیم شہر میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے طوفان نوح کے بارے میں بعض نہایت حیرت انگیز انکشافات منظر عام پر آئے ہیں، اس کھدائی سے برآمد ہونے والے آثار قدیمہ میں چکنی مٹی کی بکثرت ٹوٹی پھوٹی تختیاں ملیں، اور ان کی کندہ عبارتوں کو حل کرنے سے طوفان نوح کے بارے میں اہم حقائق معلوم ہوئے، ان تختیوں میں سب سے اہم وہ تھیں جن پر اس طوفان کا واقعہ کندہ ہے،

یہ تمام تختیاں ساتویں صدی قبل مسیح میں ملک آشور کے فرمانروا اسرنیپال کے کتب خانہ کا بیش قیمت سرمایہ خیال کی جاتی تھیں، جارج اسمتھ کو اس کھدائی میں نینوا کے قدیم محل کے کھنڈروں سے اس کتب خانہ کی تقریباً دو ہزار تختیاں دستیاب ہوئیں ان ہی میں گلگامش کی وہ گرانقدر تختیاں بھی شامل تھیں، جنکے مطالعہ سے شاہ اسرنیپال

کے عہد سے ہزاروں سال قبل کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نظم کا سب سے پہلا ترجمہ اغریقی زبان میں ملتا ہے۔ جسے تقریباً ۲۸۰ قبل مسیح میں بروسس نامی ایک کاہن نے مٹی کی تختیوں پر کیا ہے، لیکن دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے میں نظم گلگامش کے ایک اس سے بھی قدیم ترین نسخہ کا سراغ ملتا ہے جس کی تاریخ انیسویں صدی قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ حاموراپی کے عہد سے ملتی ہے،

نظم گلگامش کے نسخہ حاموراپی اور نسخہ اسرنیبال کے انکشاف سے اس حقیقت میں کسی شک وشبہہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ طوفان نوح ان دونوں بادشاہوں کے عہد سے بہت پہلے واقع ہوا تھا، ان تختیوں پر طوفان نوح کے بارے میں شاہ گلگامش کی جو مشہور نظم کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تاریخ انسانی کے اس بدترین سانحہ سے دوچار ہوئے ان میں شورو پاک کا بادشاہ اوتاناپشتیم بھی شامل تھا، صرف یہی بادشاہ اور اس کا خاندان اس ہمہ گیر سیلاب سے محفوظ رہا، باقی سارا ملک تباہ ہوگیا، گلگامش نے اپنی نظم میں اسی اوتاناپشتیم کی زبانی واقعۂ طوفان کی تفصیلات بیان کی ہیں، اوتاناپشتیم کہتا ہے کہ "میں شوروپاک نام کے ایک شہر میں رہتا تھا، اور ریا دیوتا کے مخلص ترین معتقدوں میں شمار ہوتا تھا، جب دیوتاؤں نے نوع انسانی کی جڑیں کاٹنے کا عزم کرلیا تو معبود ریا نے اپنے بندۂ خاص اوتاناپشتیم کو خطرہ سے خبردار کرتے ہوئے اس طرح خطاب کیا،" اے شوروپاک کے آدمی! اپنے گھروں کو چھوڑ دے اور کشتی بنا، مال ومتاع سے کنارہ کشی اختیار کر، اپنی املاک پھینک دے، زندگی تلاش کر، دنیا کی تمام زندہ اشیاء کے تخم کشتی میں جمع کر۔" چنانچہ کشتی بنائی گئی۔ یہ ایک عجیب وغریب مربع کشتی تھی جس کے طول وعرض اور بلندی سب میں نہایت حسن تناسب پایا جاتا تھا، اس کے بنانے میں لکڑی اور کولتار کا استعمال بہت بڑی تعداد میں کیا گیا تھا۔ اسکے

تختوں کو کونتار سے مضبوطی سے جوڑا گیا تھا، اور یہ وسیع و عریض کشتی سات منزلوں کی تھی اور ہر منزل میں سات کمرے تھے اور ہر کمرہ میں ایک دروازہ اور متعدد روشندان تھے،

اوتناپشتیم اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے گلگامش سے کہتا ہے کہ جب روز روشن پر شب تار نے اپنی دبیز چادریں ڈال دیں تو ہر طرف خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی، میں ماحول کی بتدریج بدلتی ہوئی ہولناکی کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا، یہاں تک کہ طوفان کی تباہ کاریوں کا آغاز ہو گیا، دن بھر خوفناک آندھیاں پہاڑوں اور میدانوں میں زور و شور سے چلتی رہیں، طوفان سے لوگوں کا رشتۂ حیات اس طرح منقطع ہو گیا جیسے وہاں کوئی معرکۂ کارزار گرم ہوا ہو، کوئی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پاتا تھا، چھ شب و روز تیز و تند ہوائیں چلنے اور اہل زمین کے برباد ہونے کا سلسلہ جاری رہا، ساتویں دن کی صبح کو سمندر میں سکون ہوا، ہوائیں رک گئیں، طوفان کم ہو گیا اور پانی گھٹ گیا، میں نے اپنی آنکھیں دریا پر دوڑائیں، سب انسان مٹی میں مل گئے تھے، کھیت نظر آتے تھے نہ جنگل جس وقت میں نے کشتی کا دروازہ کھولا تو روشنی میرے چہرے پر پڑی، میں جھک پڑا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر آہ و بکا کرنے لگا، آنسو میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے، بالآخر کشتی جبل نصر کی چوٹی پر ٹھہر گئی ساتویں دن میں نے ایک کبوتر لیا اور اس کو اڑا دیا، وہ دور تک اڑ کر واپس آ گیا، کیونکہ اس کو بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں مل سکی، پھر میں نے ایک ابابیل لی اور اس کو چھوڑ دیا، وہ بھی کوئی بیٹھنے کی جگہ نہ پاکر کشتی میں لوٹ آئی، پھر میں نے ایک کوے کو اڑا دیا، پانی اس وقت کم ہو چکا تھا، چنانچہ کوا بازو پھڑپھڑاتا اور شور مچاتا اڑ گیا اور واپس نہیں آیا، اس کے بعد میں نے کشتی کے لوگوں کو ہر چہار سمت بھیجا اور کفارہ کے طور پر چڑھاوا چڑھایا۔"

توراۃ میں طوفان کا ذکر نینوا کے کھنڈروں سے برآمد ہونے والی تحقیقوں کے علاوہ توراۃ میں بھی طوفان کا ذکر ملتا ہے، اس میں صراحت سے مذکور ہے کہ حضرت نوحؑ نے خدا وند قدوس کی تعمیل حکم میں ایک کشتی بنائی جس کا طول ۳۰۰ گز، عرض ۵۰ گز اور بلندی ۳۰ گز تھی تقریباً چالیس شب و روز آندھیاں چلتی رہیں، درخت جڑوں سے اکھڑتے رہے اور سیلاب کی تباہ کاریاں جاری رہیں، یہانتک کہ نوحؑ نے کشتی کی کھڑکی کھولدی اور کشتی جبل نصر پر رک گئی،

قرآن اور طوفان نوح تاریخ کے اس عظیم ترین اور حیرت انگیز واقعہ پر قرآن نے اپنی مخصوص شان بلاغت اور حسین پیرایہ بیان میں بہت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، چنانچہ سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے:-

واوحی الی نوح انہ لن یومن	اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ تمھاری قوم
من قومك الا من قد آمن	میں جو لوگ ایمان لاچکے ان کے سوا اور کوئی
فلا تبتئس بما کانوا یفعلون	ایمان نہ لائیگا، تو جو کام یہ کر رہے ہیں انکی
واصنع الفلك باعیننا ووحینا	وجہ سے غم نہ کھاؤ، اور ایک کشتی ہمارے حکم
ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا	سے ہمارے روبرو بناؤ، اور جو لوگ ظالم ہیں
انھم مغرقون ویصنع الفلك	ان کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا وہ ضرور
وکلما مر علیہ ملأ من قومہ	غرق کردیے جائیں گے، تو انوح نے کشتی
سخروا منہ قال ان تسخروا منا	بنانا شروع کردی، اور جب انکی قوم کے
فانا نسخر منکم کما تسخرون	سردار انکے پاس سے گزرتے تو ان سے تمسخر کرتے،
فسوف تعلمون من یاتیہ	وہ کہتے کہ اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو اسی طرح

عذاب یخزیه ویحل علیه
عذاب مقیم حتی اذا جاء
امرنا وفار التنور قلنا
احمل فیها من کل زوجین
اثنین واهلک الا من سبق
علیه القول ومن آمن
وما آمن معه الا قلیل
وقال ارکبوا فیها بسم الله
مجریها ومرسها ان ربی
لغفور رحیم وهی تجری بهم
فی موج کالجبال ونادی
نوح ابنه وکان فی معزل
یا بنی ارکب معنا ولا تکن
مع الکفرین، قال ساوی
الی جبل یعصمنی من الماء
قال لا عاصم الیوم من امر
الله الا من رحم وحال بینهما
الموج فکان من المغرقین
وقیل یارض ابلعی ماءک

(ایک وقت) ہم بھی تم سے تمسخر
کریں گے، اور تمکو جلد معلوم ہو جائیگا کہ
کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا
کرے گا، اور کس پر ہمیشہ کا
عذاب نازل ہوتا ہے، یہانتک کہ جب ہمارا
حکم آ پہنچا اور تنور جوش مارنے لگا، تو ہم نے
(نوح کو) حکم دیا کہ ہر قسم (کے جانداروں) میں سے
ایک ایک جوڑا (نر و مادہ) لے لو اور جس شخص کی
نسبت ہو چکا ہے (کہ ہلاک ہو جائیگا) اسکو
چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو اور جو لوگ ایمان لائے
ہوں انکو کشتی میں سوار کر لو اور انکے ساتھ
ایمان بہت ہی کم لوگ لائے تھے (نوح نے)
کہا کہ خدا کے نام سے ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا،
اس میں سوار ہو جاؤ، میرا پروردگار بخشنے والا
مہربان ہے، اور وہ انکو لیکر پہاڑوں جیسی لہروں
میں چلنے لگی، اس وقت نوح نے اپنے بیٹے کو کہ (کشتی
سے) الگ تھا پکارا کہ بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ
اور کافروں میں شامل نہ ہو، اس نے کہا کہ میں (ابھی)
پہاڑ سے جا لگونگا وہ مجھے پانی سے بچا لیگا، انھوں

ويسماء اقلعي وغيض الماء	نے کہا کہ آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں
وقضي الامر واستوت على	مگر جس پر خدا رحم کرے اتنے میں دونوں کے
الجودي وقيل بعدا	درمیان لہر آحائل ہوئی اور وہ ڈوب کے رہ گیا
للقوم الظٰلمين	اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے
	آسمان تھم جا۔ تو پانی خشک ہو گیا اور کام تمام
	کر دیا گیا اور کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری،
(سورہ ہود)	اور کہہ دیا گیا کہ ظالموں پر لعنت،

ایک خیال | قرآن اور دوسری کتب مقدسہ میں طوفان کی جو تفصیلات مذکور ہیں، اسکے سلسلہ میں ولیم وسٹن وغیرہ بعض یورپی محققین کی رائے ہے کہ یہ روئے زمین پر ۲۳۶۹ سنہ یا ۲۳۴۹ سنہ قبل مسیح میں ایک حادثۂ آسمانی کے طور پر واقع ہوا تھا۔ انکے نظریہ کے مطابق اس وقت ایک دم دار ستارہ کرۂ ارضی کے قریب سے گزر گیا تھا، جس کی کشش ثقل کے باعث کرۂ ارض بیضۂ مرغ کی شکل اختیار کر گیا، اور پھر سطح زمین پھوٹ گئی اور اسکے اندر سے پانی پھوٹ پڑا جو کرۂ ارض کے اوپر بہنے والے پانی سے مل کر ایک خوفناک طوفان بن گیا،

ایک سوال | اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سطور بالا میں ہزاروں سال قبل کے جس طوفان کے واقعات مذکور ہوئے ہیں وہ کسی مخصوص اور معین طوفان سے متعلق ہیں یا انکا تعلق ان بکثرت سیلابوں سے ہے جو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں وقتاً فوقتاً آتے رہے ہیں،

اس سلسلہ میں محققین کی رائے یہ ہے کہ گو مختلف مصادر میں یہ حادثہ مختلف طریقوں سے مذکور ہے، لیکن چونکہ تمام روایات یکساں ہیں اس لیے ان کا ایک ہی طوفان سے متعلق ہونا قرین قیاس ہے اور وہ بلاشبہ طوفان نوح ہی ہے خواہ جزوی طور پر نام اور طرز بیان مختلف کیوں نہ ہوں۔

مطبوعات جدیدہ

مولانا انور شاہ کشمیریؒ۔ مرتبہ ڈاکٹر قاری محمد رضوان اللہ صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ و طباعت اچھی، کتابت خراب، صفحات ۴۰۴، مجلد مع گرد پوش قیمت ۲عہ ناشر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

علمائے ہند میں مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم کا درجہ بہت بلند ہے، ان پر اردو و عربی میں بعض کتابیں پہلے لکھی جا چکی ہیں، یہ نئی کتاب دراصل وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو مسلم یونیورسٹی نے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری دی ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں شاہ صاحب کے وطن، خاندان، پیدائش، تعلیم و تدریس، اخلاق و عادات، قومی و سیاسی خیالات، فارسی و عربی کلام کے نمونے، وفات، اولاد و اعزہ اور زندہ تلامذہ کی فہرست دی گئی ہے، دوسرے حصہ میں پہلے بالترتیب حدیث، تفسیر اور فقہ میں شاہ صاحب کے امتیازات دکھائے گئے ہیں اور آخر میں تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، مصنف نے حدیث، تفسیر اور فقہ کے بعض مسائل و مباحث کے متعلق شاہ صاحب کی خاص تحقیقات اور نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے قدیم ائمۂ فن کے اقوال بھی تحریر کیے ہیں، مصنف نے مقدور بھر کتاب محنت سے لکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن شاہ صاحب جیسی عظیم المرتبت اور صاحب علم و کمال ہستی کی سوانحعمری بڑی وسعت نظر اور گہری عالمانہ بصیرت کی طالب تھی، یہ کام مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے کرنے کا تھا، نوجوان مصنف کی بساط سے باہر ہے، تصنیف کے میدان میں ابھی انھوں نے قدم رکھا ہے،

اس لیے ترتیب میں ناہمواری اور سلیقہ کی کمی پائی جاتی ہے بعض مواقع پر تعبیر و طرز ادا کی خامی کی وجہ سے مطلب خبط ہوگیا ہے، عبارت میں الجھاؤ اور جھلے بے ربط ہیں، زبان و بیان کی خرابی کے علاوہ جابجا علمی و تاریخی غلطیاں بھی نمایاں ہیں، مثلاً ایک جگہ لکھا ہے "امام شافعی ترمذی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں" (ص ۱۴۷) حالانکہ امام شافعی کا زمانہ امام ترمذی سے بہت پہلے ہے، ایک جگہ شاہ صاحب کی کتاب "العرف الشذی" کے حوالہ سے لکھتے ہیں "امام طحاوی صرف مذہب حنفی کے ہی عالم نہیں بلکہ مذاہب اربعہ کے بھی امام ہیں، انھیں امام شافعی، امام مالک اور امام اعظم سے براہ راست تلمذ کا شرف حاصل ہے"، حالانکہ امام ابوحنیفہ و امام مالک تو درکنار امام شافعی کا زمانہ بھی امام طحاوی کو نہیں ملا تھا، وہ ان کے شاگرد مزنی کے شاگرد تھے، طحاوی ائمہ احناف میں ضرور شمار ہوتے ہیں لیکن ان کا مذاہب اربعہ کا امام ہونا بڑی مضحکہ خیز بات ہے، شاہ صاحب ایسی بات ہرگز نہیں لکھ سکتے، مصنف نے یقیناً ان کا مطلب سمجھنے میں غلطی کی ہے، کہیں کہیں مصنف کے بیان میں تضاد بھی ہوگیا ہے، مثلاً ص ۱۹۹ پر لکھتے ہیں "صحابہ کرام کی بڑی تعداد عدم رفع یدین کی روایت کرتی ہے"، مگر ص ۲۰۰ پر لکھتے ہیں "عبداللہ بن مسعودؓ عدم رفع یدین کے قائل ہیں ورنہ صحابہ کرام کی ایک بہت بڑی تعداد رفع یدین کی قائل ہے"، آگے پھر یہی لکھا ہے، کتاب میں جابجا حشو و زوائد اور تکرار بھی ہے اور زبان و بیان کی بہت سی غلطیاں ہیں، عربی و فارسی عبارتوں کے ترجمے نہیں دیے گئے ہیں، حوالے کے نمبر غلط اور بے ترتیب ہوگئے ہیں کہیں کہیں حوالہ موجود ہے، مگر نمبر نہیں، اور کہیں نمبر ہے تو حوالہ ندارد، معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کے مشیر و نگراں اور ممتحن زیادہ توجہ نہیں کرسکے، ورنہ ایسی خامیاں نہ ہوتیں اور شاہ صاحب کی ایک اچھی سوانح عمری تیار ہو جاتی،

روداد چمن - مرتبہ مولانا محمد الحسنی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب، صفحات ۲۹۲ مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت ۱۵ روپے، پتہ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ۔

ندوۃ العلماء کی ابتدا ایک علمی، دینی، تعلیمی اور اصلاحی تحریک کی حیثیت سے ہوئی تھی، اسی کے ماتحت لکھنؤ میں ایک دار العلوم کا قیام عمل میں آیا تھا، شروع میں اس عظیم الشان تحریک کے پیغام و مقاصد کے تعارف و اشاعت کے لیے اس کے سالانہ جلسے بڑے اہتمام سے ملک کے مختلف شہروں میں منعقد ہوتے رہے، اور ان میں قدیم علماء، جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور ہر طبقۂ فکر و خیال کے مشاہیر و اعیان شریک ہوتے رہے لیکن ۱۹۲۷ء کے بعد حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے دور نظامت میں جب ندوہ کی تحریک میں نئی زندگی پیدا ہوئی تو ان اجتماعات کا بھی خیال آیا، چنانچہ ۱۷ر اکتوبر سے ۳ر نومبر ۱۹۷۵ء تک شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود کی صدارت میں ندوہ کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن دار العلوم کی عمارت میں بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا، اس میں اسلامی و عربی ملکوں کے بکثرت مندوبین کے علاوہ ہندوستان کے ہر طبقۂ مسلک کے علماء و زعما، ماہرین تعلیم، قدیم و جدید ملی و دینی درسگاہوں کے فضلا اور ذمہ دار حضرات بڑی تعداد میں شریک تھے اور اس میں ندوہ کے اصلاحی و تعلیمی نظریات کے علاوہ موجودہ بہت سے اہم مسائل پر تقریریں ہوئیں اور مضامین پڑھے گئے، زیر نظر کتاب میں ندوہ کے اسی پچاسی سالہ جشن کی مفصل روداد بڑے دلچسپ اور پُر اثر انداز میں قلمبند کی گئی ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ حالات اس طرح بیان کیے جائیں کہ نہ دیکھنے والوں کے سامنے بھی ان کی تصویر آجائے، مرتب نے اس اجلاس کے اہم خطبوں، مقالات اور تجویزوں کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے، اس طرح مولانا ابو الحسن علی کا پُر اثر خطبۂ استقبالیہ، فاضلانہ مضمون "اسلامی ملکوں میں نظامِ تعلیم کی اہمیت" ان کی دوسری پُر اثر تقریریں، شیخ الازہر کا خطبۂ صدارت، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی کی تاریخی رپورٹ اور جشن کے سلسلہ میں موصول ہونے والے اہم پیغامات اور خطوط تمام چیزیں سلیقے سے جمع کر دی گئی ہیں، اس لیے اس کی حیثیت ایک یادگار

دستاویز کی ہوگئی ہے، اس سے جشن کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور جو لوگ اجلاس میں شریک تھے، اور جو نہیں شریک تھے، دونوں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوسکتے ہیں،

" ض "

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" " "
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	صباح الدین عبدالرحمن، عبدالسلام قدوائی ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" " "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

سید اقبال احمد

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی، تحقیقی، ادبی، تنقیدی، تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت، تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

۱۔ مہاجرین جلد دوم — قیمت: ۱۲-۹

۲۔ سیر الصحابہ جلد ۶ — " ۹-۴

امام حسین کے حالاتِ زندگی کے ضمن میں واقعۂ حزنیۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳۔ سیر الصحابہ جلد ۷،

۴۔ تابعین: ۹۹، اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۱۲-۵۰

۵۔ تاریخ اسلام اول (عہدِ رسالت، خلافتِ راشدہ)

قیمت: ۱۲-۵۰

۶۔ تاریخ اسلام دوم (خلافتِ بنی امیہ) ۱۱-۰۰

۷۔ تاریخ اسلام سوم (خلافتِ عباسیہ اول)

قیمت: ۱۴-۰۰

۸۔ تاریخِ اسلام چہارم (خلافتِ عباسیہ دوم)

قیمت: ۱۵-۰۰

۹۔ اسلام اور عربی تمدن — قیمت ۱۵.۷۵

۱۰۔ عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱۔ ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲۔ دینِ رحمت — قیمت: ۱۰-۰۰

۱۳۔ خریطۂ جواہر — ۴-۷۵

زندگی کی آخری کتاب

۱۴۔ حیاتِ سلیمان: یعنی جانشینِ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلاویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرزِ انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیاتِ شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ، قابلِ مطالعہ، اس میں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آ گئی ہے، قیمت: ۲۷-۵۰

رجسٹرڈ نمبر ل ۵۲۰ — اپریل سنہ ۱۹۷۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن — عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۰ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۷ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

اس وقت ملک میں ایک اہم سیاسی تبدیلی آگئی ہے، مرکزی حکومت پر نیشنل کانگریس پارٹی کا اقتدار تیس سال تک رہا لیکن گذشتہ مہینہ کے عام انتخاب میں اس کو ایسی بری طرح شکست ہوئی کہ بڑے سے بڑے سیاسی پنڈتوں کو بھی اس کی توقع نہ تھی ؎

جوشِ جنوں سے کچھ نہ چلی ضبط عشق کی سو سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا

گیارہ سال کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں مسز اندرا گاندھی کی فہم، ادراک، قوت فیصلہ، پارلیمانی خطابت، پاکستان سے محاذ آرائی، بین الاقوامی حکمت عملی، عوام سے رابطہ رکھنے میں طوفانی دورہ، مرکز سے گریز یا تحریکوں کے خلاف جرأت مندانہ اقدام، تجارت، زراعت، صنعت، حرفت، ہر آلات کے فروغ، جنگی اسلحہ کی غیر معمولی پیداوار اور ایٹم بم برائے امن کے دھماکے کے کامیاب تجربہ وغیرہ کی دھوم رہی اور شہرت ہوئی کہ وہ اپنے نامور باپ سے بھی آگے بڑھ گئیں، اقبال انکے گھر کے دروازہ پر دستک دیتا رہا، کامرانی انکے قدموں کو چومتی رہی، بڑے بڑے صاحب ادعا رہنما انکے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہے، اپنے زریں کارناموں کی وجہ سے چاندی میں تولی گئیں اور درگا دیوی کہلائیں۔

مگر اچانک الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج کا فیصلہ انکے خلاف ہوا تو انھوں نے ملک میں ایمرجنسی کا اعلان کر دیا، اسکے نفاذ میں انکو بعض ایسے اقدام کرنے پڑے جس سے انکی ہر دلعزیزی خوف میں تبدیل ہو گئی، پھر بھی اقبال انکا ہمرکاب رہا، ضروری اشیا کی بڑھتی ہوئی قیمتیں قابو میں آگئیں، فرقہ وارانہ فسادات رک گئے، اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم بہتر سے بہتر ہونے لگی، سرکاری دفتروں کی کارکردگی بڑھ گئی، کارخانوں میں ہڑتال بند ہو گئی، پیداوار بڑھنے لگی، غلہ میں ملک خود کفیل بھی ہو گیا، انیس (۱۹) مہینے میں چند ہنگاموں کے علاوہ امن رہا۔

جب انھوں نے یکایک لوک سبھا کے انتخاب کا اعلان کیا تو انکے آفتاب اقبال میں گہن لگ گیا، ہر طرف شور بلند ہوا کہ انکی حکومت آمرانہ ہے، انھوں نے جابرانہ انداز میں ایمرجنسی کا نفاذ کر دیا، ظالمانہ طریقہ سے ہزاروں آدمیوں کو جیل بھجوا دیا، قاہرانہ طور پر عدلیہ اور اخباروں کی آزادی پر پابندی لگائی، اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی خاطر دستور میں ترمیم کرائی، خاندانی منصوبہ بندی کی غیر انسانی مہم چلا کر گھر لو مسرت

کو برباد کیا، اپنے لڑکے کو سیاست میں لاکر حکومت کو موروثی بنانا چاہا، مسلم یونیورسٹی کو اسکے اقلیتی کردار سے محروم کردیا، مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت کی کوشش کی، وغیرہ وغیرہ۔ انکے خلاف سڑکوں اور گلیوں میں ایسے نعرے بلند ہونے لگے کہ انکو سنکر حیا کی گردنیں اور شرم کی آنکھیں جھکنے لگیں، انھوں نے اپنی مدافعت میں ملک کا طوفانی دورہ کیا، مگر لوگوں کا غیظ و غضب کم ہونے کے بجائے اتنا بڑھا کہ دس سال کی ڈرامائی سیاست کی ہیروئن اور لوگوں کے تخیل کی درگا دیوی کا اقبال انکی کانگریس پارٹی کے ساتھ بیاس، راوی، جمنا، گنگا اور خلیج بنگال میں غرق آب ہوگیا،

عوام کے اس فیصلے سے ملک کی اکثریت خوش نظر آتی ہے، مگر مورخ کے لیے ایک اہم موضوع رہیگا کہ شیرنی کا کلیجہ رکھنے والی، شاہین کی طرح جھپٹنے والی اور ہرنی کی طرح چوکڑی بھرنے والی اس خاتون نے وزارت عظمیٰ کے فرائض کس طرح انجام دیے، اور وہی ناقدانہ تجزیہ کرسکیں گے کہ انکی کارگذاریاں انکی کوتاہیوں کے نیچے دب کر رہ جائیں گی، یا ان کی کوتاہیاں ان کی کارگذاریوں کے مقابلہ میں نظرانداز ہوجائیں گی،

تاریخی شخصیتوں کے لیے ناکامیوں کے المناک حوادث کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہوتے، لوئی شانزدہم، نپولین اعظم، بسمارک، لائڈ جارج اور ونسٹن چرچل کی سیاسی زندگی میں بہت سی محرومیاں رہیں مگر تاریخ انکے کارناموں سے بھری ہوئی ہے، مولانا محمد علی کو زندگی بھر ناکامیوں سے سابقہ رہا، مگر انکا نپولین کا ایسا دل، برک کی ایسی زبان اور میکالے کا ایسا قلم برابر یاد کیا جاتا رہیگا، گاندھی جی جب ہندوستان کے باپو قرار دیے گئے تو انکو گولی کا نشانہ بنایا گیا، ہمالیہ اور تاج محل کے ساتھ پنڈت جواہر لال بھی دنیا کے عجائب روزگار میں شمار کیے جاتے تھے چین کی لڑائی میں شکست کھا گئے، مگر تاریخ میں انکی عظمت برقرار رہیگی، اسی طرح اندرا گاندھی اپنی کامیاب اور کامران زندگی کے بعد موجودہ انتخاب میں شکست کھا گئیں، انکے ساتھ کانگریس پارٹی کو بھی ہزیمت ہوئی، اسکے پیچھے ۹۰ سال کی جو تابناک تاریخ ہے وہ ہمیشہ زریں حروف سے لکھی جائیگی، مگر دونوں کی پسپائی میں ہندوستان کیلیے یہ سیاسی پیام ہے کہ مفاد پرست اور ناعاقبت اندیش مشیروں کی رائے سے غیر محتاط، غیر مآل اندیشانہ، عاجلانہ اور جابرانہ اقدام کرنے سے سیاست اور تاریخ کا رخ بدل جاتا ہے۔

جے پرکاش نرائن موجودہ سیاسی تبدیلی کے ہیرو ہیں، وہ شروع سے ہندوستان کیلیے برطانوی طرز کی پارلیمانی جمہوریت کو ناپسند کرتے رہے ہیں، مگر اسکا نعم البدل تجویز نہ کرسکے، کبھی دو پارٹیوں اور کبھی پارٹیوں کے بغیر والی جمہوریت کو اچھا کہتے، موجودہ سیاسی رجحان دو پارٹیوں کی جمہوریت کا ہے، جو خدا کرے ملک کے لیے مبارک شگون ہو، مگر کانگریس اور جنتا پارٹی میں فرق یہ ہے کہ کانگریس کی آئیڈیالوجی برسوں کے سیاسی تجربے

۱۰ اپریل ۷۸ء

بعد مرتب ہوئی تھی جنتا پارٹی مختلف [illegible] جماعتوں سے مل کر بنی ہے جن کے [illegible]
نفرت اور دشمنی کی بنیاد پر بنی [illegible] والی جماعتوں کا مستقبل بہت یقینی نہیں [illegible]
جب سے جمہوریت کا تجربہ [illegible] میں پیدا ہوا ہے اس وقت سے اب تک جمہوری حکومتوں کی کامیابی غیر یقینی سمجھی جاتی ہے لارڈ
اٹلی نے زیادہ سے زیادہ آزاد میموریل لکچر میں کہا تھا کہ ۱۹۱۱ء تک برطانیہ کی پارلیمانی جمہوریت کا کامیاب ہونا یقینی نہیں
سمجھا جاتا تھا، ارسطو کا خیال ہے کہ جمہوریت معاشی حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، وہ عوام کی جمہوریت کو اکسٹریم
ڈیموکریسی کہتا ہے، اسکی رائے کے مطابق اس میں ڈیماگوگس (شورش پسند خطیب) زیادہ پیدا ہوتے ہیں جنکو اپنے عوام
کی مرضی کا خیال زیادہ رکھنا پڑتا ہے، اسکے بعد نظم و نسق کا اچھا ہونا، اور قانون کے احترام کا باقی رہنا ضروری نہیں
نفسیاتی طور پر عوام کے نزدیک مہمل سے مہمل اعتراضات اور انکے مہمل ترین جوابات بھی قابل قبول ہوتے ہیں، عوامی
لہر میں عالی دماغ افراد کے بھی قوائے عقلی اندھ پڑ جاتے ہیں، ایک فرانسیسی فلسفی کا خیال ہے کہ ارسطو اسی وقت تک ارسطو ہے
جب تک ایک مصنف کی حیثیت سے حجرہ نشین ہے، جب وہ کسی جماعت کا رکن بنجاتا ہے تو منجملہ دیگر احمقوں کے ایک احمق
وہ بھی ہے، عوام میں سیاسی شعور کی پختگی نہ ہونے کی وجہ سے ہیجان پسندی، اشتعال پذیری اور تلون مزاجی ہوتی ہے، اسلئے
عوامی جمہوریت میں ارسطو کے خیال کے مطابق یہ خطرہ بھی رہتا ہے کہ احمق عاقل اور عاقل احمق بنجائیں،
اچھی جمہوریت یہ ہے کہ موثر قیادت عوامی جذبات کا صحیح ازالہ کرتی رہے،

ہندوستان میں یہ اپنی خامیوں اور مشکلوں کے باوجود اس لئے چلتی رہی کہ کانگرس کی حکومتیں
اس کی شاندار روایت اور طاقتور تنظیم کی بدولت مرکز اور ریاستوں میں قائم ہوتی رہیں، ان میں بڑی ہم آہنگی
رہی، ملک کی جمہوریت کا وہ دور بہت ہی تشویشناک ہوگا جب مرکز اور ریاستوں میں مختلف نصب العین کی
پارٹیوں کی حکومتیں ہوں گی، عوام نے ریاستوں میں کانگریسی حکومتوں کے مقابلہ میں مرکز میں جنتا پارٹی کو
برسر اقتدار لاکر ایک بڑا سیاسی تجربہ کیا ہے، دعا ہے کہ یہ کامیاب ہو، مسلمانوں کی اکثریت نے جس جوش و خروش
کے ساتھ جنتا پارٹی کو کامیاب بنایا ہے، اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار
بحال ہو، مسلمانوں کے پرسنل لا میں حکومت کی مداخلت نہ ہو، ان کی آبادی کے لحاظ سے ان کو ملازمتیں ملیں،
اردو کو جائز مقام حاصل ہو، امید کہ جنتا پارٹی ان کو مایوس نہ کرے گی،

مقالات

اسلام میں مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۳)

اشاعت اسلام[۱] اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو کارل مارکس اور لینن نے کمیونزم کی تبلیغ میں اختیار کیا، اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت تھی کہ دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہئے، جو چاہے ایمان لائے، جو چاہے کفر اختیار کرے، اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ آپ کا کام صرف خدا کا پیام پہنچا دینا تھا، اگر لوگ اس سے روگردانی کریں تو اس کی ذمہ داری ان پر ہی، آپ پر نہیں، لیکن آپ کو یہ بھی ہدایت دی گئی تھی کہ غافلوں کو ہشیار کریں، تمام انسانوں کو رب العٰلمین کی خوشخبری سنائیں، اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں، مگر اس کے لیے دانشمندا

---

[۱] اس مقالہ کی پہلی اشاعت میں ذکر کیا گیا تھا کہ یہ پاکستان کی بین الاقوامی سیرت کانگریس میں پیش ہوا تھا، جو محدود وقت کے لحاظ سے مختصر طریقہ پر لکھا گیا تھا، اس کی پہلی اور دوسری قسطیں پڑھ کر معارف کے بعض ناظرین کا تقاضا ہوا کہ یہ سلسلہ جاری رکھا جائے، اسلئے مذکورۂ بالا کانگریس کے مقالہ میں جو باتیں اجمالی طور پر لکھی گئی تھی، اب تفصیل کے ساتھ بیان کیجا رہی ہے، اگر معارف کے ناظرین کو یہ سلسلہ پسند آیا تو آیندہ بھی جاری رکھا جائیگا،

اور پسندیدہ طریقہ اپنائیں، اسی ہدایت کے مطابق آپ نے ربانی پیامات کی خوشخبری سنانے اور غافلوں کو ہشیار کرنے کیلئے مختلف جگہوں پر تبلیغی مشن بھیجے، مثلاً حضرت مالکؓ بن مرارہ الرہاوی کو ذی خیوان، حضرت احنفؓ بن قیس کو قبیلہ بنو لیث، حضرت محیصہ بنؓ مسعود کو اہل فدک، حضرت مسعودؓ بن وائل کو خود ان کے قبیلہ، حضرت عمروؓ بن العاص کو ان کے ننہالی قبیلہ بلی، حضرت مالکؓ ابن احمر کو ان کی اپنی قوم، حضرت علاءؓ بن عبید اللہ الحضرمی کو بحرین، حضرت وبرؓ بن یحنس کو یمن، حضرت خالد بنؓ ولید کو بنو حذیفہ اور خود حضرت علیؓ کو بنو حذیفہ کے علاوہ یمن اسلام کا پیام لے کر بھیجا، (اسوۂ صحابہ جلد ۲ ص ۱۰۹ - ۱۵۰ بحوالہ اسد الغابہ)۔ وہاں کے لوگ ان صحابہؓ کرام کے وعظ و پند، ارشاد و ہدایت، حسن سلوک، سیرت و کردار کی بلندی اور پاکیزگی کے بلند نمونے دیکھکر مشرف بہ اسلام ہوتے گئے، انکو تلوار اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوئی، مگر جب جمہوریت اور کمیونزم کے فروغ کے لیے ہر قسم کی جارحانہ اور متشددانہ کارروائیاں کیجاسکتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے پیام رحمت کے ذریعہ سے انسانیت کو سنوارنے کے لیے اگر تلوار بھی اٹھائی جاتی تو آج کے لوگوں کی نظروں میں تعجب خیز ہونی چاہیے، آپ نے جب اسلام کی تبلیغ شروع کی تو گھر کے صرف چند افراد آپکے ساتھ تھے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی تائید کے علاوہ آپ کا سب سے بڑا سہارا آپ کا اعلیٰ انسانی کردار تھا، بعثت سے پہلے آپ نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ زندگی بھی گذاری، تجارت بھی کی، دوست و دشمن سے تعلقات بھی رکھے، مال و دولت سے بھی واسطہ رکھا، ہر حال میں اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے ہموطنوں کی نظروں میں پاکیزہ اور ارفع دکھائی دیے، جب نبوت ملی تو آپ کی زندگی جو خلوت میں رہی یا جلوت میں نظر آئی، یا جب حقوق اللہ کی خاطر مسجد میں دیکھے گئے، یا جب حقوق العباد ادا کیے، یا جب میدان جہاد میں متحرک ہوئے یا جب دشمنوں سے صلح کی، تو ان تمام مشاغل کی جزوی تفصیلات آج سب کے سامنے ہیں، ان میں آپ کے حسن اخلاق، حسن معاملہ، حسن سلوک، عدل، انصاف، عدم تشدد، مساوات،

تواضع، راست گفتاری، ایفائے عہد، زہد، ورع، عفو، حلم، دشمنوں سے رواداری، درگذر، لطف طبع، محبت عام اور رقیق القلبی کے جو نمونے ملتے ہیں انکا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کی زندگی کو ایک آئیڈیل زندگی کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، بیوی سے کیسے پیار اور محبت سے ملنا چاہیئے، بچوں سے شفقت کیسے کیجاتی ہے، بھائیوں سے کیا برتاؤ ہو، عزیز و اقارب کے حقوق ادا کرنے میں کیا کیا چیزیں لازمی ہیں، غریبوں اور مسکینوں کی مدد کس طرح کیجا سکتی ہے، بیماروں کی تیمارداری اور عیادت کس طرح ہو، دولت کا بہترین مصرف کیا ہے، حاکمیت و محکومیت کے کیا فرائض وحقوق ہیں، فرمانروائی کے کیا لوازم ہیں، حیوانات پر رحم کرنا کتنا ضروری ہے، انسانی ضروریات اور حالات کے ساتھ زندگی کیسی ہونی چاہیئے، ان سب کے اعلیٰ نمونے آپ کی حیات طیبہ میں ملتے ہیں جو آپ کے معاصروں اور ہم چشموں کے جسم و روح، ظاہر و باطن، قول و عمل اور زبان و دل کے لیے آئینہ خانہ بنا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اپنی نبوت کی زندگی تو گھر کے چند افراد کے ساتھ شروع کی تھی، لیکن جب آپ نے اپنے آخری حج کے موقع پر اپنا خطبہ دیا تو تقریباً ایک لاکھ جان نثار آپ کے ساتھ تھے، دلوں کی یہ تسخیر ان ایجابی نیکیوں کی بدولت ممکن ہو سکی جو زندگی کو اخلاق طاہرہ اور اوصاف عالیہ سے معمور کرتی ہیں، آپ نے اعلان کر رکھا تھا کہ خلوت میں مجھ میں جو کچھ دیکھو وہ جلوت میں سب سے برملا بیان کر دو اور جو رات کی تاریکی میں دیکھو وہ دن کی روشنی میں ظاہر کرو، جو بند کوٹھریوں میں دیکھو اس کو کھلی چھتوں پر پکار کر کہدو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے پیغام نے آپ کے پیرووں میں وہ نشہ پیدا کر دیا تھا جس کو بقول گاڈ فری ہیگنس حضرت عیسیٰ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے سود ہے، اسی کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھا دیا گیا تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا دینی نشہ جاتا رہا، اور وہ اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے، اس کے برعکس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر

لوگ جمع ہوئے اور آپ کی مدافعت میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کر دیا (ابالوجی فار محمد اردو ترجمہ ص ۹۶-۹۷، خطبات مدراس ص ۸۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووں کی جان نثاری

حضرت عیسیٰ کے حواری تو ان کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثاروں نے آپ کی خاطر جو سر فروشی کا ثبوت دیا اس کی مثال کسی اور مذہب کی تاریخ میں نہیں ملے گی، جنگ احد میں جب یہ غلط خبر پھیل گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی تو حضرت علیؓ بے تاب ہو کر اپنی تلوار سے دشمنوں کی صف الٹنے میں مشغول ہو گئے کہ وہ آپ کے جسد مبارک تک پہنچ جائیں، حضرت انسؓ کے چچا ابن نضرؓ بھی آگے بڑھے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ مایوس کھڑے ہیں، حضرت ابن نضرؓ کو دیکھ کر بولے اب لڑ کر کیا کریں، رسول اللہ نے تو شہادت پائی، حضرت ابن نضرؓ نے کہا تو آپ کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے، پھر لڑ کر شہادت پائی، یکایک حضرت کعبؓ کی نظر رسول اللہ پر پڑی، وہ چلا اٹھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی زندہ ہیں، پھر تو شمع رسالت کے پروانوں کا ہجوم ہوا، حضرت علیؓ کی تلوار فضا میں بجلی کی طرح کوندنے لگی، زیادؓ بن سکن نے پانچ انصاریوں کے ساتھ لڑ کر اپنے محبوب آقا کے گرد جانیں دیں، ایک صحابی بول اٹھے، رسول اللہ اگر میں مارا گیا تو میں کہاں ہوں گا۔ آپ نے فرمایا "جنت میں"، یہ سنتے ہی بیخود ہو کر اس طرح لڑے کہ شہید ہوئے۔ دشمنوں نے گھیر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر برسائے۔ ان کی تلواروں سے بھی وار جاری تھا، ایک وار آپ کے چہرۂ مبارک پر بھی پڑا، مغفر کی دو کڑیاں آپ کے چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں، حضرت ابو دجانہؓ آگے بڑھے، جھک کر آپ کے سپر بن گئے، ان کی پیٹھ دشمن کے تیروں کا ہدف بن گئی، تلواروں کا وار حضرت طلحہؓ نے اپنے ہاتھوں پر روکا تو ان کا ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا، رسول اللہ کی زبان مبارک سے صرف اتنی صدا بلند ہوئی اے خدا میری قوم کو بخش دے، وہ جانتے نہیں، حضرت ابو طلحہؓ نے آپ کی مدافعت میں تیر برسانے

شروع کیے تو ان کی دو تین کمانیں ٹوٹ کر رہ گئیں، انھوں نے اپنے سپر سے آپ کے چہرۂ مبارک کو اوٹ کر لیا، آپ گردن اٹھا کر کچھ دیکھنا چاہتے تو حضرت ابو طلحہؓ کہتے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے، آپ کے دشمنوں کے تیر کے لیے یہ میرا سینہ ہے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بھی آپ کی مدافعت کیلئے قدر اندازی کے لیے آگے بڑھے، دشمنوں کے نرغہ سے نکال کر آپ کے جان نثار آپ کو ایک پہاڑی کی چوٹی پر لے گئے، قریش کے سردار ابو سفیان نے تعاقب کیا، مگر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ نے اسکو آگے بڑھنے نہ دیا، پھر بھی اس نے حضرت عمرؓ کو للکارا، کوئی جواب نہیں ملا تو بولا "سب مارے گئے" حضرت عمرؓ بول اٹھے او دشمن خدا ہم سب زندہ ہیں، ابو سفیان نے اپنے بت کا نام لے کر کہا اے ہبل تو اونچا رہ، صحابہ نے آپ کے حکم سے کہا خدا اونچا اور بڑا ہے، ابو سفیان نے کہا ہمارے پاس عزیٰ ہے، تمھارے پاس نہیں، صحابہ نے جواب دیا، خدا ہمارا آقا ہے اور تمھارا کوئی آقا نہیں، خواتین بھی اس جنگ میں شریک رہیں، حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ کی ماں حضرت ام سلیمؓ زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، جب دشمنوں نے رسول اللہ کو گھیر لیا تھا تو حضرت ام عمارہؓ آپ کے لیے سینہ سپر ہو گئیں اور تیر اور تلوار سے دشمنوں کا مقابلہ کیا، حضرت حمزہؓ اس جنگ میں شہید ہوئے، ان کی بہن نے میدان جنگ میں جب ان کی لاش دیکھی تو بولیں خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں، ایک انصاریہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس جنگ میں شہید ہوئے، مگر جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ دیکھا تو بول اٹھی "آپ کے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں"۔ (ماخوذ از سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۸۰-۳۸۵)

یہ جان نثاری اور سرفروشی اسی وقت ممکن ہے جب دلوں پر حکمرانی کیجائے، یہ صحابہ کرام زیادہ تر اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے، لیکن آپ کی ذات مبارک سے ان کو جو گرویدگی اور شیفتگی پیدا ہوئی وہ اس روادارانہ محبت و شفقت کا جلوہ تھا جو ان کو آپ کی ذات مبارک میں ہر لمحہ اور ہر آن دکھائی دیتا، حضرت عمرؓ کی محبت میں تو ایسا والہانہ پن رہا کہ جب ۱۱ھ میں آپ کا

وصال ہوا، اس کی خبر حضرت عمرؓ کو دی گئی تو انھوں نے اپنی تلوار کھینچ لی، اور بولے کہ جو یہ کہے گا کہ محمدؐ نے وفات پائی تو اس کا سر اڑا دوں گا، اور جب آپ کی میت کو غسل دیا جا رہا تھا تو حضرت علیؓ نے آپ کے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا، یہ وارفتگی اور محبت اسی وقت ممکن ہے جب کوئی حبیب بنکر دوسروں کو محبوب رکھے، اور محبوب ہو کر دوسروں کا حبیب بنا رہے، یہ حبیبیت اور محبوبیت شمشیر و سنان سے نہیں بلکہ دلوں کی تسخیر ہی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے،

آج بھی آپ کا بڑے سے بڑا بد باطن معترض آپ کی ازواج مطہرات کی تعداد یا جہاد پر تو تنقید کر بیٹھتا ہے مگر آپ کی سیرت کے کسی اور پہلو پر خردہ گیری کرنے میں اپنے کو بے بس پاتا ہے،

تعدد ازواج تعدد ازواج پر اعتراض ان ہی لوگوں کی طرف سے ہوتا رہتا ہے جو اپنی جنسی جبلت کی تسکین کی خاطر صرف دو چار عورتوں تک اپنے کو محدود نہیں رکھنا چاہتے ہیں، آج کی متمدن دنیا میں کوئی پورا شہر یا پورا ملک قحبہ خانہ بن جائے، یا یورپ، امریکہ اور دوسرے ممالک میں کوئی اپنی ناجائز ازواج کی تعداد پر فخر کرے اور ان ناجائز ازواج کی ناجائز اولادوں سے پوری ایک کالونی آباد ہو جائے تو اس جنسی بہیمیت پر اعتراض کرنا درست نہیں سمجھا جائیگا لیکن اگر کہیں جائز تعدد ازواج کی مثال مل جائے تو اس کو نسوانی حقوق کی پامالی قرار دے کر ہر طرف سے احتجاج کی صدا بلند کرنے کو جائز قرار دیا جائیگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں بعض آپ سے سن میں بہت بڑی بعض بہت چھوٹی تھیں، تمام ازواج میں صرف حضرت عائشہؓ کا عقد ان کے کنوارپن میں ہوا، بقیہ تمام بیویوں کا عقد ثانی آپ کے ساتھ ہوا۔ آپ نے ان کے ساتھ جو رواداری اور مساویانہ برتاؤ کیا یا جس لطف و محبت سے ان کی دلجوئی، خاطرداری اور نازبرداری کی، ان پر نہ صرف ازواج مطہرات کو ناز رہا بلکہ وہ عالم نسوانی کی تاریخ کا بہت ہی اہم باب ہے۔ آپ نے ان کو زہد و ورع، استغناء، ایثار، فیاضی، رواداری، مہمان نوازی، عزت نفس، صبر و ثبات، رازداری، عفت و عصمت، حسن معاشرت

صلہ رحم، باہمی رعایت، تیمارداری، عزاداری، محبت اولاد، محبت والدین، پرستش یتامیٰ، پرورش اولاد، محبت شوہر، خدمت شوہر کی جو تعلیمات دیں اور ان پر عمل کرکے انھوں نے جو عملی نمونے پیش کیے، اس سے جس طرح نسوانیت کا رتبہ اور درجہ بلند ہوا اس پر آج ہر مسلمان کو فخر ہے کہ اسلام نے عورت اور مرد دونوں کا درجہ یکساں بلند کیا، آج متمدن دنیا عورتوں کو مجلسوں، ناچ گھروں، پارکوں، جلسہ گاہوں میں چاہے کتنے ہی اپنے کیف و سرور، نشاط و انبساط کا خوبصورت کھلونا بنالے لیکن پاک باطنوں کو رسول اللہ کی ازواج مطہرات کی معاشرتی زندگی کے مطالعہ سے جو روحانی سکون ملتا ہے وہ اس تمدن میں نہیں ملتا ہے، جس کے مردوں کے اعصاب پر صرف عورت سوار ہے،

جہاد | اسی طرح جہاد پر اعتراض کرنے والے ہی ایسی جنگ لڑنے کے عادی ہوچکے ہیں جس میں غارتگری، خونریزی اور درندگی کی ہولناک ترین مثالیں ملتی ہیں، ۱۹۱۵ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ اور امریکہ میں قوم کے تمام نوجوانوں کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا گیا، یورپ ہی کا ایک مورخ اے، جی، گرانٹ نے اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خدا نہ کرے کہ دنیا میں پھر اس سے بڑی فوج وجود میں آئے، چند ہفتے کھلے میدان میں جو جنگ ہوئی تو مغربی محاذ کی فوجوں نے خندقیں کھود لیں، جن کا سلسلہ آلس لینڈ سے سوئٹزرلینڈ تک چلا گیا تھا، ان خندقوں میں جو ایک دوسرے سے بہت کم فاصلے پر تھیں، ہوا میں، زمین کے نیچے اور اوپر لڑائیاں جاری تھیں، جن میں نہ کبھی عارضی طور پر صلح ہوئی اور نہ لڑنے والوں نے آرام کیا، اس جنگ کے متعلق اعداد و شمار پورے طور پر فراہم نہیں ہوئے ہیں، اندازہ لگانے میں بہت اختلاف ہے، مگر اس میں پانچ کروڑ افراد شریک تھے جن میں سے غالباً اسی لاکھ کام آئے، زخمیوں کی تعداد ان سے جو گنی تھی، یعنی یورپ کے نوجوانوں کی ایک نسل ضائع ہوگئی، جو اگر آج زندہ ہوتے تو یورپ کے مدبر، مذہبی پیشوا، سائنسداں اور فنون لطیفہ کے ماہر ہوتے، یہی مورخ لکھتا ہے

کہ سائنس نے قدرت کے رازہائے سربستہ معلوم کر لیے تھے، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں بنی نوع انسان اس کی ایجادوں کے شکار ہوئے، سائنس ہی کی بدولت ایسے آلات حرب ایجاد ہوئے جن سے لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں، جنگ کے اس پہلو پر عرصۂ دراز تک غور و خوض ہوگا، عدالت انسانی میں سائنس کی حیثیت اس وقت ایک ملزم کی ہے، اسی مورخ کا بیان ہے کہ کسی پیغمبر نے ایسی جنگ کی پیشین گوئی نہیں کی تھی جس میں دنیا کے تقریباً سب ممالک شریک ہوں، (تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ یورپ مصنفہ اے، جی، گرانٹ باب ۲۲) یہ جنگ کس لیے لڑی گئی؟ رواداری کا پیام پہنچانے، انسانیت کو سنوارنے، غربت و افلاس کو دور کرنے، سیرت و کردار کے معیار کو بلند کرنے، فضائل و اخلاق کی ترویج اور رذائل اخلاق کو ختم کرنے کے لیے لڑی گئی؟ نہیں، مذکورۂ بالا مورخ اے، جی، گرانٹ کے الفاظ میں اس کے اسباب یہ تھے کہ اسٹریا اور جرمنی جنگ آزمائی پر تلے ہوئے تھے، اس لیے ساری دنیا پر یہ بلائے عظیم نازل ہوگئی، بلقان میں روس اور اسٹریا کی شدید رقابت تھی، روس اور جاپان کی لڑائی کے موقع پر اسٹریا نے جرمنی کی مدد سے روس کو بلقان میں زک دی تھی، سرویا کو اسٹریا اپنا خاص دشمن سمجھتا تھا، اسٹریا نے ۱۹۱۳ء میں سرویا پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، تو اٹلی نے اس کو روکدیا، ۱۹۱۴ء میں ایک واقعہ کی بدولت اس کو موقع مل گیا، ۲۸ جون کو سراجیود میں اسٹریا کا ولی عہد قتل ہوگیا تو حکومت سرویا کی سازش کا شبہہ کیا گیا، اسٹریا نے ایک اعلان کے ذریعہ داد رسی چاہی، مگر یہ خود جنگ کا اعلان تھا، روس اسٹریا کے بیہودہ مطالبات پر سرویا کی امداد کرنے پر آمادہ ہوگیا، ادھر جرمنی اسٹریا کی مدد پر تیار ہوگیا، فرانس روس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا تھا، اس لیے وہ بھی جنگ میں شریک ہوگیا، برطانیہ کو فرانس کی دوستی کی وجہ سے اس میں شرکت کرنی پڑی، یورپ کے بیشتر لوگ امن و صلح کے خواستگار تھے، لیکن وہ ہلاکت آفریں جنگی مشینوں کے دندانوں کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ (تاریخ یورپ از اے، جی، گرانٹ باب ۲۱)۔ اس جنگ میں جرمنی کو

بری طرح شکست ہوئی، تقریباً پچیس سال کے بعد وہ اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے پھر آگے بڑھا، ایک اور بلائے عظیم دنیا کی دوسری عالمگیر جنگ کی شکل میں نازل ہوئی، اس کی ہولناکیوں کا ذکر آگے آئیگا،

سپہ سالاری کا مثالی نمونہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کن کن حالات میں اپنے دشمنوں سے جنگ کی، اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، اگر توحید، رسالت، حق اور صداقت کی ترویج کی خاطر لڑائیاں لڑی بھی گئیں تو یہ ان لڑائیوں سے زیادہ بہتر ہیں جو محض کسی ولیعہد کے قتل یا کسی شکست کے انتقامی جذبے یا سائنس کے تجربات کی آزمائش کی خاطر کیجائیں، اور اگر جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور اشتمالیت کو عقیدہ بنا کر خونریزی اور غارتگری کیجا سکتی ہے، یا ملک کی سرزمین کی حفاظت کی خاطر سرفروشی کا جذبہ ابھارا جاسکتا ہے تو اگر خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات کو عقیدہ بنا کر اسکی ترویج میں جو محاذ آرائیاں ہوئیں تو ان پر طنز اور ملامت کیوں کیجائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی لڑنے میں جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی ایک مثالی نمونہ بن سکتا ہے، کتاب الخراج میں ہے کہ آپ نے کبھی کسی قوم سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف اسلام کی دعوت دیے بغیر جنگ نہیں کی (ہندوستان کے قوانین جنگ فصل اول) اس کی تصریح اس طرح کی گئی ہے کہ جنگ کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوتے لیکن شروع ہونے سے پہلے دشمنوں کے پاس یہ پیام بھیجا جاتا کہ وہ اسلام لے آئیں تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں، اگر وہ اسلام نہیں لاتے تو وہ جزیہ دینا قبول کریں جس کے بعد عام مسلمانوں کی طرح ان کی جان، عزت، آبرو اور دولت کی بھی حفاظت کیجائے گی، اور اگر اسکے لیے بھی وہ تیار نہ ہوتے تو جنگ کیجاتی، جب لشکر روانہ کیا جاتا تو آپ امیر لشکر اور لشکریوں کو یہ ہدایت دیتے کہ وہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، اللہ کا نام لیکر اللہ کی راہ میں اللہ سے انکار کرنے والوں کے ساتھ جنگ کریں، حملہ کرتے وقت غداری نہ کریں، مثلہ نہ کریں، کسی عورت

بوڑھے، بچے یا خانقاہ نشین کو قتل نہ کریں، لڑائی میں جو مال غنیمت حاصل ہو اس کا بیشتر حصہ ان فوجیوں کے درمیان تقسیم کیا جائے جن کی وجہ سے یہ مال حاصل ہوا ہو، قیدیوں کو ہلاک نہ کریں، ان کو احسان کے طور پر یا فدیہ لیکر چھوڑ دیں،

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود جنگ میں شریک ہوتے تو روانہ ہونے سے پہلے یہ دعا کیا کرتے کہ "خدایا تو سفر کا ساتھی اور گھر کا نگراں ہے، خدایا میں سفر کی ہولناکیوں اور واپسی کی مشکلوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، یا اللہ میرے لیے زمین کو مختصر اور سفر آسان بنا دے"۔ دشمن کے علاقہ میں رات کے وقت پہنچ جاتے، تو رات کو حملہ کرنے کی اجازت نہ دیتے، صبح ہونے پر اگر اذان ہوتی رہتی تو بھی حملہ کو روکے رکھتے، لڑائی شروع ہونے سے پہلے یہ دعا فرماتے "خدایا! تو میرا سہارا اور مددگار ہے، تیرے ہی سہارے سے آگے بڑھتا ہوں اور تیرے ہی سہارے حملہ کرتا ہوں اور تیرے ہی خاطر جنگ کرتا ہوں"۔ اور جب لڑائی سے واپس ہوتے تو یہ دعا فرماتے "ہم توبہ کرتے ہوئے اللہ کے عبادت گذار بنکر اس کی حمد کرتے ہوئے واپس ہوتے ہیں"، اور جب گھر پہنچ جاتے تو فرماتے "ہم اپنے رب کی طرف لوٹ آئے، اللہ ہمیں کسی غم سے نہ دوچار کرے"۔ (کتاب الخراج پندرہواں باب، قوانین جنگ، فصل ا، تفصیل کے لیے دیکھو اردو ترجمہ از محمد نجات اللہ صدیقی)

کیا دنیا اس سے بہتر فوجی سپہ سالار پیش کر سکتی ہے ؟

صحابہ کرام کا اسوۂ حسنہ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے تو مخالفوں اور دشمنوں سے حسن سلوک اور لڑائیاں لڑنے میں ان ہی تعلیمات پر عمل کرنے کی کوشش کی جو انھوں نے اپنے محبوب رسولؐ سے باتعلیم

حضرت ابوبکرؓ صدیق کی رواداری حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی عفت، پارسائی، رحمدلی، راست بازی دیانتداری، معاملہ فہمی، عجز، تواضع، زہد و تقویٰ کی بدولت محبوب بارگاہِ رسول اور محرم اسرار نبوت بن گئے تھے، انھوں نے اپنی زندگی، اپنے رسول کے اسوہ کے مطابق ہی گذاری، اسلیے انکے یہاں بھی

عفو و درگذر اور رواداری کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی زندگی میں ہر قسم کی ایذائیں پہنچتی رہیں، ان صبر آزما حالات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ کا جس طرح ساتھ دیا، وہ بھی سیرت وکردار کا مثالی نمونہ ہے، وہ اپنی دولت وثروت کے لحاظ سے مکہ میں بہت ممتاز تھے، وہ چاہتے تو اپنے محبوب رسول کے دشمنوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کرسکتے تھے، مگر ان سے جنگ کرنے کے بجائے ان سے برابر نرمی، صلح اور رواداری اور آشتی سے پیش آتے رہے، ان ہی کی محبت بھری دعوت پر حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت طلحہؓ بن عبد اللہ، حضرت عثمانؓ بن مظعون، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت ابوسلمہؓ، حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص وغیرہ اسلام میں داخل ہوئے، جنکے زریں کارناموں سے اسلام کی تاریخ بھری پڑی ہے، (تاریخ خمیس ص ۲۸۰، خلفائے راشدین از حاجی معین الدین ندوی ص ۵، اسوۂ صحابہ جلد اول ص ۱۵۲) وہ آزردہ ہوکر کبھی غصہ یا انتقال میں انتقام لینے کی فکر نہ کرتے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرما رہے تھے، مشرکین اس پر بہت برہم ہوئے، انھوں نے آپ کو اس قدر زدوکوب کیا کہ آپ بیہوش ہو گئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ جان نثاری کے لیے آگے بڑھے، ان دشمنوں سے بدلہ لینے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ خدا تم سے سمجھے، کیا تم صرف اس لیے آپ کو قتل کردوگے کہ آپ ایک خدا کا نام لیتے ہیں، اسی طرح ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن معیط نے اپنی چادر سے آپ کے گلے میں پھندا ڈال دیا، اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ پہنچ گئے، انھوں نے اس سے سخت برتاؤ کرنے کے بجائے اس کو آپ سے علٰحدہ کرکے فرمایا "تم آپ کو قتل کردوگے جو تمھارے پاس خدا کی نشانیاں لائے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میرا رب اللہ ہے، (خلفائے راشدین از حاجی معین الدین احمد ندوی ص ۶، بخاری باب مالقی النبی صلعم واصحابہ من المشرکین بمکہ)

حقوق انسانی کی حمایت | جب انھوں نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو اپنی پہلی تقریر میں لوگوں

سے مخاطب کرکے کہا کہ اگر میں کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کردو، اگر میں خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت لازم نہیں، تمھارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے، یہاں تک کہ دوسروں سے اس کا حق اس کو نہ دلادوں، اور تمھارا قوی شخص بھی میرے نزدیک ضعیف ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق نہ حاصل کروں" (طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۱۲، خلفائے راشدین ص ۲۵، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی جلد اول ص ۱۳۳)

عفو و درگذر کی مثالیں | بھٹکے ہوئے کو سیدھی راہ پر لانے، کمزوروں کو حق دلانے اور زبردستوں سے حق حاصل کرنے میں انکی ساری روادارانہ سرگرمیاں رہیں، اپنے عہد خلافت میں مجرموں کے ساتھ بڑی نرمی اور رحمدلی سے پیش آتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اشعث بن قیس نے بھی اور جھوٹے مدعیان نبوت کی طرح اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا، وہ جب گرفتار کرکے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے حاضر کیے گئے تو انھوں نے توبہ کی، حضرت ابوبکرؓ نے نہ صرف ان کو معاف کردیا بلکہ اپنی ہمشیرہ ام فروہؓ سے انکا نکاح بھی کردیا۔ (یعقوبی جلد ۲ ص ۱۴۹، خلفائے راشدین ص ۵۷)

اسی طرح طلیحہ نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا، لیکن جب حضرت ابوبکرؓ کے پاس معذرت لکھ بھیجی تو ان کا دل آئینہ کی طرح صاف ہوگیا اور ان کو مدینہ واپس آنے کی اجازت دیدی (یعقوبی ج ۲ ص ۱۵۷)

انھوں نے حضرت مہاجرؓ بن امیہ کو یمامہ کا امیر مقرر کیا تو ان کی امارت کے زمانہ میں وہاں دو گانے والی عورتوں میں سے ایک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں گانا گایا اور دوسری نے گانے میں مسلمانوں کو برا کہا، حضرت مہاجرؓ بن امیہ نے سزا میں ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے اور دانت اکھڑوا ڈالے، حضرت ابوبکرؓ کو یہ معلوم ہوا تو سخت برہمی کا اظہار کیا، انکو لکھ بھیجا کہ اگر رسول اللہ کی ہجو کرنے والی عورت اسلام کی پیرو ہے تو وہ مرتد ہوگئی، اس کو مرتداد کی سزا ملنی چاہیے تھی، اور اگر ذمیہ تھی تو اس نے خلاف عہد کیا، لیکن جس عورت نے مسلمانوں

کو برا بھلا کہا اس کو کوئی سزا نہ دینی چاہیے تھی کیونکہ اگر وہ مسلمان عورت ہے تو اس کو صرف معمولی تنبیہ کرنے کی ضرورت تھی، اور اگر وہ ذمیہ ہے تو جب اسکے مشرک ہونے کو گوارا کر لیا گیا ہو تو مسلمانوں کو برا کہنے کی کیا سزا ہو سکتی ہے، بہر حال یہ تمہاری پہلی خطا تھی، اس لیے معاف کر دیا جاتا ہے، مثلہ (یعنی جسم کا حصہ کاٹنا) نہایت نفرت انگیز گناہ ہے، صرف قصاص کی حالت میں مجبوراً مباح ہے (خلفائے راشدین ص ۵۹۔ تاریخ الخلفاء ص ۹۶)

جنگ میں انسانی ہمدردی | وہ اپنی فوج کو بھی برابر ہدایت دیتے رہتے کہ وہ جہاں داخل ہو وہاں جنگی کارروائی کے علاوہ عام آبادیوں پر کوئی زیادتی نہ ہو، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت رہی، حضرت ابوبکرؓ نے جب شام کی مہم پر لشکر روانہ کیا تو امیر لشکر کو مخاطب کر کے فرمایا :

تم ایک ایسی قوم کو پاؤگے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے، ان کو چھوڑ دینا، میں تم کو دس وصیتیں کرتا ہوں کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، پھل دار درخت کو نہ کاٹنا کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، بکری اور اونٹ کھانے کے سوا بیکار ذبح نہ کرنا، نخلستان نہ جلانا، مال غنیمت میں غبن نہ کرنا اور بزدل نہ ہو جانا۔ (تاریخ الخلفاء ص ۹۶، خلفائے راشدین ص ۶۱)

غیر مسلموں کے حقوق کی نگہبانی | ان کے زمانہ میں جو ممالک فتح ہوئے وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اپنی پناہ میں لیکر ان کے حقوق کی نگہبانی کا پورا ذمہ لیا، ذمیوں کو جو حقوق رسول اللہ صلعم نے دیے تھے وہی انھوں نے بھی دیے، جب حیرہ فتح ہوا تو وہاں کے عیسائیوں سے یہ معاہدہ کیا گیا کہ انکی خانقاہیں اور گرجے منہدم نہ کیے جائیں گے، ان کا وہ قصر نہ گرایا جائیگا جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمنوں کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہوں، انکو ناقوس اور گھنٹے بجانے کی ممانعت نہ ہوگی، تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے نہ جائینگے، کوئی بوڑھا آدمی جو کام سے معذور ہو جائے یا کوئی سخت مرض میں مبتلا ہو کر مجبور ہو گیا ہو یا جو

پہلے مالدار ہو، پھر ایسا غریب ہو جائے کہ خیرات کھانے لگے تو ایسے لوگوں سے جزیہ نہیں لیا جائیگا، اور جبتک وہ زندہ رہیں ان کے اہل وعیال کے مصارف مسلمانوں کے بیت المال سے پورے کیے جائیں، البتہ وہ کسی دوسرے ملک میں چلے جائیں تو ان کے اہل وعیال کی کفالت مسلمانوں کے ذمہ نہ ہوگی، اس معاہدہ میں یہ بھی تھا کہ یہاں کے ذمیوں کو فوجی لباس پہننے کے علاوہ ہر طرح کی پوشاک پہننے کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ وہ مسلمانوں سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں، مشابہت سے احتراز کرنے کی ہدایت اس لیے دی گئی کہ مسلمانوں اور ذمیوں میں فرق باقی رکھکر ان کی یعنی ذمیوں کی پوری حفاظت کیجائے، ذمیوں پر یہ بھی لازم قرار دیا گیا کہ وہ مسلمانوں سے دشمنی کا اظہار نہ کریں اور نہ ان کے دشمنوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کریں، اگر وہ ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کا ذمہ ساقط ہو جائیگا اور ان کو دی ہوئی امان ختم ہو جائے گی، اور اگر مسلمانوں پر کوئی اور طاقت غالب آجائے تو پھر ذمیوں کو آزادی ہوگی کہ جو کچھ چاہیں کریں، اس معاہدہ میں یہ بھی لکھا گیا کہ یہ معاہدہ اسی طرح پختہ ہے جس طرح اللہ نے اپنے نبی سے پختہ معاہدہ کرتا ہے، (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۲، اردو ترجمہ ص ۲۲۰-۲۲۳، الفاروق جلد دوم ص ۱۴۴، خلفائے راشدین ص ۶۷)

نجران کے عیسائیوں کو مراعات نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدہ کیا تھا، اس کی توثیق و تجدید حضرت ابوبکرؓ صدیق نے یہ تحریر لکھ کر دی کہ ان کی جان، زمین، مال، عبادت، مذہب، ان کے پادری، راہب، ان کی عبادت گاہیں، اور ان کے قبضہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی امان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں ہیں، انھیں نہ کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، نہ کسی تنگی میں مبتلا کیا جائیگا، کسی اسقف کو اس کی اسقفیت اور کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے نہیں ہٹایا جائے گا، یہ عہد ان تمام وعدوں کی تکمیل میں کیا جا رہا ہے

جو محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کیے تھے۔ (کتاب الخراج ترجمہ باب)

عہد صدیقی میں عیسائی مذہب کا احترام | حضرت ابوبکرؓ ہی کے عہد میں حضرت خالدؓ نے عانات کے پادریوں سے بھی اسی طرح کا معاہدہ کیا کہ ان کے گرجے برباد نہ کیے جائیں گے، وہ نماز کے اوقات کے سوا رات دن جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں، اپنے تمام تہواروں میں صلیب نکالیں (کتاب الخراج باب ۱۴ فصل ۶ اردو ترجمہ ص ۲۲۰) تاریخ طبری میں ہے کہ حضرت خالدؓ نے جن علاقوں کو فتح کیا وہاں کے غیر مسلم باشندوں سے جو معاہدے کیے ان میں تصریح کے ساتھ یہ درج ہوتا کہ جزیہ کے معاوضہ میں ان کے مال و جان کی حفاظت ہوتی رہے گی، اور جب ان کی یہ حفاظت نہ ہو سکے گی تو ان سے جزیہ نہ لیا جائیگا (تفصیل کیلئے دیکھو تاریخ طبری واقعات سنہ ۱۲ھ)

حضرت عمر فاروقؓ کی رواداری | حضرت عمر فاروقؓ عہد رسالت میں اپنی سپہگری، بہادری، جانبازی اور قوت تقریر کے لیے مشہور رہتے، جان نثاری میں ہر موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ بازو بنے رہے، آپ بھی ان کو بہت محبوب رکھتے، عشرہ مبشرہ میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے، عدل پروری میں سخت گیری سے کام لیتے، مگر حب رسول اور اتباع سنت کو کونین کی دولت سمجھتے، حق و صداقت کے اظہار کرنے میں پس و پیش نہ کرتے، اسلام کی خاطر ہر چیز کو قربان کرنے پر تیار رہتے، قرابت کا بھی لحاظ نہیں رکھتے، جنگ بدر میں اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو اپنی تلوار سے ہلاک کیا، اس جنگ کے بعد بہت سے قیدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے گئے تو ان میں قریش کے بہت سے معزز سردار تھے، حضرت ابوبکرؓ کی رائے ہوئی کہ ان سے فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دیا جائے، مگر حضرت عمرؓ نے اپنے جوش ایمانی سے مغلوب ہو کر یہ رائے دی کہ اسلام کے دشمنوں کو سزا دینے میں رشتے اور قرابت کا خیال نہ کیا جائے، ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرے، رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند کی

اور فدیہ لیکر سب کو رہا کردیا، جو فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے اور اگر وہ پڑھے لکھے تھے تو ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس لڑکوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں، تو انکی رہائی ہو جائے گی، اسی کے بعد کلام پاک کی یہ آیت نازل ہوئی کہ کسی پیغمبر کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ خوب خونریزی نہ کرے (سورہ انفال ۹، طبری ص ۱۱۵۵، مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۴۶، الفاروق ج ۱ ص ۳۶)

اپنے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ حکومت کے نظم ونسق میں تو بہت ہی سخت اور درشت رہے لیکن ممالک محروسہ کے غیر مسلم باشندوں کے لیے ان کا دل بہت ہی نرم رہا، ان سے ہر طرح کا فیاضانہ، شریفانہ اور روادارانہ برتاؤ کیا، ان کے زمانہ میں حضرت ابوعبیدہؓ کی سپہ سالاری میں شام فتح ہوا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے ان سے معاہدہ کیا کہ ان کے گرجے اور خانقاہیں محفوظ رہیں گی، ان کو اپنے تہواروں میں جھنڈوں کے بغیر صلیب نکالنے کی اجازت ہوگی، حضرت عمر فاروقؓ نے اس معاہدہ کے بعد ان کو لکھ بھیجا کہ مسلمان ذمیوں پر ظلم نہ کرنے پائیں، نہ ان کو نقصان پہنچائیں، نہ ان کا مال بے وجہ غصب کریں، اور جتنی شرطیں ان سے کیجائیں ان کو پورا کیا جائے،

(کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۶، الفاروق جلد دوم ص ۱۴۰)

جب حضرت ابوعبیدہؓ دمشق سے حمص کی طرف بڑھے تو راستہ میں بعلبک پڑا، یہاں کے باشندوں نے ان سے امان کی درخواست کی، تو انھوں نے ان کی جان ومال اور گرجے کو امان دے کر ان کے لیے یہ تحریر لکھی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - یہ امان نامہ فلاں بن فلاں کے لیے اور اہل بعلبک ــــ اسکے رومیوں، اس کے فارسیوں اور اس کے عربوں ــــ کے لیے ہے، ان کی جانیں، انکے اموال، ان کے گرجے، ان کی محل سرائیں ــــ خواہ وہ داخل شہر ہوں یا اسکے باہر ــــ اور ان کی چکیاں امان میں ہیں، رومیوں کو اجازت ہے کہ وہ پندرہ میل کے اندر اپنے

مویشی چرائیں اور کسی آباد گاؤں میں اور بیچ دجادی اور گذرنے کا مک اتریں، اسکے بعد جہاں چاہیں اتر سکتے ہیں، ان میں سے جو اسلام لائے گا، اس کے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور اس پر وہی فرائض ہوں گے جو ہم پر ہیں، ان کے تاجروں کو ان شہروں میں سفر کرنے کی اجازت ہے جن سے ہماری صلح ہو چکی ہے، ان میں جو اپنے مذہب پر قائم رہے گا، اس پر جزیہ وخراج ہے، اس پر اللہ شاہد ہے اور اس کی شہادت کفایت کرتی ہے (بلاذری عربی ص۱۶۶ اردو ص ۲۰۸)

شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو وہاں سے کچھ لوگ نکل کر انطاکیہ پہنچے، اور اس کے حکمران ہرقل کو ایک زبردست فوج لیکر حمص کی طرف بڑھنے کو آمادہ کیا، جہاں حضرت ابو عبیدہؓ اپنے ہمراہیوں اور ان کے متعلقین کے ساتھ سکونت پذیر ہو چکے تھے، حضرت ابو عبیدہؓ کو غنیم کے لشکر جرار کی خبر ملی تو مجلس مشورت منعقد کی، جس میں یزید بن ابی سفیان نے رائے دی کہ وہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں چھوڑ کر باہر لشکر آرا ہو جائیں، شرجیل بن حسنہ نے اس سے یہ کہکر اختلاف کیا کہ ایسی حالت میں شہر کے عیسائی بچوں اور عورتوں کو مار ڈالیں گے، یا دشمنوں کے حوالے کر دیں گے، یہ سن کر حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا تو پھر ہم عیسائیوں کو شہر سے نکال دیں، شرجیل نے اس کی بھی پرزور مخالفت یہ کہکر کی کہ جب ہم نے عیسائیوں کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے اور ان کو شہر میں امن و اطمینان سے رہنے کا حق دیدیا ہے تو نقضِ عہد کیونکر ہو سکتا ہے، حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنی غلطی تسلیم کر لی، اس کے بعد یہ رائے ہوئی کہ حمص کو خالی کر کے دمشق کو محاذ بنایا جائے، مگر حمص چھوڑنے سے پہلے حضرت ابو عبیدہؓ نے یہ حکم جاری کیا کہ اب وہ اس کے باشندوں کو دشمنوں سے بچا نہیں سکتے، اس لیے ان سے جو جزیہ یا خراج لیا گیا تھا وہ ان کو واپس کر دیا جائے، کیونکہ جزیہ حفاظت کی خاطر وصول کیا جاتا ہے،

یہ حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو رہی ہے، اس لیے ذمیوں کو ان کی رقم واپس ملنی چاہیے۔ اس حکم پر کئی لاکھ کی رقم واپس کر دی گئی، اس رقم کی روادارانہ واپسی سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ فتوح البلدان میں ہے کہ اس واپسی پر اہل حمص نے کہا، ہمیں تمہاری حکومت اور تمہارا عدل اس ظلم وجور سے بہت زیادہ محبوب ہے جس میں ہم تمہارے آنے سے قبل مبتلا تھے، ہم ہرقل کی فوج کی مدافعت کریں گے اور تمہارے عامل کے ساتھ ملکر شہر کی حفاظت کریں گے، سنگدل یہودیوں نے بھی کہا توراۃ کی قسم ہرقل کا عامل حمص میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہمیں مغلوب نہ کرے اور ہماری تمام کوششیں ضائع نہ ہو جائیں۔ (فتوح البلدان عربی جلد اول ص ۱۴۴، اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۲۱) جزیہ کی رقم اور مفتوحہ اضلاع میں واپس کر دی گئی تو وہاں کے لوگ کہنے لگے "خدا تمھیں فتح عطا کرے اور دوبارہ ہم پر حکمراں بنا کر واپس لائے آج اگر تمہاری جگہ رومی ہوتے تو ہمیں کچھ بھی واپس نہ دیتے بلکہ الٹے ہر وہ چیز چھین لیتے جو ہمارے پاس باقی رہ گئی ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہیں باقی نہیں رہتا (کتاب الخراج باب ۱۳۸ فصل ۶، اردو ترجمہ ۲۱۴، نیز دیکھو الفاروق جلد اول ص ۲۸ - ۱۲۷۔ فتوح الشام ازدی ص

بیت المقدس فتح ہوا تو حضرت عمرؓ کی موجودگی میں وہاں کے لوگوں سے یہ معاہدہ ہوا:

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیرالمومنین نے ایلیا کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جگہ، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کیلئے ہے، اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کیجائیگی نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ انکو یا انکے احاطہ کو نقصان پہنچایا جائیگا، نہ انکی صلیبوں اور انکے مال میں کچھ کمی کیجائیگی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائیگا، نہ ان میں کسی کو نقصان پہنچایا جائیگا، ایلیا میں انکے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے، ایلیا والوں پر یہ فرض ہے کہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں کو

نکال دیں، ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اسکی جان اور مال کو امن ہے تا آنکہ وہ جائے پناہ میں پہنچ جائے، جو ایلیا میں رہنا اختیار کرے تو اس کو بھی امن ہے، اس کو جزیہ دینا ہوگا، ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان اور مال لیکر یونانیوں کے ساتھ چلا جانا چاہے تو ان کو اور انکے گرجاؤں اور صلیبوں کو امن ہے، یہانتک کہ وہ اپنی جائے پناہ تک پہنچ جائیں، اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا، رسول کا، خلفاء کا، مسلمانوں کا ذمہ ہے، بشرطیکہ یہ لوگ جزیۂ مقررہ ادا کرتے رہیں، اس تحریر پر گواہ ہیں خالدؓ بن الولیدؓ عمروؓ بن العاص، عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیانؓ اور ۱۵ھ میں لکھا گیا (تاریخ ابو جعفر جریر طبری، فتح بیت المقدس ج ۵ ص ۲۴۰۲، الفاروق جلد ۲ ص ۱۳۱-۱۳۲)

سنہ ۲۰ھ میں مصر پر اسلام کا جھنڈا لہرایا تو وہاں کے مذہبی پیشواؤں کے سارے حقوق برقرار رکھے گئے، وہاں کا پیٹریارک رومیوں کے ظلم سے تیرہ ۱۳ برس تک جلا وطن ہوکر ادھر ادھر زندگی بسر کر رہا تھا حضرت عمروؓ بن العاص نے اس کو تحریری امان دیکر واپس بلایا، اور اسکو اسکا پرانا منصب عطا کیا (مقریزی جلد اول ص ۴۹۲، الفاروق جلد دوم ص ۱۴۲-۱۴۱)

مصر ہی کے فتح کے موقع پر حضرت عمروؓ بن العاص نے لڑائیوں کی تلخیاں دل سے بھلا دیں، جب وہاں کے عیسائیوں نے ان کو اپنے یہاں مدعو کیا تو اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دعوت میں شریک ہوئے اور پھر ان کو اپنے یہاں جوابی دعوت میں مدعو کیا (الفاروق جلد اول ص ۱۲۰)

سنہ ۲۱ھ میں اسکندریہ فتح ہوا تو وہاں حضرت عیسیٰؑ کی ایک تصویر کی ایک آنکھ کو اسلامی فوج کے کسی لشکری نے اپنے تیر سے پھوڑ ڈالا، عیسائیوں کو سخت تکلیف ہوئی، انھوں نے حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس پہنچ کر یہ مطالبہ کیا کہ پیغمبر اسلامؐ کی تصویر بنا کر

نکو دیجائے تاکہ وہ بھی اسکی ایک آنکھ پھوڑ ڈالیں، حضرت عمرو بن العاص نے جواب دیا تصویر دینے کی کیا ضرورت ہے، ہم لوگ موجود ہیں، تم جس کی آنکھ چاہو پھوڑ ڈالو، پھر اپنا خنجر ایک عیسائی کے ہاتھ میں دیکر اپنی آنکھیں سامنے کر دیں، یہ سنکر عیسائی کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا، اپنے دعویٰ سے یہ کہکر باز آیا کہ جو قوم اس درجہ دلیر، فیاض اور بے تعصب ہو اس سے انتقام لینا سخت بے رحمی اور بے قدری ہے، یہ واقعہ مصر کے ایک عیسائی بشپ سعید بن البطریق نے اپنی تاریخ مصر میں لکھا ہے جو چھپ چکی ہے، یہ مصنف ۳۲۸ھ میں موجود تھا، اس واقعہ کو مولانا شبلی نے جنوری ۱۹۰۳ء کی ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں بھی بیان کیا ہے (خطبات شبلی ص ۴۲، ۴۳)

اسکندریہ ہی کی فتح کے موقع پر کثرت سے قبطی اور رومی گرفتار ہوئے، حضرت عمرو ابن العاص نے حضرت عمر فاروقؓ سے ان کے متعلق رائے پوچھی تو انھوں نے لکھ بھیجا کہ ان قیدیوں کو اختیار ہے کہ مسلمان ہو جائیں یا اپنے مذہب پر قائم رہیں، اگر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو انکو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں، ورنہ جزیہ دیکر وہ پناہ میں آجائینگے، اس حکم کے بعد تمام قیدی ایک جگہ جمع کیے گئے، عیسائی سرداروں کو بھی بلا لیا گیا، ہزاروں قیدیوں کے بیچ میں حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان پڑھا گیا، ان قیدیوں میں سے جو اسلام قبول کرتا تو مسلمانوں کی طرف سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوتا، اور جب کوئی اپنی عیسائیت برقرار رکھنے کا اعلان کرتا تو عیسائیوں میں مبارکباد کی صدا بلند ہوتی (طبری جلد ۵ ص ۲۵۸۲-۲۵۸۳۔ الفاروق جلد اول ص ۱۹۶-۱۹۵)

حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایت رہی کہ مفتوحہ علاقوں میں وہاں کے لوگوں کے مال، جان اور مذہب کو پورا امان دیا جائے، ۲۲ھ میں آذربائیجان کی تسخیر ہوئی تو وہاں کے باشندوں سے جو معاہدہ ہوا اس میں اس کی تصریح کی گئی کہ وہ انکے مال، جان، مذہب اور

شریعت کو امان ہے۔ (طبری ج ۵ ص ۲۶۶۲، الفاروق ص ۱۴۲) اسی طرح حذیفہ بن
الیمان نے ماہ دینار والوں کو جو تحریر لکھی یا جرجان والوں سے جو معاہدہ کیا گیا اس میں بھی
اس کی پوری وضاحت کی گئی ہے کہ ان کا مذہب نہ بدلا جائیگا ان کے مذہبی امور میں دست
اندازی نہ کیجائیگی، انکی شریعت میں کوئی تغیر نہ کیا جائیگا۔ (طبری ج ۵ ص ۲۶۶۲، الفاروق ج ۲ ص ۱۴۲)
سنہ ۲۳ھ میں سیستان فتح ہوا تو وہاں کے باشندوں سے اس شرط پر صلح ہوئی کہ انکی تمام آراضی خمس
سمجھی جائے مسلمانوں نے اس شرط کو منظور کرکے یہ نمونہ پیش کیا کہ جب مزروعات کی طرف نکلتے
تھے تو تیزی سے گذر جاتے کہ زراعت چھو تک نہ جائے (الفاروق جلد اول ص ۱۴۳، طبری ج ۵ ص ۲۷۰۵)
ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کہیں سے گذر رہے تھے کہ ایک بوڑھے اندھے سائل کو بھیک
مانگتے دیکھا تو اس سے پوچھا کہ تم کس مذہب کے اہل کتاب ہو، اس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں، پھر پوچھا
بھیک کیوں مانگتے ہو، وہ بولا بوڑھا ہو کر محتاج ہو گیا ہوں، جزیہ کی بھی رقم ادا کرنی ہوتی ہے،
یہ سنکر حضرت عمرؓ اس کو اپنے گھر لے گئے اور گھر سے لاکر کچھ دیا، پھر بیت المال کے خازن کو بلا کر حکم
دیا کہ اس کا اور اسی کی طرح اور مجبور لوگوں کا خیال رکھو، یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ
ایسے لوگوں سے جوانی میں جزیہ وصول کرکے فائدہ اٹھایا جائے اور وہ بوڑھے ہوں تو انکو بے سہارا
چھوڑ دیا جائے، پھر یہ آیت پڑھی انما الصدقات للفقراء والمساکین۔ اس میں فقراء سے
مراد مسلمان فقراء ہیں اور مسکینوں میں اہل کتاب بھی شامل ہیں، اس کے بعد اس یہودی
اور اسی طرح کے اور معذور اہل ذمہ مسکینوں کا جزیہ معاف کر دیا (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۲)
ایک بار حضرت عمر فاروقؓ شام سے واپس آرہے تھے تو ایک ایسی جگہ سے گذرے جہاں کچھ
لوگ دھوپ میں کھڑے کر دیے گئے تھے اور ان کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا تھا، دریافت کیا تو
معلوم ہوا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو جزیہ دینے کی استطاعت نہیں، مگر ان سے واجب الادا

جزیہ وصول کرنا ضروری ہے، یہ سنکر حضرت عمرؓ نے فرمایا، ان کو چھوڑ دو، ان پر انکی برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ لوگوں کو عذاب نہ دو، جو لوگ دنیا میں انسانوں کو عذاب دیتے ہیں انکو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عذاب دیگا (کتاب الخراج باب ۱ فصل ۲)

حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی پوری نگرانی کی کہ غیر مسلموں اور ذمیوں پر مسلمان غاصبانہ قبضہ نہ کریں، جب ممالک فتح ہونے لگے تو حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو لکھ بھیجا کہ مسلمان ان سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ مفتوحہ علاقے کے شہر، وہاں کی زمین، کھیت اور درخت وغیرہ ان کے درمیان تقسیم کر دیے جائیں، اسکے جواب میں حضرت عمرؓ نے سورہ الحشر اور توبہ کی بعض آیتوں سے استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ وہاں کے باشندوں سے جزیہ وصول کر لینے کے بعد مسلمانوں کا کوئی اور حق نہیں رہ جاتا اور نہ کسی تعرض کی گنجائش باقی رہتی، مسلمانوں کو یہ حق کسی طرح نہیں پہنچتا کہ مفتوحہ علاقہ کی زمینوں کو آپس میں تقسیم کر لیں، وہاں کے باشندے بدستور سابق وہاں کی زمین کاشت میں لاتے رہیں کیونکہ وہ اس کام سے زیادہ واقف ہیں اور اس کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہیں، وہ غلام نہ بنائے جائیں، مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے، ان کو کسی طرح نقصان پہنچانے اور ان کا مال کھانے سے روکو (کتاب الخراج باب ۴ فصل ۱ باب ۱۳ فصل ۷) حضرت عمر فاروقؓ نے تو غیر مسلموں سے زمینوں کا خریدنا بھی ناجائز قرار دیا تھا، ان پر مالگذاری عائد کرتے وقت ہدایت کرتے کہ جمع سخت مقرر نہ کیجائے، ان سے پہلے استصواب بھی کر لیتے، عراق کا بندوبست ہونے لگا تو عجمی رئیسوں کو بلا کر ان سے مشورے کئے، مصر کے انتظام میں مقوقس کی رائے طلب کی (مقریزی جلد اول ص ۷۴، الفاروق جلد دوم ص ۱۲۹)

عراق، مصر اور شام کے دفتر مالگذاری کا حساب کتاب وہاں کی زبانوں میں رکھا جاتا، اسلیے

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں وہاں کے حساب کتاب کرنے والے مجوسی، عیسائی یا قبطی تھے، ان کے ساتھ حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق عاملوں کا اچھا سلوک رہتا، (الفاروق ج ۲ ص ۲۶۲)

حضرت عمرؓ کو اپنے بستر مرگ پر بھی ذمیوں کا خیال رہا، انھوں نے فرمایا میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو ذمیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین کرتا ہوں، ان سے جو عہد کیا جائے اس کی پابندی کیجائے، ان کے دشمنوں کے خلاف ان کا دفاع کیا جائے، اور ان پر انکی برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۲)

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ اگر محض روادار ہوتے تو وہ نہ کامیاب حکمراں اور نہ کامراں فاتح ہوتے، جہاں انھوں نے اپنی رواداری کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے وہاں انکے مزاج کی تندی، تیزی اور سختی بھی مشہور رہی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر نیام سے تلوار نکالنے کے لیے برابر تیار رہتے، ایک صحابی ابو حذیفہؓ اور ایک شخص خویصرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گستاخانہ باتیں کیں تو حضرت عمرؓ سے برداشت نہ ہو سکا تلوار نکال کر ان کا سر قلم کرنے کیلئے تیار ہو گئے مگر آپ نے ان کو روکا (ابن سعد قسم اول جزء ۴ تذکرہ عباس ص ۴، خلفائے راشدین ص ۶۲ و ۱۶۸)

آپ نے ازواج مطہرات سے آزردہ ہو کر کچھ دنوں علیحدگی اختیار کرلی تھی، تو حضرت عمرؓ بے چین ہو کر اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کی گردن مارنے کے لیے تیار ہو گئے تھے (فتح الباری ج ۹ ص ۲۵۱) انکی سختی کی وجہ سے بقول حضرت علیؓ عرب کا سرکش سے سرکش اونٹ بلبلا اٹھا تھا، بڑے سے بڑا صاحب جاہ و عامل اور حاکم ان کے قابو میں رہا، کوئی خودسری کی جرأت نہیں کرسکتا تھا، حضرت عمارؓ بن یاسر اپنے زہد و اتقا کے لحاظ سے بڑے رتبے کے صحابی سمجھے جاتے تھے لیکن سیاست اور تدبیر میں انکا پایہ اونچا نہ تھا، حضرت عمرؓ نے انکو کوفہ کا حاکم مقرر کیا لیکن وہ اپنے فرائض منصبی میں ناکام رہے تو بلا تکلف انکو معزول کر دیا کہ وہ اپنے کو اس عہدہ کا موزوں ثابت نہ کرسکے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کوفہ کے حاکم ہوئے تو اپنے لیے ایک محل بنوایا، حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے

کی ڈیوڑھی میں آگ لگا دی کہ اس سے اہل حاجت کو پہنچنے میں رکاوٹ پیدا ہوگی (ابن اثیر ج ۲ ص ۸۱۸)

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو شام سے معزول کر کے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کو وہاں کا حاکم مقرر کیا تو حضرت خالدؓ نے وہاں کے عوام کے سامنے ایک تقریر کی جس میں یہ کہا کہ امیرالمومنین نے مجھے شام کا حاکم بنایا، جب یہاں کے معاملات سدھر گئے، اسکے محاصل آسانی سے وصول ہونے لگے تو مجھے معزول کر دیا اور دوسرے کو مجھ پر ترجیح دی، یہ سنکر ایک سپاہی نے کہا صبر کیجئے، ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے، حضرت خالدؓ نے کہا جبتک ابن خطاب زندہ ہیں، فتنہ کا دور نہیں آسکتا، حضرت عمرؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے فرمایا، میں خالد کو ضرور معزول کروں گا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اپنے دین کی مدد اللہ خود کرتا ہے نہ کہ خالد (کتاب الخراج باب ۱۴ فصل ۶)

وہ عاملوں کی خطاؤں کی سخت گرفت کرتے، ایک بار عوام سے مخاطب ہو کر فرمایا، خدا کی قسم میں اپنے عاملوں کو تمھارے یہاں اس لیے نہیں بھیجتا ہوں کہ وہ تمھارے منہ پر تم کو جانٹے ماریں، تمھارا مال چھین لیں، وہ اس لیے بھیجے جاتے ہیں کہ تم کو تمھارا دین اور تمھارے نبی کی سنت سکھائیں، اگر کوئی عامل کسی سے دین اور سنت سے ہٹکر سلوک کرے تو میں اس سے مظلوم کا بدلہ لیکر رہونگا، یہ سنکر عمروؓ بن العاص کہہ اٹھے کہ اگر کوئی مسلمان عامل اپنی رعایا کی تادیب کرے تو کیا اس سے بھی قصاص لیا جائے گا، حضرت عمرؓ نے جواب دیا، ہاں میں اس سے ضرور قصاص لوں گا، میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آپ سے قصاص دلواتے دیکھا ہے (کتاب الخراج باب ۱۲ فصل ۱) (باقی)

آلِ مقسم قیقانی سندھی

امام ابن عُلیہ بصری اور دیگر علماء و محدثین

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۳)

یہ واقعہ ابن علیہ کے انتقال سے چند ماہ پیشتر کا ہے، یہ گفتگو خلیفہ محمد الامین کے دربار میں ہوئی تھی، جو اپنے والد ہارون الرشید کے انتقال پر جمادی الاولیٰ ۱۹۳ھ میں تخت نشین ہوا تھا، اسی سال ۱۳ ذوقعدہ ۱۹۳ھ میں ابن علیہ کا انتقال ہوا، یہ ابن علیہ کا عقیدہ نہیں تھا، اتفاق سے ایک بات ان کی زبان سے نکل گئی تھی، جس سے فوری تنبیہ پر انھوں نے رجوع کر لیا تھا، لیکن مخالفین نے ان کی بات پکڑ لی اور اعتراضات کا ایک دفتر تیار کر دیا، خطیب بغدادی، حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر جیسے جلیل القدر اصحاب نے اس جملہ کو لغزش زبان قرار دیا ہے، اور ابن علیہ کی ثقاہت اور صحتِ اعتقاد کی تصدیق کی ہے،[1] حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ "ان کی ثقاہت میں کوئی نزاع نہیں ہے، ان کے منہ سے بے خیالی میں ایک بات نکل گئی تھی، اس سے کیا ہوتا ہے، عبد الصمد بن یزید مردویہ کا بیان ہے کہ میں نے ابن علیہ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں،[2] خطیب نے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۷، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۸ [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۲

بھی عبد الصمد بن یزید مردویہ سے اسی طرح کا بیان نقل کیا ہے،[1]

اس کے باوجود بعض محدثین کا دل ابن علیہ کی طرف سے صاف نہیں ہوا، ابوبکر یحییٰ ابن ابو طالب کا بیان ہے کہ ہم لوگ ابو سلمہ منصور بن سلمہ خزاعی کی مجلس میں موجود تھے، انھوں نے زہیر بن معاویہ سے ایک حدیث بیان کرنی چاہی، مگر اتفاق سے منہ سے "حدثنا اسمٰعیل بن علیۃ" نکل گیا، فوراً کہا میں زہیر کہنا چاہتا تھا، اسمٰعیل ان کے مانند کیسے ہو سکتے ہیں، مرتکب گناہ اور بے گناہ یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں، خدا کی قسم اسمٰعیل بن علیہ سے میں نے توبہ کرائی ہے،[2]

ابن حجر نے اس واقعہ کو نقل کرکے منصور بن سلمہ خزاعی کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

قرأت بخط الذهبی هذا من الجرح المردود[3]	میں نے امام ذہبی کے ہاتھ کی تحریر پڑھی ہے کہ یہ جرح قابل رد ہے۔

فضل بن زیاد کا بیان ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ وہیب اور ابن علیہ میں سے آپ کسے پسند کرتے ہیں، اور جب ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو آپ کس کے قول کو ترجیح دیں گے؟ امام احمد نے کہا کہ وہیب مجھے زیادہ پسند ہیں، عبد الرحمٰن بن مہدی اسمٰعیل بن علیہ کے مقابلہ میں وہیب کو زیادہ پسند کرتے تھے، میں نے پوچھا ابن مہدی کیا وہیب کو حفظ کی بنا پر پسند کرتے تھے؟ فرمایا ہر اعتبار سے، اسمٰعیل ابن علیہ مرتے دم تک اپنی بات (قضیۂ خلق قرآن) کی وجہ سے کم حیثیت رہے، میں نے کہا کیا انھوں نے لوگوں کے سامنے توبہ اور رجوع نہیں کیا ہے؟ امام احمد نے کہا ہاں مگر اس واقعہ کے بعد آخری دم تک وہ محدثین سے عداوت رکھتے رہے، پھر امام احمد امین کے دربار کا واقعہ نقل کرکے بار بار

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۲۹ [2] ایضاً ص ۲۳۸ [3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۹

اسمٰعیل کے بارے میں کہتے رہے: جعلہ فداہ نازلۃ من عالم، جعلہ فداہ نازلۃ من عالم، گویا وہ اسمٰعیل کے اس جملہ کو دہراتے رہے جو انھوں نے خلیفہ امین سے معذرت اور رجوع کرتے ہوئے کہا پھر امین کے بارے میں بار بار یہ جملہ دہراتے رہے:

لعل اللہ ان یغفرلہ بھا	شاید اللہ اسکی وجہ سے اسکی مغفرت فرمادے

پھر امام صاحب نے اسمٰعیل بن علیہ کے بارے میں کہا وہ ثبت ہیں[1]

لیکن امام احمد کی طرف اس بات کی نسبت محلِ نظر ہے، وہ ابن علیہ کے عقیدتمند شاگرد تھے، خطیب نے ان کے صاحبزادے عبداللہ سے روایت کی ہے کہ

سمعتُ ابی یقول: فاتنی مالکٌ	میں نے والد صاحب کو یہ کہتے ہوئے سنا
فاخلف اللہ علیّ سفیان ابن	کہ مجھے امام مالک نہ مل سکے تو اللہ تعالیٰ نے
عیینۃ، وفاتنی حماد بن زید	اسکے بدلے مجھے سفیان بن عیینہ
فاخلف اللہ علیّ اسمٰعیل	اور حماد بن زید نہ مل سکے تو اللہ تعالیٰ نے
بن علیۃ[2]	اسمٰعیل بن علیہ کو عطا فرما

اسی طرح ابوسلمہ منصور بن سلمہ خزاعی کا ابن علیہ کے بارے میں یہ کہنا کہ میں نے ان سے توبہ کرائی ہے، مگر مرتکب گناہ غیر مرتکب گناہ کے مانند نہیں ہو سکتا"۔ روایت و درایت دونوں اعتبار سے نقد و جرح کے لائق ہے، چنانچہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر نے اس بیان کو مجروح اور قابل رد قرار دیا ہے،[3]

اصحاب و تلامذہ اصحاب و تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے، ان کے بعض شیوخ و اساتذہ اقران و معاصرین اور ان سے زیادہ سن رسیدہ ائمہ نے بھی ان سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۰ [2] ایضاً ص ۲۳۴ [3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۹

ان کے اساتذہ میں شعبہ اور ابن جریج، معاصرین میں بقیہ بن ولید، حماد بن زید، سن رسیدہ افراد میں امام ابراہیم بن طہمان، مشاہیر اسلام اور ائمہ دین میں امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا نام لیا جاتا ہے۔[1]

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کے حالات کی اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں ہے۔ ان کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے شعبہ، ابن جریج، حماد بن زید، عبدالرحمٰن بن مہدی، علی بن مدینی یحییٰ بن معین، اسحٰق بن راہویہ اور ابوبکر بن شیبہ کا نام کافی ہے۔

تصانیف | ذہبی نے لکھا ہے کہ ۱۴۳ھ میں علمائے اسلام نے فقہ، حدیث، تفسیر و سیر وغیرہ علوم کی تدوین و تالیف شروع کی، ابن جریج نے مکہ مکرمہ میں، سعید بن ابی عروبہ اور حماد بن سلمہ وغیرہ نے بصرہ میں، اوزاعی نے شام میں، امام مالک اور ابن اسحاق نے مدینہ منورہ میں، معمر نے یمن میں امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری نے کوفہ میں تدوین کا کام کیا، اس کے تھوڑے دنوں بعد ہشیم، لیث، ابن سعد، ابن لہیعہ، ابن مبارک، ابویوسف، ابن وہب نے کتابیں لکھیں، ان دینی علوم کے علاوہ عربی زبان وادب، لغت اور تاریخ میں بھی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا۔[2]

اسی عہد کے دور میں امام ابن علیہ نے حدیث، فقہ اور تفسیر میں کتابیں تصنیف کیں، انکی جلالت شان کا یہ عالم تھا کہ امام شعبہ انھیں سید المحدثین اور ریحانۃ الفقہا کہتے تھے۔ ان کی تصانیف میں حدیث و فقہ کا بہترین امتزاج تھا، ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں کتاب التفسیر، کتاب الطہارت، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب المناسک ان کی چار کتابوں کا ذکر کیا ہے[3] لیکن اب یہ کتابیں ناپید ہیں، اور علمائے اسلام کی دوسری بے شمار کتابوں کی طرح صرف انکے نام باقی رہ گئے ہیں، البتہ کتب حدیث و رجال وغیرہ میں ان کے آراء و اقوال ملتے ہیں، جو

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۵ [2] تاریخ الاسلام ج ۶ ص ۶ [3] الفہرست ص ۳۱۶

ممکن ہے ان کی ان ہی کتابوں سے ماخوذ ہوں صدر اول کے علماء میں ابوبکر جعفر بن محمد ابن عبداللہ ابہری مالکی نے نثر مسائل میں ان سے اختلاف کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک کتاب مرتب کر رہے تھے، مگر یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔[1]

وفات امام ابن علیہ ۱۱۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے تھے، کم و بیش ۱۶۹ھ تک وہیں رہے اور ہارون رشید کے دور خلافت میں ۱۶۹ھ۔ ۱۹۳ھ تک بغداد میں اہل و عیال کے ساتھ زندگی بسر کی، تاریخ وفات میں اختلاف ہے، لیکن مشہور قول یہ ہے کہ سہ شنبہ کے دن ۱۳ ذی قعدہ ۱۹۳ھ میں بغداد میں فوت ہوئے اور دوسرے دن مقابر عبداللہ ابن مالک میں دفن کیے گئے، نماز جنازہ ان کے صاحبزادے ابراہیم بن اسمٰعیل ابن علیہ نے پڑھائی جس دن ابن علیہ کا انتقال ہوا وکیع بن جراح بغداد میں موجود تھے۔[2]

خطیب نے معمر بن فضیل کا بیان نقل کیا ہے کہ ۱۹۳ھ میں ہم لوگ مکہ مکرمہ میں تھے، راشد الحنان نے ہم کو بتایا کہ ہم نے پنجشنبہ ۲۵ یا ۲۶ ذی قعدہ کو ابن علیہ کو دفن کیا اور نو دن کی مسافت طے کرکے بغداد سے مکہ مکرمہ پہنچے، اس کے بعد خطیب نے یعقوب بن شیبہ کا قول نقل کیا ہے کہ ابن علیہ سہ شنبہ ۱۳ ذی قعدہ ۱۹۳ھ میں فوت ہوئے۔[3] خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں ان کی وفات ۱۹۴ھ میں بتائی ہے۔[4] بعض دوسرے علماء نے بھی یہی لکھا ہے۔ ابن ندیم نے ابن علیہ کی پیدائش ۱۱۶ھ میں لکھی ہے اور ۱۹۳ھ میں ان کی وفات کے وقت عمر تراسی سال چند ماہ بتائی ہے۔[5] لیکن یہ حساب کے خلاف ہے، ۱۱۰ھ ہی میں پیدائش مانی جائے تب ۱۹۳ھ میں ۸۳ سال ہوں گے۔

اولاد و احفاد امام ابن علیہ صاحب اولاد تھے، ان کے تین صاحبزادوں کے نام اور حالات معلوم

---

[1] الفہرست ص ۲۸۳ [2] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۳۲۵ [3] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۹ و ۲۴۰ [4] تاریخ خلیفہ ج ۲ ص ۵۰۳ [5] الفہرست ص ۳۱۷

ہو سکے ہیں، ایک ابراہیم جنھوں نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی، دوسرے حماد جو مشہور محدث تھے، اور تیسرے محمد یہ بھی محدث تھے، ان کے مختصر حالات درج ذیل ہیں،

ابراہیم بن اسمٰعیل بن علیہ بغدادی | یہ بھی اپنے والد کی طرح ابن علیہ کی کنیت سے مشہور ہیں، انکی پیدائش کے بارہ میں ابن ندیم نے تصریح کی ہے کہ ۱۵۲ھ میں ہوئی تھی[1]

وہ بصرہ میں پیدا ہوئے، پھر اپنے والد کے ساتھ بغداد چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی، ابن سعد نے اسماعیل بن علیہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کی نماز جنازہ ان کے لڑکے ابراہیم بن اسمٰعیل نے پڑھائی، حالانکہ اس دن بغداد میں وکیع بن جراح موجود تھے،[2]

خطیب نے ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ علمائے متکلمین میں سے تھے، اور خلق قرآن کے قائل تھے، بغداد اور مصر میں ان کے اور امام شافعی کے درمیان جو مناظرے ہوئے ہیں، اسکی تفصیل میں نے دیکھی ہے[3]

ابراہیم بن اسمٰعیل نے اپنے والد کے علاوہ اور کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اسکا پتہ نہیں چلتا، البتہ بحر بن نصر خولانی یٰسین بن ابی زرارہ وغیرہ نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے، آخر عمر میں وہ بغداد سے مصر جاکر باب الضوال میں آباد ہو گئے تھے اور وہیں فوت ہوئے،

خطیب نے امام شافعی سے ان کے اختلافات کے واقعات نقل کیے ہیں، یہ مباحث اجماع اور خبر واحد کے سلسلہ میں تھے، اسی طرح خلق قرآن کے مسئلہ میں بھی امام احمد اور دوسرے محدثین ان کے خیالات کو ناپسند کرتے تھے، یہ بھی اس زمانہ کا بڑا نازک مسئلہ تھا، اور محدثین اس بارہ میں بڑے ذکی الحس تھے، ذرا سا اختلاف بھی ان کو ناگوار ہوتا تھا، ابراہیم کو علم کلام سے دلچسپی تھی اور ان مسائل کو کلامی رنگ میں پیش کرتے تھے، اس لیے وہ لوگ انھیں راہ صواب

---

[1] الفہرست ص ۳۱۸ [2] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۲۶ [3] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۰

سے الگ سمجھتے تھے، بعد کو یہ مسائل منقح ہو گئے لیکن ان کے متعلق تذکروں میں محدثین کی حکایات ایسی درج ہیں، جنھیں پڑھ کر سادہ مزاج قاری الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے، بات یہ ہے کہ معتزلہ کی ضرورت سے زیادہ عقلیت پسندی اور یونانی فلسفہ سے غیر معمولی تاثر عام طور سے مسلمانوں کو ناپسند تھا، پھر جب مامون اور معتصم کے دور میں حکومت کی طاقت بھی معتزلہ کے ساتھ ہو گئی اور امام احمد اور دوسرے ائمۂ حدیث پر بہت زیادہ مظالم کیے گئے تو دیندار مسلمانوں کی ناراضی اور بڑھی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس نے ذرا بھی ان مباحث میں لب کشائی کی مسلمانوں کی نظر سے گر گیا، ابراہیم سے برہمی کی یہی وجہ ہے، رفتہ رفتہ جب حالات اعتدال پر آئے اور اشاعرہ نے اس میدان میں قدم رکھا تو صورت حال بدلی، بہرحال ابراہیم نے بغداد اور مصر میں تقریباً چالیس سال تک اس زمانہ کے ذوق کے مطابق دینی علوم کے پڑھنے پڑھانے میں گذارے، اس مدت میں صدہا طلبہ نے ان سے استفادہ کیا مگر ان کے اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ کے نام بھی کتابوں میں نہیں ملتے ہیں، البتہ خطیب نے ان کے دو شاگردوں بحر بن نصر خولانی اور یسین بن ابی زرارہ کی نشاندہی کی ہے، یسین کے حالات تو نہیں ملتے مگر بحر بن نصر خولانی متوفی ۲۶۷ھ کو تذکرہ نویسوں نے ثقہ محدث بتایا ہے، انھوں نے ابراہیم کے علاوہ امام شافعی، ابن وہب، اشہب بن عبدالعزیز، اسد بن موسیٰ، عبدالرحمٰن بن زیاد رصاصی، خالد بن عبدالرحمٰن خراسانی سے بھی حدیث کی روایت کی ہے، اور ان سے ابن ابی حاتم رازی نے براہ راست اور امام نسائی نے ایک واسطہ سے روایت کی ہے، ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

وکان احد الثقات الاثبات	وہ ثقات واثبات میں سے تھے، امام
روی النسائی فی جمعہ	نسائی نے اپنی کتاب میں مسند ایک

المسند ما للک عن رجل عنہ[1]		کے حصہ میں ان سے روایت کی ہے۔

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ابراہیم بن اسمٰعیل کے اس شاگرد سے ان کی حیثیت کا علم ہو جاتا ہے، اور ان کے بارہ میں مخالفانہ خیالات کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔

تصانیف | ابراہیم بن اسمٰعیل ابن علیہ صاحبِ تصانیف تھے، ان کی کتابیں فقہی مباحث پر تھیں، جن میں بحث و تمحیص کا رنگ غالب تھا اور وہ اپنے آرا، و اقوال پر دلائل لانے میں مشہور تھے، داؤد ابن علی اصفہانی نے ان کی ایک کتاب پر نقد لکھنے کے سلسلہ میں ان کے حجج و دلائل کا اعتراف کیا ہے، اور خطیب نے حسب ذیل الفاظ میں ان کے اس طرز استدلال کی طرف اشارہ کیا،

وله مصنفات فی الفقه		فقہ میں ان کی تصنیفات ہیں جن میں

تشبه الجدل[2]		بحث و مناظرہ کا رنگ ہے۔

وفات | ابراہیم بن اسمٰعیل بن علیہ نے آخر عمر میں بغداد سے مصر جاکر باب الضوال میں اقامت اختیار کرلی تھی، وہیں نویں ذی الحجہ ۲۱۸ھ میں ان کی ۷۰ سال کی عمر میں وفات ہوئی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصر کے بجائے انھوں نے بغداد میں وفات پائی۔

حماد بن اسمٰعیل بن علیہ | دوسرے صاحبزادے کا نام حماد بن اسمٰعیل ہے، یہ بھی اپنے باپ اور بھائی کی طرح ابن علیہ کی کنیت سے مشہور ہیں، اپنے والد اسمٰعیل بن علیہ اور وہب ابن جریر بن حازم سے روایت کی، اور ان سے امام مسلم، امام نسائی، عثمان بن خرزاذ، محمد بن اسحٰق صاغانی، یعقوب بن سفیان، محمد بن عباس کابلی، محمد بن عبدوس بن کامل سراج اور احمد بن ابو عوف بزوری وغیرہ نے روایت کی ہے، امام نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے

[1] کتاب الجرح والتعدیل ج ۱ قسم ۱ ص ۱۹ [2] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳

اور ابن حبان نے ثقات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ سنہ ۲۴۴ھ میں بغداد میں فوت ہوئے، خطیب نے ان کی سند سے حضرت عطیہ قرظی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے،[1]

محمد بن اسمٰعیل بن علیہ | تیسرے صاحبزادے ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل تھے۔ ان کو ابو بکر بصری بھی کہتے ہیں، یہ بھی اپنے خاندان والوں کی طرح ابن علیہ کی کنیت سے مشہور ہیں، خطیب نے حماد بن اسمٰعیل بن علیہ کے بیان میں ان کا نام لیا ہے، انھوں نے عبد الرحمٰن بن مہدی، ابو عامر عقدی، عثمان بن عمر بن فارس، اسحاق بن یوسف ازرق، جعفر بن عون، حجاج بن محمد، سعید ابن عامر، ابو نصر، وہب بن جریر، یونس بن محمد، محمد بن بشر عبدی، یعلیٰ بن عبید، یزید بن ہارون، عبد اللہ بن بکر سہمی، علی بن حفص مدائنی، مکی بن ابراہیم، ابو نعیم، محمد بن عبد اللہ انصاری، وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے،

اور ان سے امام نسائی، ابو زرعہ دمشقی، ابراہیم بن دحیم، ابراہیم بن متویہ، محمد بن عبد اللہ ابن عبد السلام، مکحول، ابو بشر دولابی، عبد اللہ بن احمد بن ابی الحواری، ابو العباس محمد بن جعفر ابن محمد بن ہشام بن بلاس، ابو الفضل احمد بن عبد اللہ بن نصر بن ہلال سلمی، ابو الحسن احمد ابن عمر بن جوصا، اور دوسرے محدثین نے روایت کی ہے،

امام نسائی نے ان کو حافظ ثقہ بتایا ہے، دارقطنی نے اظہار اطمینان کیا ہے، ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے، عدوی نے ثقہ اور مستملی نے مستقیم الحدیث کہا ہے، ابن حبان نے کہا ہے وہ غرائب کی روایت کرتے ہیں،

بغداد سے دمشق گئے اور وہاں کے قاضی بنائے گئے، یحییٰ بن اکثم کی معزولی کے بعد جب جعفر بن عبد الواحد عہدۂ قضا پر مامور ہوئے تو انھوں نے محمد بن اسمٰعیل بن علیہ

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۱۵۷، و تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۴

کو دمشق کا قاضی مقرر کیا، وہ ۲۲۴ھ تک اسی عہدہ پر رہے[1]،

ربعی بن ابراہیم بن مقسم | ابراہیم بن مقسم کی دوسری اولاد عُلیہ کے بطن سے ربعی تھے، جو اسمٰعیل کو ابراہیم کے بعد پیدا ہوئے. صاحب طبقات ابن سعد نے اس کی تصریح کی ہے[2]،

ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں لکھا ہے کہ ربعی بن ابراہیم بن مقسم، اسمٰعیل بن علیہ کے بھائی ہیں، انھوں نے یونس اور عبد الرحمٰن بن اسحاق سے روایت کی ہے اور ان سے ابو خیثمہ اور حماد بن زاذان نے روایت کی ہے. ان کی علمی جلالت شان کے لیے امام عبد الرحمٰن بن مہدی کا یہ قول کافی ہے:

کنا نعد ربعی ابن عُلیّة	اسماعیل بن علیہ کے بھائی ربعی بن
اخا اسماعیل بن علیة	علیہ کو ہم لوگ اپنے اسلاف وشیوخ
من بقایا شیوخنا	کی یادگار شمار کرتے تھے،

اور یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ ربعی بن علیہ ثقہ اور مامون ہیں[3]،

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۵ و ۵۶ [2] طبقات ابن سعد ج ، ص ۳۲۵ [3] کتاب الجرح والتعدیل ج ، قسم ۱ ص ۵۱۰

حضرت سالار مسعود غازیؒ کے سوانحی مآخذ

از

جناب معین احمد علوی بہرائچ

حضرت سالار مسعود غازیؒ کا نام نامی شمالی ہندوستان میں کافی مشہور ہے، دہلی سے لیکر بنارس، غازیپور، جونپور، مرزاپور کے علاقہ تک ان کی یادگاریں ملتی ہیں، جن میں سے کئی مقامات پر ہندی مہینے چیت کے حساب سے میلہ ہوتا ہے، ہندوستانی عوام کو ان سے بڑی عقیدت ہے، ان کا مزار مشہور تاریخی شہر بہرائچ میں واقع ہے، جو شمالی مشرقی ریلوے کی گونڈہ نیپال گنج شاخ کا مشہور اسٹیشن اور ضلع کا صدر مقام ہے. گونڈہ سے ۳۵ میل ۴۳ کیلومیٹر دور واقع ہے، مزار اسٹیشن سے شمال جانب بھنگا روڈ پر اسٹیشن سے تقریباً ایک میل دور واقع ہے،

حضرت سالار مسعود غازیؒ کی ذات گرامی کئی ناموں سے مشہور ہے. کسی علاقہ میں بالے میاں اور بالا پیر، کہیں غازی میاں اور غازی بابا، اور کہیں سید سالار اور سالار زر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، اصلی نام امیر مسعود ہے، ان کی مفصل سوانح حیات پر روشنی محمود غزنوی اور اس کے بعد کے زمانہ کی تاریخوں کی روایتوں سے بھی پڑتی ہے، لیکن تاریخو میں ان کا براہ راست تذکرہ آٹھویں صدی کی لکھی ہوئی تاریخوں سے شروع ہوتا ہے،

سفرنامہ ابن بطوطہ (۷۴۲ھ)، تاریخ فیروز شاہی برنی (۷۵۸ھ) شمس سراج عفیف ([illegible]) واقعات مشتاقی (سنہ) میں ان کا اور ان کے مزار کا ذکر موجود ہے، پھر اکبری عہد کی تاریخوں میں سے طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، اکبرنامہ اور منتخب التواریخ میں ذکر آیا ہے، یہانتک کہ صاحب مرأۃ الاسرار شیخ عبدالرحمٰن چشتی کی مستقل کتاب مرأۃ مسعودی سامنے آتی ہے، جو جہانگیر کے زمانہ میں تصنیف پائی ہے، مصنف کا بیان ہے کہ مرأۃ مسعودی کا ماخذ ملا محمد غزنوی کی تاریخ ہے، جو محمود غزنوی کے ساتھ آئے تھے، اس لحاظ سے مرأۃ مسعودی کا پایہ فیروز شاہ سے اکبر کے دور تک کی تاریخوں سے بڑھ جاتا ہے،

حضرت سالار مسعود غازی کا جو نسب نامہ مرأۃ مسعودی میں ہے، اس سے وہ نسباً علوی قرار پاتے ہیں، تاریخ فیروز شاہی وغیرہ میں ان کے نام کے ساتھ سید نہیں لکھا گیا ہے، مولانا عبدالرحمٰن چشتی نے انھیں سید الشہداء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ نسلاً علوی تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اسم گرامی ان کے صاحبزادہ حضرت محمد بن حنفیہ کے ذریعہ بارھویں پشت میں ہے، ان کے علوی ہونے کے باوجود ان کا محمود غزنوی کے رشتہ داروں میں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس زمانہ میں ایسی رشتہ داریاں ہوتی تھیں،

ابوالفضل نے ان کو "خویشاوند سلطان محمود غزنوی" لکھا ہے، اور فرشتہ نے "اقارب سلطان محمود غزنوی بودہ" تحریر کیا ہے، ان کا ننہالی تعلق محمود غزنوی کے خاندان سے ہے، ان کی ماں بی بی ستر معلی محمود کی سگی بہن بلکہ رشتہ کی بہن تھیں،

حضرت سالار مسعود غازیؒ کے والد ماجد سالار ساہو ۴۰۱ھ میں ایک سرکاری تقرر پر قندھار اور بھٹنڈہ کی راہ سے اجمیر پہنچے، اور سالار مسعود غازی کی پیدائش یہیں اجمیر میں ۱۲؍رجب ۴۰۵ھ مطابق ۱۵؍فروری ۱۰۱۵ء کو ہوئی، خزینۃ الاصفیا میں "مطلع نور"

تاریخ پیدائش درج ہے۔

مرأۃ مسعودی میں ہے کہ

"جب چار سال چار ماہ چار دن کے ہوئے تو تعلیم کے لیے حضرت سید ابراہیم نامی بزرگ کے سپرد کیے گئے، نو برس کی عمر میں علم صوری و معنوی سے مالا مال ہوئے۔ دس سال کی عمر میں عبادت الٰہی کا شوق ہوا، شب بیدار رہتے، پہر دن چڑھے نماز چاشت و تلاوت قرآن پاک سے فرصت ہوتی، دیوان عام میں درویشان اہل باطن کے ساتھ صحبت رکھتے، تقریر دلچسپ فرماتے، ہمیشہ باوضو رہتے، غربا و مسکین لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے، عمدہ لباس اور خوشبو کا شوق تھا، تیر اندازی میں کمال حاصل تھا، آپ کے غزوات مشہور ہیں۔"

یہ تعلیمی زمانہ اجمیر ہی میں گذرا، آپ کے والد سالار ساہو محمود غزنوی کے حکم سے ۴۱۵ھ میں اجمیر سے کاہلیر کی مہم پر گئے اور مختلف مہمیں انجام دیتے رہے، اس کے بعد جب محمود غزنوی سومنات کے مندر کی مشہور مہم پر ہندوستان آیا تو سالار ساہو نے اپنے نوعمر لڑکے کو ساتھ لیکر اس میں شرکت کی، اس کے بعد سلطان اپنے بھانجے سالار مسعود کو اپنے ساتھ غزنی لے گیا، لیکن پایہ تخت غزنی کی سیاست سالار مسعود کے لیے سازگار نہ تھی، محمود غزنوی خود تو ان سے محبت کرتا تھا لیکن اس کا بیٹا مسعود غزنوی اور وزیر احمد بن حسن میمندی اس محبت سے خوش نہ تھے، اس کا قدرتی اثر حضرت سالار مسعود غازی پر بھی پڑا، محمود کی زندگی کا یہ آخری دور تھا، اور مسعود غزنوی کے اقبال کا آفتاب طلوع ہونے والا تھا، مسعودی جماعت ہر جگہ چھائی ہوئی تھی، اس لیے سالار مسعود غازی نے پایہ تخت میں قیام کو نامناسب نہ سمجھا، اس لیے محمود سے اجازت لیکر گیارہ ہزار مجاہدین کیساتھ

غزنی سے ہندوستان کی طرف چل پڑے، مختلف مقامات شیوپور، ملتان، اوچھ، اجودھن، دہلی، میرٹھ، گڑھ مکتشر، سنبھل، گنور، ڈیبائی، دونڈہ گڑھ، بدایوں، قنوج، گوپامئو، کالور، مھوبا، بلگرام، ملانواں، سترکھ، کڑا، مانک پور اور دالمؤ پہنچے، ان مقامات میں بعض جگہ راجاؤں نے مقابلہ کیا لیکن فتحیابی کا سہرا سالار مسعود ہی کے سر رہا، محمود غزنوی کے حملوں کے بعد جو مسلمانوں کی بستیاں پہلے ہی سے جگہ جگہ قائم ہو چکی تھیں ان کو سید سالار کی فتوحات سے تقویت پہنچی، نئی آبادی کا اضافہ ہوا، غرضیکہ فتوحات نے آگے بڑھنے کے عزم کو قائم رکھا اور امیر مسعود اس طرح سترکھ ضلع بارہ بنکی تک آگئے، اسی مقام پر سالار ساہو سلطان محمود غزنوی کے انتقال، بیوی کی وفات اور اپنی ضعیفی کی وجہ سے دنیا سے دل برداشتہ ہو کر اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے، اور بیٹے سے آکر ملے، اور یہیں ان کی وفات ہوئی، اور یہیں مدفون ہوئے، سید سالار اپنے والد کی زندگی ہی میں بہرائچ کی طرف متوجہ ہوئے مرأۃ مسعودی کے مطابق پہلے سالار سیف الدین کو اس کی مہم پر بھیجا، سالار سیف الدین نے کچھ دنوں کے بعد کمک طلب کی، سید سالار بذاتِ خود مدد کے لیے روانہ ہو گئے،

. . . . اس عرصہ میں قرب و جوار کے تمام راجایاں جمع ہو گئے،

اور سر جوڑ کر انکے مقابلہ کی تیاریاں کیں، چنانچہ سید سالار سے انکی تین لڑائیاں ہوئیں پہلی دو لڑائیوں میں سید سالار نے کامیابی حاصل کی، مگر ان کے رفقا کی بڑی تعداد جنگ میں کام آگئی، تیسری جنگ ۱۳ رجب ۴۲۴ھ کو شروع ہوئی، راجاؤں کی فوجیں بڑی تعداد میں تھیں، اور انھیں کمک بھی ملتی جاتی تھی، دونوں فوجوں کا کوئی مقابلہ نہ تھا، سید سالار کے ساتھی ایک ایک کر کے شہید ہوتے گئے، آخر ۱۴ رجب ۴۲۴ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۰۳۳ء کو سالار غازی نے بھی جامِ شہادت نوش کیا، جہاں شہید ہوئے وہیں

مزار مبارک ہے، انوار و برکات کا فیض جاری ہے، مزار مبارک پر ذیل کا قطعۂ تاریخ سنگی قلعہ کے دروازہ پر نصب ہے:

محبوب خدا بود امیر مسعود — در چار صد و پنج در آمد بہ وجود

تا مدت بست در جہاد افزود — در چار صد بست و چار رحلت فرمود

اس قطعہ کو مسٹر بیلی نے ابوالفضل کے حوالہ سے نقل کیا، اس سے اس کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔ (المحمود۔ پروفیسر حبیب علی گڑھ)

شہادت کے بعد ہی سے فیض و تصرف کے واقعات کا تذکرہ ملتا ہے، غزا نامۂ مسعودی از مولوی عنایت حسین مطبوعہ ۱۲۸۸ھ میں موضع نگرور ضلع بہرائچ کی بانجھ عورت کے یہاں ولادت کا قصہ موجود ہے، شہادت کے تیس برس بعد زہرہ بی بی شیخ رکن الدین کی مادرزاد نابینا صاحبزادی کی آنکھ میں روشنی آجانے کا مشہور واقعہ سامنے آتا ہے، مرأۃ الاسرار کے مصنف نے تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے زہرہ بی بی عقیدت میں ردولی سے آکر مزار مبارک پر جاروب کشی کے لیے مقیم ہوئیں، اپنے خلوص و عقیدت میں مقبرہ کی تعمیر کی، خزینۃ الاصفیا نے اخبار الاخیار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک بار کچھ حصہ کھودا گیا تو بڑے انوار و برکات کا ظہور ہوا، اخبار الاخیار مولانا عبدالحق محدث دہلوی ایسے معتبر مصنف کی تصنیف ہے جو اکبری دور میں لکھی گئی ہے،

انوار و برکات کی تصدیق ۱۲۸۸ھ کی مطبوعہ ایک کتاب "ترنم خداداد در ذکر مسعود" نامی کتاب سے بھی ہوتی ہے، درگاہ شریف سرکاری انتظام میں آچکی تھی، مرزا خداداد بیگ اسسٹنٹ کمشنر اوقاف اس کتاب کے مصنف ہیں، مرزا صاحب کا خاندانی تعلق سرسید احمد خاں سے تھا، ان ہی کے لڑکے سید محمود کے ساتھ ولایت میں تعلیم حاصل کی تھی،

اس کتاب میں بھی ایک واقعہ اس طرح درج ہے،

"قدیم الایام سے مقبرہ شریف میں ایک دروازہ نہایت تنگ اور پست جانب جنوب تھا، میلہ کے ایام میں ہجوم وانبوہ زائرین کے باعث آمد ورفت میں بڑی دقت واقع ہوتی تھی، اور گنبد کے اندر بسبب تنگی صحن تاریکی چپقلش کشمکش اور حبس رہتا تھا۔ چنانچہ ایک سال بیس بائیس آدمی گھٹ کر مرگئے، انجمن وقف نے گنبد میں جانب شمال ایک مختصر دریچہ کھولا اور ایک پنکھا لگا کر ہوا کا انتظام کیا، .... دریچہ کھولنے میں جو گنبد سے خشتہائے پختہ (پکی اینٹیں) برآمد ہوئیں ان پر لفظ اللہ کندہ تھا، اور ان میں سے گلاب وکیوڑہ کی خوشبو آتی تھی، سبحان اللہ۔"

اس واقعہ سے ایک تو مجمع کی وجہ سے ابن بطوطہ اور محمد شاہ تغلق کی حاضری کے وقت اندر نہ جاسکنے، دوسرے زہرہ بی بی کی عقیدت کی سچی گواہی پر روشنی پڑتی ہے،

اسی طرح ۱۸۷۵ء میں مصنف آئینۂ اودھ مولوی ابوالحسن صاحب مانک پوری نے درگاہ شریف جاکر تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ مزار شریف خاص دودھ اور راکھ سے بنایا گیا ہے (آئینۂ اودھ ص ۱۳۳)

چیت کے مہینے میں زبردست میلہ ہوتا ہے، لاکھوں کا مجمع باہر سے آتا ہے جس میں اکثریت اہل ہنود کی ہوتی ہے، عجیب ذوق وشوق میں حاضر ہوتے ہیں، قومی یکجہتی کی زندہ مثال تقریباً آٹھ سو سال سے قائم ہے،

تاریخی کتابوں کے جائزے کے مطابق سفرنامۂ ابن بطوطہ سے پہلے کی کسی کتاب میں ان کا نام نہیں آتا، نہ کسی جنم کا پتہ چلتا ہے، سلطان محمود غزنوی کے دور کی سب سے پہلی کتاب تاریخ یمینی ہے، جس کو محمودی دربار کے مورخ ابونصر محمد بن عبدالجبار العتبی نے

لکھا ہے، جو محمود غزنوی کا سکریٹری تھا، اس کتاب میں ۴۱۱ھ مطابق ۱۰۲۰ء تک کے حالات ہیں، یعنی جس وقت سالار مسعود غازی سات سال کے تھے، اس میں ان کا کوئی حال نہیں ہے، بعض ضمنی باتوں پر روشنی پڑتی ہے، یہ تاریخ ایشیا اور یورپ دونوں جگہ وقعت اور اعتماد کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اس کی راست نگاری اور اعتدال پسندی قابلِ تعریف ہے، ادبی نقطۂ نظر سے اس کی خاص اہمیت ہے، فارسی میں اس کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں، اس کے فارسی ترجمہ کا ایک نسخہ رامپور لائبریری میں ہے، پہلا ترجمہ ۵۸۲ھ میں ہوا تھا، دوسرا ترجمہ محمد کرامت علی دہلوی نے کیا جو مختلف کتب خانوں میں ملتا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ جیمس رینالڈ نے ۱۸۵۸ء میں شائع کیا تھا، اس کے اقتباسات کے ترجمے مولف ڈاؤسن نے تاریخ ہند جلد دوم میں شائع کیے ہیں، اصل کتاب نایاب ہے،

(۲) اس تاریخ کے بعد ابوسعید عبد الحئی بن ضحاک بن محمود گردیزی کی کتاب زین الاخبار کا نمبر آتا ہے، جو ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء میں محمود غزنوی کے انتقال کے نو، دس سال بعد لکھی گئی ہے، اس کو بڑی محنت سے ڈاکٹر محمد ناظم نے برلن میں طبع کرا کے علمی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے، سید سالار موصوف کے سلسلہ میں العتبی کی طرح یہ کتاب بھی خاموش ہے، محمود غزنوی کے ہندوستانی حملوں کا تذکرہ ہے، کشمیر پر محمود کے حملہ کا ذکر ہے، لیکن سالار موصوف یا ان کے والد سالار ساہو کا تذکرہ نہیں ہے،

(۳) اس کے بعد ابوالفضل محمد بن حسن البیہقی کی تاریخ کا نمبر آتا ہے، جو ۴۵۱ھ مطابق ۱۰۵۹ء میں زین الاخبار کے کچھ ہی دن بعد لکھی گئی، اس میں ۴۵۱ھ تک کے حالات ہیں، بیہقی محمود غزنوی کے دفتر میں ملازم تھا، محمود کے بیٹے مسعود غزنوی کے زمانہ میں اس نے بڑا عروج پایا، اس کی کتاب میں بھی سید سالار موصوف کا ذکر نہیں ہے، اس کی

کتاب کی بارہ جلدوں میں چار پانچ جلدیں پائی جاتی ہیں، محمود غزنوی کے متعلق تاریخ کا جو حصہ تھا، وہ دنیا سے اٹھ گیا، جو باقی ہے اس میں محمود کے بیٹے مسعود کا حال ہے، ان جلدوں کو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا ہے، اس میں ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء یعنی مسعود غزنوی کی تخت نشینی سے حالات کا آغاز ہوتا ہے، ضمنی طور پر بہ نسبت العتبی اور گردیزی کے اس مورخ سے زیادہ مدد ملتی ہے،

(۴) ابوریحان البیرونی۔ اسی زمانہ یعنی محمود غزنوی کے انتقال کے سال بھر بعد ۱۰۳۱ء میں البیرونی ہندوستان آیا ہے، یہاں کئی سال رہ کر پچاس سال کی عمر میں سنسکرت ایسی مشکل زبان سیکھی اور قابلیت کے ساتھ سنسکرت کی کتابوں کے عربی ترجمے کیے ہندوستان میں کئی سال رہ کر یہاں کے رسم و رواج دیکھ کر اپنی مشہور کتاب تحقیق الہند شائع کی، علم الہندیات پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے، اسکا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے، اردو میں بھی دو جلدوں میں ہے، اس کتاب میں صرف ہندوستانی رسم و رواج اور علوم کا تذکرہ کیا ہے، جغرافیائی حالات بیان کئے ہیں، تاریخی حالات نہ ہونے کے برابر ہیں، یہ کتاب ۱۰۳۵ء سے قبل لکھی گئی ہے، اس لئے سلطان محمود کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے، ہمارے مضمون سے متعلق اس کتاب میں کوئی چیز نہیں ملی،

دوسری ہم عصر کتابوں تک ہماری رسائی نہ ہو سکی، ڈاکٹر محمد ناظم نے اپنی انگریزی کتاب Life and Times of Mahmud of Ghazna میں ص ۳۰۲ پر چند کتابوں کے نام دیے ہیں، ڈاکٹر ناظم علی گڑھ میں تعلیم پانے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی سے محمود غزنوی پر ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی، ان کی کتاب پر سر ٹامس آرنلڈ نے دیباچہ لکھا ہے، ڈاکٹر جادو ناتھ سرکار مشہور ہندوستانی مورخ نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے،

ڈاکٹر ناظم محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ اور قائم مقام ڈائرکٹر ہوکر پنشن یاب ہوئے، ۱۸۵۵ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا، ان کی کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے، جو کمیاب ہے،

(۵) دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں :۔

محمود غزنوی کی سرکاری یادداشت یا واقعات جس کا نام دولت نامہ ہے،

تاج الفتوح۔ محمودی دربار کے مشہور شاعر عنصری کا قصیدہ ہے، جس میں محمود کی لڑائیاں اور فتوحات نظم کی ہیں، عنصری کا پورا نام حسن بن احمد تھا، کنیت ابوالقاسم، عنصری تخلص، یہ قصیدہ تقریباً ۲۰۰ اشعروں کا ہے، جس میں محمود کے تمام معرکے اجمالاً لکھے ہیں،

مقامات ابونصر مشکانی۔ محمودی دربار کے دبیر ابونصر مشکانی کی کتاب ہے،

زینت الکتاب۔ تاریخ محمود وراق جو ۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء میں تصنیف ہوئی جس میں ۴۰۹ھ تا ۱۰۱ھ تک کے حالات ہیں،

تجاریب الامم۔ مصنفہ ہلال بن محسن بن ابراہیم الصابی۔

فرید التواریخ۔ مصنفہ ابوالحسن محمد بن سلیمان

ان سب کتابوں کا تذکرہ عباس خاں شروانی سابق صدر درگاہ شریف بہرائچ نے اپنی مایہ ناز کتاب حیات مسعودی میں کیا ہے، یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی، سید سالار غازی کے حالات میں نہایت مفصل، جامع اور بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے، افسوس اب نایاب ہے،

(۶) ان سب کتابوں کے علاوہ ملا محمد غزنوی کی تواریخ کہنہ بہت اہم ہے جو اب نہیں ملتی، مولانا عبدالرحمٰن چشتی مصنف مرأۃ مسعودی نے اپنی کتاب مرأۃ مسعودی کو اس کا خلاصہ بتایا ہے۔ ملا محمد غزنوی کے متعلق مرأۃ مسعودی میں ذیل کی تصریح ہے کہ

ملائے مذکور خلفا و مقربان سلطان	ملا محمد غزنوی سلطان محمود کے
محمود بود۔ فاما آخر عمر بخدمت سالار	ہم نشین اور معتقد تھے، آخر عمر میں
ساہو و سالار مسعود بسر بردہ بود۔	سالار ساہو اور سالار مسعود کے ساتھ
بعد از شہادت سالار مسعود برحمت	زندگی گذاری، سالار مسعود کی شہادت
حق پیوست	کے بعد وفات پائی۔

ان کی تصنیف تواریخ کہنہ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

میں نے تواریخ کہنہ اول سے آخر تک پڑھی ہے، مجھے مسرت حاصل ہوئی اور جو شبہات کہ میرے دل میں تھے جاتے رہے، کتاب بہت ضخیم تھی، اس میں سلطان محمود اور سالار ساہو کی لڑائیوں کے حالات تھے، جا بجا سالار مسعود کا بھی ذکر تھا، کتاب واقعہ شہادت سالار مسعود پر ختم ہوئی، بعض لوگوں نے جو سید سالار مسعود سے عقیدت رکھتے تھے مجھ سے اصرار کیا کہ ہم کو سلطان محمود کے قصوں سے مطلب نہیں۔ اچھا ہے کہ آپ سالار مسعود غازی کے حالات کو الگ کرکے علیحدہ حالات لکھ دیجئے، اور میری بھی یہی آرزو تھی، میں بغیر باطنی اشارہ اور اس فیض خاص کے جو مجھ پر ہے کچھ نہیں لکھنا چاہتا تھا، آخر اس کتاب کے جمع کرنے میں میں نے سید سلطان الشہدا کی روح سے استخارہ کیا۔ آخر رات میں میں نے معاملہ میں دیکھا کہ اپنی مہربانی خاص اور اپنی زبان خاص سے اجازت عنایت فرمائی، اس کے بعد فقیر نے عرض کی کہ میں کتاب شروع کرتا ہوں لیکن اس کی مشکلات اور اچھے برے یا کم و زیادہ واقعات میں میری رہنمائی فرمائی جائے" سید سالار مسعود نے ارشاد فرمایا کہ ضرور خبر رکھوں گا اور تم کو آگاہ کرتا رہوں گا"

چنانچہ میں نے بیان واقعی کو جمع کرکے مرأۃ مسعودی نام رکھا، اللہ تعالیٰ اس کے

پڑھنے والے کو مسعود اور نیک بنا دے، اس فقیر کی دعا ہے

بحق کاشف اسرار مرداں الٰہی عاقبت محمود گرداں

الغرض میں نے سید سلطان الشہدا کے حالات قلم بند کر کے پانچ داستانوں میں تقسیم کیے ہیں اور سلطان الشہداء کے حالات، خوارق عادات بعض معتبر کتابوں اور اہل باطن بزرگوں سے خود سن کر شامل کر دیے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے سہو اور خطا سے بچائے۔

ملا محمد غزنوی کے حالات ابھی تک کہیں تفصیل سے نہیں مل سکے اور نہ ان کی کتاب کا پتہ ہے، سید سالار صاحب کے زمانہ کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے اہم (۱) راج ترنگنی (تاریخ کشمیر) ہے، جس کو کلہن پنڈت نے ۱۱۴۵؁ء میں تصنیف کیا، یہ سنسکرت زبان کا مشہور رزمیہ (EPic) ہے، اکبر بادشاہ نے اس کا فارسی ترجمہ کرایا تھا، اب انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے، کپتان انتھونی ٹرائر (Capt. Anthony Troyer) کا فارسی ترجمہ اچھا سمجھا جاتا ہے، مکمل راج ترنگنی کے نام سے ٹھاکر اچھر چند نے اردو میں بھی شگفتہ انداز میں ترجمہ کیا ہے، جو ۱۹۱۲؁ء میں طبع ہوا، اس میں محمود کے حملوں کا کچھ حال ہے، علمی اعتبار سے یہ کتاب ہندوستانی ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہے،

(۲) تاریخ کامل ابن اثیر۔ ۶۲۹؁ھ میں ابن الحسن علی المعروف بہ ابن الاثیر نے تصنیف کی۔

(۳) تاج المآثر۔ اس عہد کی مشہور و معروف تاریخ ہے، جو قطب الدین ایبک کی خواہش پر لکھی گئی ہے، اس کا مولف حسن نظامی نیشاپوری تھا، جس نے ۶۰۲؁ھ میں کتاب لکھنی شروع کی، اس میں ۵۸۷؁ھ سے ۶۱۲؁ھ تک کے حالات ہیں، اس کی زبان بہت مقفیٰ اور مسجع ہے، اسی وجہ سے مقبول عام نہ ہو سکی، اس کی زیادہ سے زیادہ سطروں میں

کم سے کم معلومات فراہم ہوتے ہیں۔ (بزم مملوکیہ ص ۱۴۴)

(۳) طبقاتِ ناصری۔ اس کے مولف مولانا ابو عمر قاضی منہاج الدین عثمان بن سراج الدین الجوزجانی ہیں، جو اپنے عہد کے جید عالم، صاحب دل صوفی اور ممتاز شاعر بھی تھے ۶۵۸ھ میں ستّر سال کی عمر میں سلطان ناصر الدین محمود کی وفات سے پہلے ہی یہ کتاب ختم کی، یہ ہر زمانہ میں ایک اہم اور کارآمد تاریخ سمجھی گئی ہے، اس میں ۲۳ طبقات ہیں جس میں آفرینش عالم سے ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۶۰ء تک کے تاریخی حالات درج ہیں، اس کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے، اور پڑھنے والوں پر اثر کرتی ہے۔ اس کتاب کے ماخذوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی تلاش و جستجو سے لکھے گئے ہیں، ہر دور کے مورخ اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں، سب سے پہلے اس کتاب کو ۱۸۶۴ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا

اس کتاب میں بھی ہمارے مضمون سے متعلق ضمنی حالات پر روشنی پڑتی ہے، اس کتاب میں اس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ بعض جگہ ضروری واقعات رہ گئے ہیں (بزم مملوکیہ ۲۰)

(۴) سفرنامہ ابن بطوطہ۔ (متوفی ۷۷۹ھ مطابق ۱۳۷۷ء) آٹھویں صدی کا مشہور سیاح ہے، سلطان محمد تغلق کے وقت میں ہندوستان آیا، یہاں کے چپہ چپہ کو دیکھا، اس مصنف کے مشاہدات چونکہ عینی ہیں، اس لیے زیادہ معتبر اور مستند ہیں، محمد شاہ تغلق جب بہرائچ سالار مسعود غازیؒ کے مزار پر حاضر ہوا تو ابن بطوطہ اس کے ساتھ تھا، اس نے حاضری کی تفصیل لکھی ہے، یہی وہ پہلی کتاب ہے جس میں سید سالار مسعود غازی کا نام پہلے پہل آتا ہے، اس کتاب کا ترجمہ عجائب الاسفار کے نام سے مولوی محمد حسین دہلوی نے کیا

تاریخ فیروز شاہی۔ از شمس سراج عفیف، اس میں فیروز شاہ تغلق کے حالات ہیں، اس کتاب کا اردو ترجمہ مولوی فدا علی طالب نے کیا ہے جو دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

حیدر آباد سے شائع ہوئی، اس میں سید سالار مسعود کے مزار پر فیروز شاہ بادشاہ کی آمد کا ذکر اس طرح ہے:

مختصر یہ کہ بادشاہ (فیروز شاہ) نے ۷۷٦ھ میں بہرائچ کا سفر کیا اور شہر میں پہنچکر بندگی سید سالار مسعود کے آستانہ پر حاضر ہوکر فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل کی، بادشاہ نے بہرائچ میں چند روز قیام کیا اور اتفاق سے ایک شب حضرت سید سالار کی زیارت خواب میں نصیب ہوئی سید سالار نے فیروز شاہ کو دیکھکر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا یعنی اس امر کا اشارہ کیا کہ اب پیری کا زمانہ آگیا، بہتر ہے کہ اب آخرت کا سامان کیا جائے اور اپنی ہستی کو یاد رکھا جائے۔ صبح کو بادشاہ نے حلق کیا اور بادشاہ کی اتباع میں اسی روز خانان اور ملوک نے سر منڈایا (حصہ پنجم۔ شاہزادہ فتح خاں کی رحلت۔ بادشاہ کی محلوقی)

روضۃ الصفا۔ اس کتاب کا پورا نام "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء" ہے، اس کا مصنف محمد بن خاوند شاہ بن محمود ہے، زیادہ تر میرخاوند یا خوند کے نام سے مشہور ہے، ۹۰۳ھ میں وفات پائی، میر علی شیر (وزیر سلطان حسین شاہ ایران) اس کا سرپرست تھا، اسی زمانہ میں یہ تاریخ مرتب ہوئی، صاحب مرأۃ مسعودی نے اسی کتاب کے حوالے دیے ہیں، سر ہنری الیٹ نے مقابلہ کرکے دیکھا ہے، خاکسار راقم الحروف نے بھی مقابلہ کرکے دیکھا ہے، جہاں جہاں حوالہ دیا ہے پوری عبارت ملتی ہے، روضۃ الصفا ۱۸۹۱ء میں تیسری بار نولکشور پریس نے چھاپی تھی، اس کے بعد عہد اکبری کی تاریخوں کا نمبر آتا ہے جن میں واقعات مشتاقی، طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، اکبرنامہ، منتخب التواریخ، اخبار الاخیار قابلِ ذکر ہیں۔

واقعات مشتاقی۔ اس کا مولف شیخ رزق اللہ مشتاقی بن شیخ سعداللہ

ابن شیخ فیروز ترک بخاری ہے، یہ شیخ فیروز وہی ہیں جن کا مزار بہرائچ کی عیدگاہ کے شمال میں دریائے سرجو کے کنارے پُر فضا مقام پر زیارت گاہ خلق ہے، اور فیروز شہید کے نام سے مشہور ہیں یہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا خاندان ہے، شیخ فیروز شرقی بادشاہوں اور لودی بادشاہوں کی جنگ میں بہرائچ میں شہید ہوئے تھے (تتمہ اخبار الاخیار) شیخ رزق اللہ مشتاقی ۸۹۷ھ/۱۴۹۵ء میں پیدا ہوئے اور ۹۸۹ھ میں وفات پائی، یہ بڑے سیاح تھے، فارسی میں مشتاقی اور ہندی میں راجن تخلص کرتے۔ واقعات مشتاقی میں سلطان بہلول لودی سے عہد اکبری تک سلسلہ وار حالات ہیں، شیر شاہ، اسلام شاہ، محمود شاہ، محمود علی، غیاث الدین خلجی (مالوہ) اور مظفر شاہ (گجرات) کے حالات ہیں، اس کتاب میں سید سالار مسعود کے نام پر جو نشان (جھنڈے) کا جلوس نکلتا تھا اس پر پابندی عائد کرنے اور مجاورین کی بنا کردہ جھوٹی قبروں کو کھدوانے کا تذکرہ ہے۔

طبقات اکبری۔ مولانا خواجہ نظام الدین احمد بخشی، جو اکبری دور کے ممتاز مورخ ہیں، ہندوستان کی تاریخوں میں ان کی تاریخ اہم سمجھی جاتی ہے، یہ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں مکمل ہوئی۔ اس کی پہلی جلد میں سبکتگین سے لیکر سلطان ابراہیم لودی تک کے حالات ہیں دوسری جلد میں بابر سے اکبر کے ۳۸ ویں سال تک، تیسری جلد میں دکن، گجرات، بنگالہ، جونپور، مالوہ، کشمیر، سندھ اور ملتان کے بادشاہوں کا ذکر ہے۔

تاریخ فرشتہ۔ مولفہ ملا احمد ٹھٹھوی، ۱۰۱۵ھ مطابق ۱۶۰۶ء میں تصنیف ہوئی، نولکشور پریس نے اس کا ترجمہ کئی بار شائع کیا، ایک ترجمہ تحفۃ الملوک کے نام سے مولوی سید حیدر علی نے پہلے اور دوسرے مقالہ کا طبع کرا کے شائع کیا،

اکبر نامہ۔ مولفہ علامی ابوالفضل۔ ابوالفضل کی محنت و کاوش اور انشاء کا شاہکار ہے،

پہلی جلد میں بابر و ہمایوں کے حالات ہیں، دوسری جلد میں اکبری حکومت کے مفصل واقعات ہیں، آئین اکبری کو اس کی تیسری جلد سمجھنا چاہیے،

منتخب التواریخ۔ مولفہ ملا عبدالقادر بدایونی، یہ تین حصوں میں ہے، پہلے میں اکبر کے قبل سلاطین ہند کی تاریخ ہے، دوسرے میں اکبری عہد کے سارے واقعات ہیں، تیسرے میں اس عہد کے علما، مشائخ اور اطبا، و شعرا کا ذکر ہے، ۱۰۰۴ھ مطابق ۱۵۹۵ء میں یہ کتاب ختم کی گئی ہے، اس کا انگریزی ترجمہ بھی جارج رینکنگ اور دوسرے انگریزوں نے کیا ہے، جو کلکتہ سے شائع ہو چکا ہے،

ان سب کتابوں میں سید سالار مسعود غازیؒ کے سلسلے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں، طوالت مضمون کی وجہ سے تفصیل سے معذوری ہے،

عہد اکبری کے بعد شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں صاحب مراۃ الاسرار شیخ عبدالرحمن چشتی کی مستقل کتاب مراۃ مسعودی سامنے آتی ہے، جس میں تاریخ فیروز شاہی، اجاریہ مینی کی تاریخ، مولانا محمد غزنوی کی تواریخ کہنہ کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے، مراۃ مسعودی حضرت سالار مسعود کی شہادت کے چھ سو سال بعد لکھی گئی ہے، مولانا عبدالرحمن چشتی صوفی بزرگ تھے، علاقہ بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے خاص عقیدت تھی، وہیں چلہ کشی کرکے سکون حاصل کرتے، اجمیر شریف سے بشارت ملی کہ بہرائچ جاؤ، یہاں حاضر ہوئے، چلہ کشی کی اور فیض باطنی سے مالا مال ہوئے، اسی قیام کے دوران مراۃ مسعودی تصنیف کی، جس کی تفصیل مراۃ الاسرار و مراۃ مسعودی میں موجود ہے، مولانا نے اپنا تفصیلی حال مراۃ الاسرار میں مولانا عودگے حالات میں لکھا ہے، جس سے ان کے مجاہدات، ذوق کتب بینی اور عقیدت مندی کا پتہ چلتا ہے، مولانا ایک صاحب ذوق، عبادت گذار

صوفی بزرگ تھے، ساری عمر سیاحت اور مجاہدات میں گذاری، آخر میں نعمت عشق سے مالا مال ہوئے، ان سب نعمتوں کے حاصل ہونے کے بعد مرأۃ مسعودی لکھنے وقت سید سالار کی روح سے استفادہ کرنے کی کوشش کی،

مرأۃ مسعودی پر اکثر لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں، انگریز مصنفوں نے بھی کافی بحث کی ہے، سر ہنری ایلیٹ ایسے قابل محقق نے لکھا ہے کہ "یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرأۃ مسعودی جھوٹی ہے،..... مرأۃ مسعودی کے حالات ماخوذ ہیں، من گھڑت نہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن چشتی کا بہت بڑا احسان ہے جو انھوں نے مرأۃ مسعودی لکھ کر کیا ہے، ورنہ شکوک اور اعتراضات کے دروازے بند نہ ہوتے، فیروز شاہ تغلق کے وقت میں بھی مخالفین نے بادشاہ کے دل میں شکوک پیدا کیے اور وہ سید سالار غازی کی روحانیت کا منکر رہا، آخر بادشاہ کی صدق دلی اور لگن کام آئی اور عشق الٰہی کا جذبہ کارفرما ہوا، مزار سید سالار مسعود پر حاضر ہو کر فیضیاب ہوا، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

اس کے علاوہ متعدد مستند صوفیائے کرام نے بھی جن کی بزرگی اظہر من الشمس ہے، اپنے اپنے زمانے میں سالار مسعود غازی کے دربار میں حاضری دیکر نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، اور فیض پایا ہے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ (بہار شریف) حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ (کچھوچھہ شریف) حضرت سید سلطان بہرائچی، سید محمد متوکل کنتوری، شیخ سعد اللہ کیسہ دار کے ملفوظات موجود ہیں۔ پڑھے جا سکتے ہیں، اس صدی کے مشہور بزرگ حاجی شاہ وارث علی صاحبؒ (دیوہ شریف) نے بھی حاضری دی ہے، ایسی حالت میں مولانا عبدالرحمٰن چشتی کی نذر عقیدت کو کیسے غلط قرار دیا جا سکتا ہے،

اودھ کے مشہور صوفی بزرگ و شاعر شاہ تراب علی قلندرؒ نے کیا

فرمایا ہے:-

ہے شہیدوں کی گور میں تاثیر
ترے کشتے کی خاک ہے اکسیر

مولانا حسرت موہانی کہتے ہیں :-

اے عشق تیری فتح بہرحال ہو ثابت
مر کر بھی شہیدانِ محبت ہوئے غازی

باقیات الصالحات نامی کتاب سے ذیل کے اشعار حیات مسعودی کے مصنف عباس خاں شیروانی نے نقل کیے ہیں، تفنن طبع کے لیے حاضر ہیں:

زتاریخ پیشانیاں شد پدید
چناں حالِ مسعود غازی شہید

کہ از حالِ حیدر زنسلِ شریف
فقیہ مدینہ محمد حنیف

مجاہد فتاء و فتاء و فتا
(بمعنی شجاع سخی)
قوی پنجہ از نیروے لافتیٰ (مراد حضرت علیؓ)

سنش اپانزدہ و تولد شباب
وفاتش اتابک و گریبچ و تاب

بشہر رجب بیست و یک شد ظہور
چہار و دہ آن گشت زور عیور

وطن غزنی و مولد اجمیر بود
ز مدفن بہ بہرائچ عزت فزود

خوشا بخت سالار ساہو پدر
کہ سالار مسعود باشد پسر

زہے ام ستر معلی کنار
درو پہ ورد علوی نامدار

خے خال محمود غزنی نژاد
کہ رحمت بر دباد ہر بامداد

(حیات مسعودی ص ۱۰۵)

غزل قدسی در نعتِ سرورؐ

از جناب کالیداس گپتا رضا بمبئی

دسمبر ۱۹۷۶ء کے معارف میں ڈاکٹر سمیع الدین احمد لکچرار شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک مضمون بعنوان "نعتِ قدسی اور اس کی مقبولیت" شائع ہوا ہے۔

نعت قدسی (مرحبا سید مکی مدنی العربی) پر متعدد تضمینوں کے دو جداگانہ مجموعے "حدیث قدسی" اور "صحیفۂ قدسی" ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر رہے ہیں، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں، کتاب "حدیث قدسی" قاضی محمد عمر نے ۱۲۶۲ھ میں اس مشہور و معروف نظم پر مختلف شعراء کے کہے ہوئے خمسے جمع کر کے ترتیب دی، ۱۲۶۷ھ میں چھپی، مجموعہ صحیفۂ قدسی حاجی سید شمشیر علی نے ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء) میں ترتیب دینا شروع کیا، جو ۱۳۰۴ھ میں محمود المطابع دہلی میں چھپکر منظر عام پر آیا، ڈاکٹر صاحب کا مضمون جو ص ۴۴۵ سے ص ۴۶۹ تک پھیلا ہوا ہے، انہی دو مجموعہ ہائے مخمسات پر مبنی ہے، ظاہر ہے میرا مضمون "غزلِ قدسی اور تضمینِ غالب" (مطبوعہ آجکل فروری ۱۹۷۴ء) ان کی نظر سے نہیں گذرا ورنہ شاید انھیں اپنے مضمون کی بیشتر باتیں لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

اسی قسم کی نامکمل واقفیت کی بنا پر سید وزیر الحسن نے بھی فرض کر لیا تھا کہ قاضی محمد عمر والا مجموعہ مخمسات "حدیث قدسی" دراصل دلی کے ایک نعتیہ مشاعرے

کا گلدستہ ہے، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا غالباً آخری نعتیہ مشاعرہ تھا[1] میرا مضمون مطبوعہ آجکل فروری ۱۹۷۴ء اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے شائع کیا گیا تھا،

حقیقت یہ ہے کہ قاضی محمد عمر صاحب حدیث قدسی کے اولین مرتب نہیں، پہلا مجموعہ محمد حسین خاں تحسین شاگرد ذوق نے (جو اس عہد میں مطبع مصطفائی دہلی کے مالک و مہتمم تھے) اس خیال سے کہ "بعد چھوٹ جانے اس دار فانی کے واسطے بقائے نام اور وسیلہ نیکی سرانجام کا ہو" اُس وقت کے نامی گرامی شعرائے ہند سے کچھ ذاتی تعارف کی بنا پر اور کچھ بذریعہ خط و کتابت مخمسات حاصل کر کے ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں مرتب کیا تھا۔

میرے کتب خانے میں تضامین غزل قدسی کے چھ مجموعے ہیں، یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ارتقاء پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے اور ان نسخوں کا مختصر جائزہ لیا جائے، پھر حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی،

ا۔ 'مخمسہائے غزلِ قدسی' یا 'چمن مدحِ نبی'

مطبع مصطفائی دہلی سے محمد حسین خاں تحسین کے اہتمام سے طبع ہوئی، مطبع کے اندراج کے علاوہ سال تاریخ محمد نظام الدین جوش[2] کے قطعہ سرورق سے بھی ثابت ہوتا ہے ۔

---

[1] "دہلی کے اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمینیں" آجکل ۱۵ر فروری ۱۹۷۴ء

[2] منشی نظام الدین جوشش خلف وجیہ الدین پنجابی۔ شگفتہ طبیعت پائی تھی، علی گڑھ میں رہا کرتے تھے۔ .... خمخانۂ جاوید۔ جلد دوم ص ۳۸۵

جب ہوئی زیب وہ طبع خوشامسّی عالی فکر تاریخ میں گلشن کی طرف میں ہوگیا

بلبل از جوش طرب خواند بشاخ گلہا وہ چہ گرد دید شگفتہ چمن مدح شہا

چونکہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں مرتب ہو کر ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی تھی، اسلیے اس میں ۱۲۶۹ھ، ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۷۱ھ تینوں سال کے قطعہ ہائے تاریخ ملتے ہیں، خاتمۃ الطبع میں ایک قطعۂ تاریخ جس سے ۱۲۷۱ھ برآمد ہوتا ہے بہت دلچسپ ہے، یہ مرزا علی حسین دہلوی نازنین تخلص کا طبع زاد ہے، اور جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے، ریختی میں ہے ؎

نازنین تجھکو اک بتاوں بات کہ نگوڑی بڑی ہو بات تیری

سال چھپنے کے اس کتاب کے لکھ اے بوا اس میں ہے نجات تیری[1]

کتاب کے آخری صفحات میں تحسین کا ایک طویل اور معنی خیز قطعہ "در ذکر شعراء" ہے، جس میں مرتب سمیت ان ایک سو نسات شعراء کا ذکر ہے جن کے مخمسے زینتِ کتاب ہیں، حالانکہ تحسین استاد ذوق کے شاگرد تھے، تاہم وہ ذوق کو تضمین غزل قدسی پر آمادہ نہیں کر سکے، وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ شاہ ظفر کی تضمین کے ہوتے ہوئے ذوق نے اپنی شمولیت کو بادشاہ کے احترام کے منافی خیال کیا ہوگا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ذوق ہی کی تضمین ہو اور بادشاہ ظفر کے نام سے شائع ہوئی ہو، قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

معنیٔ بیتِ دو عالم شہ ذیجاہ ظفر لفظ معنیٔ سخاوت شہ با فتح و ظفر

غالب کا ذکر اس طرح آتا ہے ؎

ماہرِ فنِ سخن یعنی جناب غالب کہ ہیں حبّ اسد اللہ کے بے شک مظہر

---

[1] یہاں تری نہیں بلکہ تیری ہی شمار میں آئیگا، ورنہ ۱۰ عدد کم ہو جائیں گے۔

پھر بہت سے شعرا کا ایک ساتھ ذکر کر کے کہا ہے ؎

یہ سخن رس ہیں سخن سنج ہیں بے مثل و عدیل	ہیں یہ مشہور سب اقلیم سخن کے سرور

اور قطعہ میں خود تحسین مجسم انکسار بنے دست بستہ کھڑے ہیں ؎

ان میں تحسین بھی داخل ہو مگر بیچ مَیچ	آگے شاہوں کے کھڑا ہووے بحالِ ابتر

۲- حدیثِ قدسی

مطبع مصطفائی واقع کانپور سے بدیع الزماں کے اہتمام سے ۱۲۸۱ھ میں طبع ہوئی، سرورق پر یہ قطعہ درج ہے ؎

طالبِ مدحِ نبی را ہر طرف	نعرۂ ہذا حدیثِ قدسی است
شکر خالق را کہ از طبع بدیع	شہرۂ ہذا حدیث قدسی است

خاتمۃ الطبع میں یہ قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

چوں دریں آواں بعون کردگار	نعتِ شاہِ انبیا مطبوع شد
گفت شائقؔ[1] سالِ آں از روئے طبع	وصفِ محبوبِ خدا مطبوع شد

مادہ درج نہیں ہے، مگر شمار کرنے پر چوتھے مصرع (۱۲۷۰ھ) میں 'ط' کے نو عدد ملانے سے ۱۲۷۹ھ نکلتا ہے، یہ قطعہ آغازِ طبع میں کہا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس کتاب

---

[1] شائق۔ حافظ الٰہی بخش خلف شیخ محمد حاجی باشندہ کانپور سید وارث علی سیفی کے شاگرد تھے، ان کا دیوان ۱۲۹۵ھ میں چھپا تھا، تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی، ایک کتاب بھی فن تاریخ گوئی میں "آئینۂ تواریخ" کے نام سے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں چھپی تھی جس میں صرف ۱۰۰ تک کے مادے شامل تھے، دوسرے ایڈیشن (۱۸۹۸ء) میں مادوں کی تعداد ۲۰۰۰ تک کے اعداد تک کر دی گئی تھی۔ (یہ دونوں ایڈیشن مع دیوان شائق میرے کتاب خانے میں موجود ہیں) کتاب میں ۲۹۶ کے تحت بطور مادہ 'حدیث قدسی' بھی شامل ہے۔

کی ترتیب کا دعویٰ قاضی محمد عمر صاحب نے ان الفاظ میں (حدیث قدسی ص۲) کیا ہے۔

"........ ۱۲۷۲ھ بارہ سو بہتر ہجری میں فقیر احقر قاضی محمد عمر کے خاطر میں اس اندیشہ نے خطور کیا اور رنگ رسا نے اس کوچہ میں رہنمائی کی کہ اگر مخمسات غزل قدسی ...... جس قدر دستیاب ہوسکیں جمع کر کے اس صورت سے یہ مجموعہ مرتب کیا جائے کہ شاعر کے نام کے نیچے مختصر حال بھی اس کا مرقوم ہو تو البتہ لطف سے خالی نہ ہوگا اور اسی اندیشہ کی مدد و معاون ہوئی رائے........ حافظ انعام اللہ[1] ساکن پانی پت کی جس طرح جی چاہتا تھا، صورت مراد نے نقش باندھا..... اس مجموعہ کی تالیف و ترتیب سے فراغت ہوئی اور نام اس کا 'حدیث قدسی' رکھا۔"

یاد رہے کہ خمسہ ہائے غزل قدسی، مرتبہ محمد حسین خاں تحسین ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی، اور حدیث قدسی کی ترتیب کا خیال قاضی محمد عمر صاحب کو ۱۲۷۲ھ میں آیا، جو ۱۲۷۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، در اصل قاضی صاحب کو اتنی مدت انتظار کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ انھوں نے اس کی ترتیب میں ذرہ بھر مشقت نہیں اٹھائی، خمسہ ہائے غزل قدسی مرتبہ محمد حسین تحسین چھپی چھپائی سامنے تھی، انھوں نے اس کی اشاعت کے پورے دس سال بعد بہت معمولی حذف اور اضافے کے ساتھ اسی کو اپنی تالیف کہہ کر حدیث قدسی کے نام سے چھاپ دیا[2]، حذف یہ کیا کہ تحسین کی کتاب

---

[1] ان صاحب کے متعلق اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ [2] حقیقت یہ ہو کہ قاضی محمد عمر نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پورا فائدہ اٹھایا، نظام درہم برہم ہوچکا تھا، کسی کو کچھ ہوش نہ تھا، انیسویں صدی دو حصوں میں تقسیم ہوچکی تھی، اور ۱۸۰۱ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ قصۂ پارینہ بن چکی تھی، ایسے میں تحسین کی "مدح چمن" بھی کسے یاد رہتی، اب بھی اس کا ایک ہی نسخہ تا حال معلوم ہے، جو خوش قسمتی سے میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

کے سرورق کی جگہ "حدیث قدسی" کا ٹائٹل اور "غزل ذکر شعرا" کی جگہ اپنے رنگ میں "غزل ذکر شعراء" لکھکر ڈالدیے اور اضافہ کیا کہ تحسین کے ایک سو نناوے شعراء کے علاوہ تیرہ دیگر شعراء کے خمسے بڑھا کر تعداد مخمسات ایک سو بارہ کر دی، اور تاریخ خاتمہ کتاب ... درج کر دی، بعد ازاں بارہ مزید خمسے بھی بدیع الزماں مہتمم مطبع مصطفائی کانپور کے ذریعے موزوں کرا کے کتاب کے آخر میں بعنوان ملحقات شامل کر دیے، تحسین نے خمسہ ہائے غزل قدسی کے اختتام پر ناظرین سے امید کی تھی کہ ان کی محنت پر نظر کر کے وہ انھیں دعائے خیر سے یاد فرمائینگے مگر انجام برعکس ہوا، قاضی محمد عمر صاحب تحسین کو دعائے خیر سے یاد تو کیا فرماتے، انھوں نے تو ان کی خمسہ ہائے غزل قدسی (ضمن مدح نبی) کو مستقبل کے ذہنوں ہی سے فراموش کر دیا،

قاضی صاحب نے پیش لفظ میں کہا تھا کہ وہ ہر شاعر کے نام کے نیچے اس کا مختصر حال بھی مرقوم کریں گے اور دعوی بھی کیا تھا کہ جیسا وہ چاہتے تھے، ویسا ہی ہوا بھی، مگر قاضی صاحب کو کہیں اپنے کہے کا پاس نہیں، چنانچہ مختصر حال تو کیا شعراء کے نام وغیرہ بھی وہی ہیں جو تحسین نے خمسہ ہائے غزل قدسی میں دیے ہیں، قاضی صاحب نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں بڑھایا،

۳۔ حدیثِ قدسی

یہ ایڈیشن قاضی صاحب والے ایڈیشن ہی کا نقش اول معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس میں ملحقات شامل نہیں ہیں، باقی ہر چیز وہی ہے، چونکہ اس کے پہلے چھ صفحے غائب ہیں اس لیے اسے حدیث قدسی نمبر ۲ کے بعد درج کیا گیا ہے، ورنہ خاتمۃ الطبع میں قطعۂ تاریخ وہی ہے جو ایڈیشن نمبر ۲ میں ہے، مطبع کا علم نہ ہو سکا، کتابت قطعاً جدا گانہ ہے،

۴۔ حدیث قدسی۔

یہ ایڈیشن مطبع فتح الکریم بمبئی سے شائع ہوا، غالباً ۱۲۹۹ھ میں چھپنا شروع ہوا اور ۱۳۰۰ھ میں

"...... بعد تصحیح تام و خوش خطی بالا کلام باہتمام جناب قاضی محمد فتح محمد و صلح محمد

و عبد الکریم صاحب برادران قاضی ابراہیم صاحب مرحوم فرزندان افضل

الحاج قاضی نور محمد صاحب مغفور........"

شائع ہوا۔ یہ قاضی محمد عمر ہی کے ملحقات والے ایڈیشن کا ری پرنٹ ہے، صرف شائع کی

کے قطعۂ تاریخ میں 'ط' کی جگہ 'ل' کے اعداد ڈال دیے گئے ہیں اور شائع کی جگہ

ہاتف لکھ دیا گیا ہے، تیسرا اور چوتھا مصرع ملاحظہ ہو ؎

گفت ہاتف سال آں از رو لطف	و عجب مجموب خدا مطبوع شد
	۰ ۷ ۱۲ + ۳۰ = ۱۳۰۰ھ

۵۔ صحیفۂ قدسی حصہ دوم حدیث قدسی۔

سرورق سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کو حاجی سید شمشیر علی ولد میر عزیز اللہ صاحب

ساکن گوہانہ ضلع روہتک نے (جو اس وقت دہلی میں مقیم تھے) ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء)

میں جمع کیا اور محمود المطابع دہلی سے طبع کرا کے شائع کیا، پیش لفظ ص ۲ پر اپنا شوق

مدح خوانی حضرت سرور کائنات وغیرہ بیان کر کے فرماتے ہیں کہ پھر

"......... میری نظر سے حدیث قدسی گزری جو کہ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء)

میں قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کر کے چھپوائی تھی، اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا

۵ حدیث قدسی کا قاضی محمد عمر کے اہتمام سے ۱۲۷۳ھ میں چھپنا قرین قیاس نہیں، کیونکہ یہ رسالہ خمسہ با غزل قدسی (ضمین مدح نبی) از محمد حسین خاں تحسین ہی کی نقل ہے جو ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوا تھا، قاضی صاحب یہ جرأت نہ نہیں کر سکتے تھے کہ دو ہی سال کے اندر اندر اس سرقے کو اپنے نام سے طبع کرا کے خاص و عام کے لیے شائع کریں اور تحسین کا نام تک نہ لیں۔ غالباً ۱۲۷۳ھ قاضی محمد عمر صاحب کا بیان کردہ ۱۲۷۲ھ ہے۔

کہ میں بھی قدسی کے غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں۔ بس میں نے بھی بعنایت الٰہی کمر ہمت کو باندھ کر جنوری ۱۸۸۵ء کو دہلی کے اخباروں میں اشتہار دینے شروع کیے اور کثرت سے شاعروں کو بیرون جات میں خط لکھے۔ اب فضل ایزدی سے عرصہ دو سال میں یہ مجموعہ تیار ہو گیا...... بندہ نے التزام کیا ہے کہ جس قدر خمسے پہلے مجموعہ حدیث قدسی میں چھپ چکے ہیں، وہ اس میں شامل نہیں کیے گئے۔ فقط "

حاجی شمشیر علی بھی محمد حسین خاں تحسین کا نام جو غزل قدسی کے مخمسات کے اصل مؤلف ہیں، نہیں لیتے اور قاضی محمد عمر کی طرح غلط دعویٰ کرنے سے نہیں ہچکچاتے، میرے نسخے کے چند آخری اوراق ضائع ہو چکے ہیں، اس لیے خاتمۃ الطبع اور قطعہ ہائے تاریخ کا علم نہیں، تاہم ان کا یہ دعویٰ کہ پہلے مجموعۂ حدیث قدسی کے خمسے ان کے رسالے میں شامل نہیں کیے گئے، درست نہیں۔ حافظ عبدالرحمٰن خان احسان مرزا صفدر علی بیگ بلند، زین العابدین خاں حزیں، مرزا قادر بخش صابر، قادر علی عبد، میاں نامی وغیرہ کے خمسے حاجی شمشیر علی نے قاضی محمد عمر ہی کے مجموعے سے لیے اور قاضی محمد عمر کی دکان تو محمد حسین خاں تحسین ہی کے مال سے سجائی گئی تھی،

حاجی صاحب رقم طراز ہیں کہ انھوں نے جنوری ۱۸۸۵ء میں دہلی کے اخبارات میں اشتہار دینے شروع کیے اور کثرت سے شعراء بیرون جات کو خط لکھے اور نتیجے کے طور پر خدا کے فضل و کرم سے دو سال میں یہ مجموعہ (حدیث قدسی حصہ دوم) تیار ہو گیا، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دسمبر ۱۸۸۶ء یا جنوری ۱۸۸۷ء تک حاجی صاحب کے پاس انکی کوششوں سے خمسوں کی خاصی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی،

اگر یہ سچ ہوتا تو واقعی ایک قابل قدر کارنامہ ہوتا، مگر یہ سچ نہیں ہے،

حاجی صاحب اخلاقی جرأت میں قاضی محمد عمر سے بھی بڑھ کر نکلے، انھوں نے کچھ خمسے قاضی محمد عمر کے یہاں سے نقل کر دیے، کچھ بذریعہ خط و کتابت یا ذاتی تعلقات کی بنا پر حاصل کیے اور ایک بڑی تعداد ہفتہ وار "جریدۂ روزگار" مدراس سے لیکر بغیر کسی حوالے کے درج کتاب کر دیئے اس بڑی چوری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۸ر اگست ۱۸۸۵ء سے ۱۲ر جولائی ۱۸۸۶ء یعنی صرف سال بھر کے پرچوں سے کم از کم بیس۲۰ خمسے لیکر زیب حدیث قدسی حصۂ دوم کئے گئے ہیں ۱۸۸۵ء سے پہلے کے پرچوں سے کتنے خمسے لیے گئے یہ معلوم نہیں،

۶- جریدۂ روزگار

بارہ۱۲ بڑے صفحوں کا یہ اخبار مدراس سے ۱۸۶۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا، مالک سید میر تقی شاہ قادری آفندی تھے، ۱۹۰۳-۴ء تک جاری رہا، اور اس وقت اس کے مالک سید مرتضیٰ تھے، غزل قدسی پر جتنی تضمینیں اس اخبار میں شائع ہوئی ہیں شاید اور کہیں نہیں ہوئیں، چار سال ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۶ء، ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء کے پرچوں میں دو سو سے زائد خمسے چھپے، یہ تو میرے سامنے ہیں، خیال غالب ہے کہ خمسوں کی مجموعی تعداد پانچ سو کے قریب ہوگی، کوئی صاحب چاہیں تو "حدیث قدسی" حصہ سوم بلکہ حصہ چہارم بھی اس جریدے کی مدد سے بآسانی تیار کر سکتے ہیں،

مندرجۂ بالا سطور سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ قاضی محمد عمر اور حاجی شمشیر علی دونوں قطعی نامعتبر شخصیتیں ہیں،

ڈاکٹر سمیع الدین احمد صاحب اس نعتیہ غزل کو حاجی محمد جان قدسی مشہدی کا کلام نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ان کے ہم نام مولانا محمد جان قدسی دہلوی کا

نتیجۂ فکر ہے جو انیسویں یا اٹھارہویں صدی یعنی عہد متاخرین کا شاعر رہا ہوگا، اسکے وجوہ کم وبیش یہ ہیں :

(۱) حاجی شمشیر علی صاحب کی کتاب صحیفۂ قدسی کے اصل متن میں خمسوں کے آغاز سے پہلے بطور عنوان یہ عبارت ملتی ہے ۔

"خمسہ بر غزل حضرت مولانا محمد جان صاحب تخلص قدسی مرحوم دہلوی"

جس سے ظاہر ہے کہ شاعر کا وطن دہلی تھا،

(۲) مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ کے لفظوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شاعر (قدسی) کے انتقال کو بہت زیادہ مدت نہیں گزری ۔

(۳) جامع صحیفۂ قدسی (حاجی شمشیر علی) کو نعت نگار (قدسی دہلوی) کی ذات سے تعلق خاطر تھا، لہذا خمسوں کی ترتیب و تدوین کے وقت اس کو دہلوی لکھنا ایک ایسی شہادت ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، حاجی صاحب نے یہ نسبت بلا تحقیق از خود نہیں لکھی ہوگی اور اس بات کا قطعی امکان نہیں کہ ان کو سہو ہوا ہو، مرتب کی حیثیت ایک واقف کار مورخ کی سی ہے، اور اس کا بیان محقق اور مستند ہے ،

(۴) عام طور سے حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے دیوان یا کلیات کے متداول نسخوں میں یہ نعت موجود نہیں ۔

یہاں ان تمام وجوہ کا نمبروار جائزہ لیا جاتا ہے ۔

(۱) ا۔ قدسی کے بعد دہلوی لکھنا قطعی سہو کاتب ہے، اوپر مخمسات غزل قدسی کے پانچ مختلف مجموعوں کا اجمالی ذکر آچکا ہے، یہ سب میرے کتب خانے میں موجود ہیں اور میرے سامنے ہیں، ان سب کو ایک ساتھ دیکھکر کوئی بھی اس نتیجے پر پہنچ

سکتا ہے کہ ان میں کتابت، طباعت اور معیار کلام کے لحاظ سے حاجی شمشیر علی کا مرتبہ "مجموعہ صحیفۂ قدسی" سب سے ادنیٰ درجے کا ہے۔

پروف ریڈنگ میں بھی قطعاً لاپروائی برتی گئی ہے، اور حاجی صاحب کا اپنا کلام بھی سطحی اور معمولی ہے، حاجی صاحب خود سرورق پر صحیفۂ قدسی کو "مجموعۂ تضمین شعرائے ہندوستان بر غزل مولانا محمد جان صاحب قدسیؒ" لکھتے ہیں۔ اگر ان کے ذہن میں کوئی قدسی دہلوی ہوتے تو وہ ان تضمینوں کو "مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان" کیوں کہتے، کیا دہلوی شاعر شعرائے ہندوستان سے الگ ہیں، بالفرض حاجی صاحب نے قدسی کو جان بوجھ کر دہلوی لکھا بھی ہے، تو اس میں زیادہ سے زیادہ یہ خیال کارفرما ہو سکتا ہے کہ قدسی شاہجہاں کے دربار سے منسلک تھا، اور اسی دربار سے ملک الشعراء کا خطاب اول اس نے پایا تھا،

ب۔ تحسین کی "خمسہائے غزل قدسی" کے ص ۹۹ پر عنایت اللہ خاں قیس کا قطعۂ تاریخ آغاز اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

کیا ہی قدسی کی غزل نعت میں ہو صلِّ علیٰ — جس کے ہر مصرع میں ہر حرف ہو موتی سا جڑا

اس کا تیسرا شعر یہ ہے ؎

شاعروں نے جو لکھے ہند کے خمسے اسکے — جنکے ہر بند پہ قربان ہو دل و جاں اس کا

اس شعر کے مصرع اول سے صاف ظاہر ہے کہ ہند کے شاعروں نے خمسے اس شاعر کے کلام پر کہے ہیں جو خود ہندوستان کا رہنے والا نہیں ہے،

ج۔ تحسین ہی کے مجموعے کے ص ۳ پر حاجی محمد اسحاق اسحاق کا خمسہ ہے، اس کا پہلا بند دیکھئے ؎

ہے یہ استحقاق ترا ایک غلام عجمی　　اس پہ ہو یک نگہِ لطف رسولِ عربیؐ

ترے مداح ہیں سعدی و ظہیر و قدسی　　"..............."

اس 'غلام عجمی' کا ذہن قدسی کے بارے میں قطعاً صاف ہے، وہ اسے سعدی اور ظہیر (فاریابی) کے ساتھ رکھتا ہے، خسرو اور فیضی کے ساتھ نہیں۔

(۵) تحسین کے خمسہائے غزل قدسی کے سرورق پر قطعۂ تاریخ طبع سے پہلے یہ الفاظ ہیں:

"تاریخ طبع خمسہاے غزلِ قدسی فخر شعرا"

طباعت کا آغاز ۱۲۶۹ھ میں ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں فارسی زبان کا شباب ابھی باقی تھا، غالب، مومن، صہبائی، آزردہ سب حیات تھے، کیا اس وقت یا اس سے سو پچاس سال پہلے کا کوئی ایسا عظیم دہلوی شاعر جس کا نام محمد جان تخلص قدسی تھا اور جو اس لائق تھا کہ اسے 'فخر شعرا' کہا جا سکے، اس وقت کے فارسی گویوں اور تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رہ سکتا تھا؟

(۲) مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ سے وقت کی تعیین کیونکر ہو سکتی ہے، صرف یہ تعین ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جس کے لیے یہ دعا کی گئی ہے زندہ نہیں، غرض کہ یہ الفاظ کسی مرے ہوئے کے لیے آتے ہیں، اس کے لیے وقت کی قید نہیں، کوئی شخص کسی زمانے میں بھی فوت ہوا ہو اس کے لیے یہ الفاظ بولے اور لکھے جا سکتے ہیں، اور بولے جاتے ہیں، ان الفاظ سے یہ اندازہ کرنا کہ قدسی تخلص کا کوئی شاعر حال ہی میں فوت ہوا ہے، قطعاً نادرست ہے۔

(۳) جامع صحیفۂ قدسی حاجی شمشیر علی کو قدسی سے قطعی تعلق خاطر نہ تھا۔ حاجی صاحب محقق تھے نہ مورخ، عالم تھے نہ مستند، وہ محض مدح خوانیِ رسول اکرمؐ کے غایت درجہ پرشائق تھے، اس وجہ سے اکثر خمسے اور قصیدے وغیرہ انھوں نے یاد کر لیے تھے، وہ

جہاں بھی جاتے اور یاد کیا ہوا کلام سناتے تو لوگ ان سے اس کلام کے طالب ہوتے
چنانچہ انھوں نے لکھنے یا نقل کرنے کی زحمت سے بچنے کے لیے ۱۲۹۳ھ میں مجموعۂ نعت
(غزل قدسی کے خمسے نہیں) کے دو حصے چھپوا دیے۔ اس وقت تک قدسی سے تو کیا
حدیث قدسی مرتبہ قاضی محمد عمر تک سے ان کو واقفیت نہ تھی، حالانکہ حدیث قدسی
کو (جو تحسین کی خمسہائے غزل قدسی کی نقل ہے) چھپے چودہ برس گذر چکے تھے۔ وہ اس
بات کا خود اقرار کرتے ہیں، اس لیے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ممکن ہے کہ یہ نعت[۵] قدسی کے کلیات اور دیوان کے متداول نسخوں میں نہ ہو،
مگر محض اس بنا پر اسے کسی مفروضہ قدسی دہلوی کی ملک قرار دے دینا صریحاً زیادتی ہے،
متداول نسخوں (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شاعر کے سارے کلام کا شامل ہونا ضروری نہیں،

ص ۴۵۴ پر قاضی محمد عمر کی غزل در ذکر شعرا" میں ایک مصرع یوں درج ہے ؎

منظہر و مخلص و طراز و عفیر و کافی

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اس صفحے پر طراز کے لیے حاشیے میں فرماتے ہیں کہ "وزن شعر
میں لانے کے لیے اس کو طرّار یعنی تشدید کے ساتھ پڑھنا پڑے گا" حسبہ محمد شاہ میر صاحب
دہلوی طرّاز تخلص کا ہے نہ کہ طرّاز تخلص کا۔ تحسین کے خمسہائے غزل قدسی ص ۴۴ پر
تو عنوان میں بھی صاف طرّار لکھا ہے، مگر حدیث قدسی کے متن (ص ۵۵) میں بھی بطور
تخلص طرّار ہی مرقوم ہے، ڈاکٹر صاحب نے غور نہیں فرمایا۔

اگر محمد جان قدسی کو حاجی شمشیر علی نے حاجی کے بجائے مولانا لکھا ہے تو انکی عدم واقفیت
چونکہ وہ قدسی سے واقف نہ تھے اسلیے انھیں یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ قدسی حاجی بھی تھے، چنانچہ انھوں نے قدسی کو
احتراماً مولانا لکھ دیا۔

---

[۵] یہ نعت غزل قدسی کے نام سے مشہور ہے، اسلیے غزلیات قدسی بھی اگر نہ دیکھی ہوں تو دیکھ لینی چاہئیں۔

ادبیات

نعت شریف

از

جناب وفا براہی صاحب

دل رہے مست جامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم   لب پہ ہو وردِ نامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

دینِ دو عالم دین ہو اُسکا، حکمِ خدا آئین ہو اُنکا   کلمۂ حق پیغامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

شان فروغِ نورِ تجلی، جلوہ بامِ طورِ تجلی   رونقِ صبح و شامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

مدرسۂ تسلیم و رضا ہے قبلۂ اہلِ صدق و صفا ہے   سایۂ قصر بامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

انفس اہلِ حل و حرم کیا طائرِ جاں تک روحِ قدس کا   سب ہیں اسیرِ دامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

مہبطِ وحی خاصِ الٰہی منبعِ فیضِ لا متناہی   ہیں لب شیریں کامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

نوح و خلیل و موسیٰ عیسیٰ رکھتے تھے جس اسلام کا دعویٰ   ہے یہ وہی اسلامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

لاکھ غریقِ بحرِ گنہ ہو جانتے ہیں سب لوگ وفا کو

رندِ قدح آشامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

باب التقریظ والانتقاد

Corpus of Arbic & Persian Inscription of Bihar

(A.H.640 . 1200)

از

ڈاکٹر قیام الدین احمد پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی

شائع کردہ :- کاشی پرشاد جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ

از عبد السلام قدوائی ندوی

۱۹۵۰ء میں کاشی پرشاد جیسوال انسٹی ٹیوٹ پٹنہ میں قائم کیا گیا تھا، اسکے قیام کی غرض یہ تھی کہ اونچی سطح پر تحقیقی کام کیا جائے، اس کے ماتحت پانچ ادارے قائم کیے گئے، پالی زبان اور بودھ لٹریچر اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے نالندہ اور سنسکرت زبان و علوم کے لیے دربھنگہ، ہندی پر کام کے لیے پٹنہ، جین مذہب اور اسکی تعلیمات نیز پراکرت کے لیے ویشالی اور فارسی و عربی زبان و علوم پر تلاش و تحقیق کے لیے پٹنہ میں یہ ادارے قائم کیے گئے، موخر الذکر ادارہ کی طرف سے بہار کے عربی و فارسی کے تمام منتشر کتبات کو مرتب کرنے کے لیے ۱۹۶۱ء میں ایک اسکیم تیار کی گئی، ڈاکٹر قیام الدین اس زمانہ میں اس انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، یہ خدمت ان کے سپرد کی گئی، یہ کام بڑا صبر آزما اور محنت طلب تھا، کتبات سارے صوبہ میں پھیلے

ہوئے تھے، مسجدیں، مقبرے، پرانے مدرسے، امرا کے محل اور جاگیرداروں کی حویلیاں سب ہی عمارتوں میں جابجا عبارتیں کندہ ہیں، جن میں ان عمارتوں کے بانیوں کے نام کے علاوہ اور دوسری باتوں کا بھی ذکر ہے، بعض اوقات ان عبارتوں سے ایسی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں جن سے تاریخ کی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں، اور بہت سی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کا سراغ مل جاتا ہے۔ ان سے حکومتوں کے حدود، حکام کے طرز عمل اور سلاطین کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے، بہار، یوپی اور بنگال کے درمیان واقع ہے، اس لیے یہاں کے کتبات سے ان قریبی ریاستوں کے روابط اور حالات پر بھی کچھ روشنی پڑ جاتی ہے، مرکز اور صوبوں کے تعلقات کا اندازہ بھی ان عبارتوں سے بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر ان کتبات کا پتہ چلانے، ان کو پڑھنے، سمجھنے اور نقل کرنے کی جانب شروع سے اہل قلم اور ارباب سیاست کی توجہ رہی ہے، چنانچہ مسٹر بلوخ مین جناب سید حسن عسکری اور ڈاکٹر زیڈ اے ڈیسائی وغیرہ اس سلسلہ میں خاصہ کام کر چکے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک جامع، مرتب اور مفصل جائزہ کی ضرورت عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی، اسی بنا پر ڈاکٹر قیام الدین احمد کے سپرد یہ کام کیا گیا، انھوں نے بڑی محنت سے سارے صوبہ کا دورہ کیا، شہروں کے علاوہ قصبوں اور دیہاتوں میں بھی انھیں جابجا جانا پڑا، وہ ایسے مقامات پر بھی گئے جہاں پہنچنا بہت دشوار تھا، بعض عمارتیں ایسی غیر معروف ہو گئی ہیں کہ ان کا پتہ چلانے میں بڑی زحمتیں پیش آئیں، مگر ڈاکٹر صاحب نے ان مشکلات کی پروا نہ کی اور برابر اپنے کام میں لگے رہے، انھوں نے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے یہ کام شروع کیا تھا، ابھی کام نامکمل تھا کہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا، اس نئی ذمہ داری کے بعد کچھ عرصہ کے لیے یہ کام رک گیا، مگر انسٹی ٹیوٹ کے جوائنٹ ڈائرکٹر جناب سید حسن عسکری صاحب

کی خواہش تھی کہ یہ کام مکمل ہو جائے، وہ ڈاکٹر قیام الدین سے اس کے جاری رکھنے کے لیے برابر اصرار کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب کو خود بھی اس کی فکر تھی اس لیے جب بھی انھیں اپنے فرائض منصبی سے کچھ وقت مل جاتا تو اسے کتبات کی تلاش و تحقیق اور جمع و ترتیب میں صرف کرتے، بالآخر کئی برس کی محنت کے بعد یہ کام مکمل ہوگیا، اور کاشی پرشاد جیسوال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایک ضخیم جلد شائع ہوگئی، اس کتاب میں کل ۲۰۹ کتبات ہیں جن میں ۱۵ مغل دور سے پہلے کے ہیں، ۷۰ پٹھانوں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں، اور ۱۲۹ مغلوں کے زمانہ کے ہیں، ان کتبات کی اصل عبارتوں کے ساتھ ان کے انگریزی ترجمے بھی درج کر دیے ہیں، اور حسب ضرورت ان کی توضیح بھی کر دی ہے، جہاں کہیں کوئی بات قابل تصحیح نظر آئی تو اس کی بھی تصحیح کر دی گئی، آخر میں ایک مفصل انڈکس اور کتبات کے عکس بھی شامل کر دیے گئے ہیں، اس طرح تاریخی اور ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے بہت اچھا مواد فراہم ہوگیا ہے، امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس محنت اور جانفشانی کی قدر کیجائے گی، ابھی بہت سے کتبے صوبہ کے مختلف مقامات میں باقی رہ گئے ہیں، ڈاکٹر صاحب کو خود بھی اس کا احساس ہے، امید ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے کسی اور اسکالر کو مامور کیا جائے گا کہ وہ ان باقی ماندہ کتبات کا پتہ چلائے، اور اسی خوش اسلوبی کے ساتھ انھیں مرتب کرے تاکہ تاریخ کے کچھ اور گوشے واضح ہو جائیں۔

بہار میں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہے، جو اپنے کو ملک کہتی ہے، وہ اپنا نسبی تعلق ملک بیو سے دکھاتے ہیں، مگر اب تک ان کی کوئی مستند تاریخ غالباً نہیں لکھی گئی ہے، زیر نظر کتاب میں ملک بیو سے متعلق تین کتبوں کا ذکر ہے، جو ان کے مقبرہ پر کندہ تھے، ان کا مقبرہ بہار شریف کی پیر پہاڑی پر ہے، اس کا حسب ذیل کتبہ تو اب کلکتہ میوزیم میں محفوظ ہے۔

بعہد دولت شاہ جہاں گیر — کہ بادا در بہار ملک نوروز
شہنشاہ جہاں فیروز سلطان — کہ بر شاہان گیتی گشت فیروز
ملک سیرت ملک بیجو براہیم — کہ بد در دین چو ابراہیم کیں توز
بماہ ذی الحجہ یکشنبہ از دہر — بدست چوں سیزدہ ازمہ دریں سوز
بہ ہجرت ہفتصد و پنجہ سہ تاریخ — مسافر شد ملک در جنت ایں روز
خداوندا بفضل خویشتن بر وی — کنی آسان حساب آخریں روز

اس کے مشرقی دروازہ پر اب تک یہ کتبہ کندہ ہے:

ایں مقطع بہار ملک سیف دولت — کز سہم تیغ او سپر افگندی آفتاب
بت راہمیں شکست چو ہمنام خویش تا — در عالم بقاش شود بت شکن خطاب
صفدار صف شکن چو صف آراستی بہ حرب — رستم بہ تب فتادی و بہمن شدی ز تاب
خورشید گو چو لشکر سیارہ را شکست — آخر ز کوہ ساخت سرا پردہ حجاب
تاریخ آفتاب کہ یکشنبہ از جہاں — چوں لعل رفت در دل سنگ از برائے خواب
بود از مہ معظم فی الحجہ سیزدہ — واز سال بود ہفتصد و پنجہ سہ در حساب

تیسرا کتبہ ہے :-

دریں گنبد کہ ہست از روئے معنی — بہ قدر از گنبد افلاک برتر
بہ خفتست شیر مردی کز نہیبش — نہ خفتے شیر اندر لعلن......[1]
مدار ملک ابراہیم بو بکر — کہ تیغ از بہر حق می زد چوں حیدر
چنیں لشکر کشی کشور کشائی — نہ خیزد در دم اندر ہفت کشور
کنوں چوں بر درت افتاد یارب — ز راہ لطف بکشائی بر در

[1] پڑھا نہیں جا سکا۔

بہ مشک رحمت و کافور بدانت کنی دیوار خاکش را معطر

ان کتبات سے لائق مرتب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ملک بیو ابوبکر کے لڑکے تھے، بت شکن مجاہد اور صوفی تھے، ان کا خطاب سیف الدولہ تھا، بہار کے مقطع مقرر ہوئے، ان کا سنہ وفات ۷۵۳ھ ۲۰ جنوری ۱۳۵۳ء ہے جو فیروز شاہ تغلق کا عہد ہے، ملک بیو فیروز شاہ تغلق سے پہلے محمد بن تغلق کے عہد میں بھی بہار کے مقطع مقرر ہوئے ہوں گے مگر ان کا ذکر کسی معاصر تاریخ میں نہیں[1]، فاضل مرتب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملک بیو سید تھے، مگر مذکورہ بالا کتبات میں ان کے سید ہونے کا ذکر نہیں، کتبات سے یہ بھی ظاہر نہیں کہ ان کا مقبرہ کس نے بنایا، گنج راشدی کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ انکے بڑے لڑکے سید داؤد نے اس کی تعمیر کی، اگر ان کے لڑکے اپنے نام کے ساتھ سید لکھتے تھے تو اس سے ان کا سید ہونا ثابت ہو سکتا ہے، ملک ابراہیم بیو کس کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے، کتبہ سے اسکی وضاحت بھی نہیں ہو سکی[2]، "بیو" کیوں کہلائے، اس کی بھی خاطر خواہ تحقیق نہیں ہو سکی، حاشیہ پر یہ درج ہے کہ وہ سلطان محمد بن تغلق کی خدمت میں ایک بڑی فتح کے بعد پہنچے تو سلطان نے یہ کہکر ان کا استقبال کیا، ملک بیا ملک بیا، یہی بعد میں مقامی زبان میں بیو ہو گیا۔

ان باتوں سے قطع نظر زیر نظر کتاب ایک بہت ہی عمدہ تاریخی تحفہ ہے جس کی اشاعت پر کے. پی. جیسوال انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے، اور اسکے جواں سال، جواں ہمت اور علم و تحقیق کے شائق مرتب پروفیسر قیام الدین کی محنت و کاوش قابل تحسین ہے۔

---

[1] مختصر تاریخ ملک میں منشی گیا پرشاد کے حوالہ سے اسکا ذکر ہے جو حاشیہ پر درج ہے [2] ڈاکٹر ڈیسائی نے ایک قدیم مخطوطہ کی بنیاد پر یہ لکھا ہے کہ بنگال کے بادشاہ شمس الدین کے حملہ کے دوران ملک بیا شہید ہوئے، اسی کے انتقام کے لیے سلطان فیروز شاہ تغلق نے بنگال پر چڑھائی کی۔

مطبوعات جدیدہ

سیرت ابن اسحٰق۔ تحقیق و تعلیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، متوسط تقطیع

کاغذ عمدہ، طباعت اچھی، صفحات ۳۹۵ علاوہ مقدمہ، قیمت تحریر نہیں۔ پتہ: معہد الدراسات والابحاث ص، ب، ۳۰۴ الحساب لبریدی الجاری ۵ہ۔۱۵۔الرباط۔ المغرب

محمد بن اسحٰق ممتاز تابعی اور فن مغازی و سیرت کے امام تھے، ان کی کتاب السیر والمبتدا والمغازی ابتدا میں کثرت سے پھیلی، بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کیے اور یہ سیرت کی اکثر کتابوں کا ماخذ بن گئی۔ سیرت ابن ہشام دراصل اسی کا مثنیٰ ہے، جس کی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے ابن اسحٰق کی سیرت کیجانب ایسی کم توجہ ہو گئی کہ وہ عرصہ سے بالکل ہی ناپید تھی، سیرت رسول کے عاشق اور فدائی ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے مراکش کے بعض فضلاء کے تعاون سے اس کے چند اجزا اہتمام سے شائع کیے ہیں، ڈاکٹر صاحب کو سیرت ابن اسحٰق کے پہلے ٹکڑے (قطعہ) کا ایک جزا اور دوسرے ٹکڑے کے چار اجزا جامعۃ القرویین (فاس) اور کچھ مزید حصہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ سے حاصل ہوا، انھوں نے ان حصوں کو مقابلہ، تصحیح اور تحشیہ کے بعد اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، فاس کے نسخے کے جو اجزاء شائع کیے گئے ہیں، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب، پیدائش، والد، دادا، تبع اور اصحاب الفیل کے علاوہ نبوت سے قبل اور بعد کی مکی زندگی کے متعدد اور مدنی زندگی کے بھی دو ایک واقعے شامل ہیں، دمشق کے مخطوطہ میں بعض غزوات

دبدر، سویق، ذی امر، قینقاع، احد) اور کعب بن اشرف کے واقعہ کا ذکر ہے، مقدمہ میں پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اہمیت و عظمت کا ذکر ہے جس کے مسلمان ہی نہیں انصاف پسند غیر مسلم بھی معترف ہیں، پھر اسلام سے پہلے اور اس کے بعد عہد نبوی اور عہد صحابہ میں عربوں کی تاریخ نویسی کے فن سے دلچسپی کا ذکر ہے، اس ضمن میں احادیث کی تحریر و کتابت اور جمع و تدوین کا ذکر بھی آگیا ہے، اس کے بعد تابعین کے زمانہ کی تاریخ و سیر کی کتابوں کے نام اور ابن اسحٰق کے حالات زندگی ہیں، اور ان کی توثیق و عدم توثیق کے متعلق ائمہ فن کے اقوال بھی ہیں، اس سلسلہ میں امام مالکؒ اور ہشام بن عروہ کے نقد و جرح کا خاص طور پر ذکر کر کے اس کی حقیقت واضح کی گئی ہے، مقدمہ کے آخر میں سیرت ابن اسحٰق کے راویوں اور اس کے نسخوں اور دستیاب اجزاء کے متعلق معلومات کے علاوہ اس کی بعض شرحوں اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجموں کا ذکر ہے، کتاب کے آخر میں قرآنی آیتوں، اشعار، اسماء و اعلام اور مضامین کے اعتبار سے چار فہرستیں اور ابن اسحاق و ابن ہشام کی کتابوں کے مقابلہ کے لیے ایک جدول دیا گیا ہے، گو اس کتاب کا بڑا حصہ ابن ہشام کی سیرت میں شامل ہونے کی وجہ سے محفوظ ہے، تاہم جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا ہے "ابن ہشام نے بعض مفید اور ضروری باتیں اور بہت سے اشعار حذف کر دیے تھے، اس لیے نیز سیرت اسحٰق کی قدامت کی بنا پر اس کی اشاعت کی ضرورت اور فائدہ مسلم ہے، کتاب مکمل نہیں ہے، تاہم اس کی اشاعت سے ڈاکٹر صاحب کے علمی کارناموں میں ایک اور اہم کارنامے کا اضافہ ہوا، اہل علم کو ان کا ممنون ہونا چاہئے، اگر مولانا شبلی مرحوم زندہ ہوتے تو ان کو بڑی خوشی ہوتی، ڈاکٹر صاحب نے سیرت ابن اسحٰق کے شیخ سعدی کے زمانہ کے جس فارسی ترجمہ کا ذکر کیا ہے اس کا قلمی نسخہ مولانا نے الٰہ آباد میں ملاحظہ فرمایا تھا،

سرسید ہال ریویو اولڈ بوائز نمبر } نگراں ڈاکٹر اصغر عباس صاحب، ایڈیٹر ملک خالد حسین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۹۶، قیمت تحریر نہیں، پتہ:۔ سرسید ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مدرستہ العلوم جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے، ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا تھا، اسی سال چند ماہ بعد ایک بورڈنگ ہاؤس کا قیام بھی عمل میں آیا تھا، جو آگے چل کر سرسید ہال کے نام سے موسوم ہوا، ۱۹۷۵ء میں یونیورسٹی اور ہال کے یوم تاسیس کی صدسالہ تقریب کے موقع پر ہال کے موجودہ طلبہ اور نگراں نے ایک خاص نمبر شائع کیا ہے، یہ تقریباً دو درجن مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں قدیم طلبہ نے اپنے علی گڑھ میں داخلہ سے قیام کے زمانہ تک کی روداد اور اقامتی زندگی کی سرگذشت قلمبند کی ہے، اس سے یونیورسٹی اور ہال کے ہر دور کی خصوصیات، اقامتی زندگی کے آداب، یونیورسٹی کے بعض قدیم اساتذہ، اس کے بانی سرسید احمد خاں مرحوم اور اس سے وابستہ دوسرے اہم اور ذمہ دار لوگوں کے متعلق مفید معلومات فراہم ہوتے ہیں، قدیم لوگوں میں میاں محمد امین، سید طفیل احمد منگلوری، خواجہ عبد العلی، میر ولایت حسین، ڈاکٹر شیخ عبد اللہ، سر رضا علی، عبد المجید قریشی، حکیم احمد شجاع اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے مضامین ماخوذ ہیں، متعدد نئے مضامین اسی نمبر کے لیے لکھے گئے ہیں، یہ سب مضامین موثر اور پڑھنے کے لائق ہیں، پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم، قاضی محمد عدیل عباسی، آل احمد سرور، محمد شفیع قریشی سابق وزیر مملکت ریلویز اور خود اس نمبر کے نگراں ڈاکٹر اصغر عباس کے مضامین خاص طور پر قابل توجہ ہیں، یہ نمبر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور سرسید ہال سے متعلق گذشتہ صدسالہ واقعات اور قدیم طلبہ کے تجربات و تاثرات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے سبھی کے لیے دلچسپ ہے، علی گڑھ سے تعلق رکھنے والے اصحاب تو خاص طور پر اس سے محظوظ ہوں گے، آخر میں مضمون نگاروں کا تعارف

بھی ہے لیکن طباعت مسلم یونیورسٹی کے معیار کے مطابق نہیں ہے اور کتابت کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں،

مسلمان اور وقت کے تقاضے - از مولانا عبد السلام قدوائی ندوی۔

تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۷ مجلد، قیمت ۔/ ۱۰ر

پتہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مکتبہ جامعہ نے مولانا عبد السلام قدوائی ندوی شریک ناظم دار المصنفین کا یہ دوسرا مجموعہ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، جو حسب ذیل گیارہ مضامین پر مشتمل ہے،
(۱) مسلمانوں کے لیے راہ عمل (۲) وقت کا تقاضا (۳) اسلام کا پیام امن و اتحاد (۴) دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر شود (۵) عبادت کا مفہوم (۶) روح قرآن۔ (۷) راہ ہدایت (۸) حدیث نبویؐ کے اولین صحیفے (۹) استقامت (۱۰) بے نفسی کی حیرت انگیز مثال (۱۱) ایمان کی تاثیر۔ اکثر مضامین میں موجودہ حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کے لیے راہ عمل تجویز کی گئی ہے، انھیں حسن اخلاق اور خدمت خلق کے جوہر سے آراستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسی طرح دنیا میں ان کی افادیت کا وزن محسوس کیا جائے گا، ان کے خلاف پھیلی ہوئی بدگمانیاں دور ہوں گی اور وہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کر سکیں گے، اس سلسلہ میں اسلاف کے موثر، سبق آموز اور ولولہ خیز واقعات بیان کیے گئے ہیں، امید ہے کہ ان مضامین کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے بہت مفید ہوگا، اور غیر مسلم بھی اسلام کی صحیح تعلیمات سے واقف ہوں گے،

پریم چند۔ مرتبہ پروفیسر پرکاش چند رگپت، مترجمہ جناب ل۔ احمد اکبر آبادی،

تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۱۸، قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

پٹنہ:۔ ساہتیہ اکاڈمی، رابندر بھون، نئی دلی۔

اردو ہندی کے نامور افسانہ و ناول نگار منشی پریم چند پر اردو میں پہلے بعض اچھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس نئی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اختصار کے باوجود پریم چند کی سیرت، شخصیت، حالات، کمالات، گھریلو زندگی، اردو ہندی خدمات، ناول، افسانہ اور ڈرامہ نگاری کے خصوصیات وغیرہ کا تجزیہ اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے، مصنف نے پریم چند کے خطوط کے علاوہ ان کے اعزہ و احباب کی تحریروں سے زیادہ مدد لی ہے، اسلیے یہ مستند بھی ہے، اس سے ان کے عہد، ماحول، ذہنی خیالات، سیاسی و قومی رجحانات، اور حب الوطنی کا خاکہ سامنے آجاتا ہے، مگر کہیں کہیں زبان و بیان کی فروگذاشتیں بھی ہیں، مثلاً" سنجیدہ اور گھریلو وصف شامل ہو گئے تھے" (ص۹)، پریم چند کے طویل مدت تک ...... (ص۲)، گاندھی جی کے ستیہ گرہ کی چھاپ ...... (ص۵)، مگر اسے ناانصافی کے سامنے جھکنا نہیں جانتا (ص۵) یہاں کاشتکاروں کا خون چوسنے والی اور ان پر جبر و ستم ڈھانے والے سب ہی اکٹھا ہو گئے ہیں (ص۵) اپنی عادۃً ہنسی میں ہنس کر بولے (ص۵) پر بس لگانا (ص۵) منصوبہ بھی پکا رہے تھے (ص۵) اس کی ذات میں مہاتما گاندھی کی کرداری خصوصیات ہندستان کے روایتی بھکاری کے پیشہ ...... (ص۶) تقدیم و تاخیر میں بھی بے احتیاطی ہو گئی ہے، مثلاً" ایک دوسری پڑھانے کی نوکری (ص۲۲) مزمن پیچش کے مرض (ص۲۴) ایک تین کمرے کے مکان ...... (ص۸۳) اردو املا میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے اردو ترقی بورڈ نے جو اصلاحی سفارشات پیش کی ہیں ان پر اگرچہ ابھی بحث کی گنجائش ہے، لیکن اس کتاب میں ان کو ملحوظ رکھا گیا ہے اسی لیے اقتباسات تک میں تصرف ہے جیسے مہینا، پتا، پیسا، نقشا، پانو، خطبۂ صدارت، حال آنکہ غتربود، مگر بعض لفظوں کا املا اس طرح بھی ہے، روپیہ، زمانہ، بھروسہ وغیرہ اور بعض لفظوں کا

املا دونوں طرح ہو مثلاً خاصہ، خاصا، خاکہ، خاکا، گاؤں، گانو وغیرہ۔ ایک زمانہ میں بلاضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال فیشن بن گیا تھا، آجکل بعض اہل قلم متبادل اردو لفظوں کے ہوتے ہوئے بھی خواہ مخواہ ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس کتاب سے اس کی چند مثالیں یہ ہیں: ماتر بھومی کے سچے سپوت، پتی، بر، دیوی، ماتا پتا، سورگ، آدرش وادی، جنتا، اندولن، بھرشٹا چاری، پوتر، شاید انکے استعمال کی وجہ یہ ہو کر ساہتیہ اکیڈمی اپنا خاص اسلوب پیش کرنا چاہتی ہو، یہ کتاب ہندی سے ترجمہ کی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے ترجمہ رواں اور بہتر ہے لیکن بعض الفاظ اور جملے ہو بہو ہندی اسلوب کا چربہ معلوم ہوتے ہیں جیسے ہندستانی ہتھیا، گھر گھسنے وغیرہ، جناب ل۔ احمد اکبر آبادی اردو کے مشہور اور ممتاز اہل قلم ہیں، معلوم نہیں انھوں نے اس قسم کی زبان اپنے ترجمے میں کیوں روا رکھی، مختصر ہونے کی وجہ سے یہ کتاب اسکول اور کالج کے طلبہ کیلئے مفید ہو، اگر بعض تشریح طلب باتوں اور ناموں پر مختصر حاشیے بھی لکھ دیے جاتے تو اس کی قدر و قیمت دوچند ہو جاتی۔

فہرست مخطوطات (جلد اول) مرتبہ مولانا سید محمد متین ہاشمی، مولانا ساجد الرحمن صدیقی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۲۹۴ مجلد، قیمت للعہ، ناشر: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، پاکستان۔

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری (لاہور) نے مخطوطات فراہم کر کے انکی تفصیلی فہرست شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں مصاحف، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، ادب اور طب وغیرہ مختلف فنون کی عربی و فارسی کتابوں کی فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے، مرتبین نے مخطوطات کے سائز، اوراق کی تعداد، شان خط، کاتبوں اور مصنفوں کے ناموں کی تصریح اور ترقیمہ، آغاز و اختتام کی عبارتوں کو نقل بھی کیا ہے، مخطوطات کی اہم خصوصیات اور مصنفین کے حالات بھی تحریر کیے ہیں، فہرست کے آخر میں کئی انڈکس اور بعض مخطوطات کے عکسی فوٹو بھی ہیں، اگر فہرست کی ترتیب بلحاظ مزید ظاہر ہوتی ہے لیکن مصنفین کے حالات اصل ماخذ کے بجائے ثانوی ماخذ سے لیے گئے ہیں اور مشہور مصنفین کے تذکرے میں خواہ مخواہ طوالت پیدا ہوگئی ہے۔ کتاب کی ... زیادہ ہے۔

۰ ‹عق›

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

۱۔ مہاجرین جلد دوم قیمت: ۹-۱۲

۲۔ سیر الصحابہ جلد ۶ " ۴-۹

امام حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں واقعۂ حزنیہ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳۔ سیر الصحابہ جلد ۷،

۴۔ تابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۵۰-۱۲

۵۔ تاریخ اسلام اول (عہد رسالت و خلافت راشدہ)

قیمت: ۵۰-۱۲

۶۔ تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰۰-۱۱

۷۔ تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول)

قیمت: ۰۰-۱۴

۸۔ تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)

قیمت: ۰۰-۱۵

۹۔ اسلام اور عربی تمدن قیمت ۶۸-۱۵

۱۰۔ عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱۔ ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲۔ دین رحمت قیمت: ۰۰-۱۰

۱۳۔ خریطۂ جواہر ۷۵-۴

زندگی کی آخری کتاب

۱۴۔ حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی علمی تعلیمی قومی ملی سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلاویز مرقع۔ اور اپنے اسلوب و طرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا مثنیٰ، دلکش، دلچسپ قابل مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے۔ قیمت: ۵۰-۲۷

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہونچ گیا ہے، مستشرقین کے جو غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بنا پر جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دار المصنفین کے رفقاء محققین نے ان کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دیئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں،

مکمل فائلوں کی تفصیل

سنہ ۱۹۳۳ء — سنہ ۱۹۳۷ء، سنہ ۱۹۳۸ء، سنہ ۱۹۳۹ء

سنہ ۱۹۷۱ء

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں،

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰　　　　مئی سنہ ۱۹۷۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ـ عبدالسلام قدوائی ندوی

......o)✻(o......

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(مہتمم سید اقبال احمد)

جلد ۱۲۰ ماہ جمادی الاول ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۷ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

گذشتہ ماہ اتر پردیش کی اردو اکاڈمی کے سالانہ جلسہ کے خطبۂ صدارت میں بیگم حامدہ حبیب اللہ نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اگر اتر پردیش میں اُردو کو علاقائی اور سرکاری زبان کو تسلیم کرنے کے فیصلہ میں وقت درکار ہو تو فوری طور پر کم از کم آٹھویں درجہ تک اردو کی تعلیم سکنڈ فارم کی حیثیت سے ضروری قرار دی جائے، یہ مطالبہ ایسا نہیں ہے جو قابل قبول نہ ہو، البتہ اس میں حکومت کی فراخدلی اور رواداری کے ساتھ ع گلستاں میں نسیم دل شکن کی آزمائش ہے،

بیگم حامدہ حبیب اللہ اپنی صدارت کے فرائض بہت ہی جمہوری انداز میں انجام دیتی ہیں، جلسہ کی کارروائی میں مفید مشوروں کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتی ہیں، مباحثہ کی فضا کبھی مکدر ہو جاتی ہے تو وہ اپنے تکدر کا اظہار بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کرتی ہیں، انھوں نے اپنے خطبہ میں اس کا اعتراف کیا کہ نادانستگی میں اکاڈمی سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے، مگر اُن کی خواہش ہے کہ اس کی طرف توجہ نیک نیتی سے مبذول کرائی جائے تاکہ اس کا ازالہ ہو، ورنہ ان کا خیال ہے کہ صرف مخالفت کے جذبے میں اعتراضات کی بوچھار سے اردو کا بھلا نہ ہوگا،

اُن کی ہمنوائی جناب آنند نرائن ملا بھی کرتے ہیں، جو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ کے صدر ہیں، اردو زبان نے ہندوستان کی جس ملی جلی تہذیب کو سنوارا ہے وہ اس کی پوری نمایندگی کرتے ہیں، وہ اردو زبان کو اپنی شیریں بنا کر اس کے فرہاد بنے ہوئے ہیں، گو ابھی تک ان کو وہ تیشہ ہاتھ نہیں آیا ہے جس سے وہ اپنی شیریں کے لئے جوئے شیر جاری کر سکیں، اکاڈمی کے جلسہ کے بعض رکن جب کبھی اعتراضات کی بوچھار کرتے ہیں، تو ان کے جواب میں اُن کی بردباری اور شرافت اخلاق کے آبدار موتی جھلملاتے نظر آتے ہیں، وہ ایک لائق جج بھی رہ چکے ہیں، اسلئے اُن کی سوچی سمجھی رائے ہے کہ اُردو کی فلاح و بہبود کی ساری سرگرمیاں بے سود ہیں، جب تک کہ ریاست میں اس کو سرکاری

اور علاقائی زبان ہونے کا حق نہیں مل جاتا ہے، اور یہ بالکل صحیح ہے،

اگر اس کو یہ قانونی حق مل جائے، تو اس کی اقتصادی قدریں بھی بڑھ جائیں گی، جب تک طلبہ کو اس کا احساس نہ ہوگا کہ اسکی تعلیم سے ان کی معاشی حالت بھی درست ہو سکتی ہے، وہ اسکو پڑھنے کیلئے تیار نہیں ہونگے، ایسے طلبہ کی تعداد بہت تھوڑی ہوا کرے گی جو اُس کو ایک مادری زبان کی حیثیت سے اپنے سینہ سے لگائے رکھنا پسند کرینگے، آنند نرائن مُلا صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ اردو زبان کا پانی پت اتر پردیش ہے یعنی اس ریاست میں اردو کی جنگ جیتی اور ہاری بھی جا سکتی ہے، یہ جنگ لڑنے کے بجائے اکاڈمی کی سرگرمیاں احتساب اور محاسبہ کے دور سے گذر رہی ہیں،

اس کے سکریٹری جناب صباح الدین عمر صاحب کو ان کی محنت اور تندہی کی داد ضرور ملتی ہے، مگر اکاڈمی کے جنرل کانسل کے جلسہ میں اُن کی نگاہیں ارکان کو دیکھ کر زبان حال سے کہتی رہتی ہیں کہ اُن کے لئے وہ ہی گھڑیاں سخت گزرتی ہیں، ع :- اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد،

ان سے جو بعض سوالات کئے جاتے ہیں اُن کے صحیح ہونے میں تو اُن کو بھی شک نہیں ہوتا مگر کچھ اعتراضات کے انداز تخاطب اور شیوہ تکلم میں ایسے بھی لمحات آجاتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے یہ خیال آجاتا رہتا ہے کہ یہ اکاڈمی کے چیدہ دل و دماغ کا بہت ہی شائستہ مجمع ہے،

اکاڈمی اپنی مختلف سرگرمیوں میں پہلے سے بہت زیادہ ترقی کر گئی ہے، اس کا سالانہ بجٹ سترہ لاکھ ۱۷۰۰۰۰۰ تک پہنچ چکا ہے، مگر جب تک اردو کو اس ریاست میں سرکاری زبان کا درجہ نہیں ملتا، یہ سترہ لاکھ کا سالانہ بجٹ اردو کا ایک اچھا خونبہا ہے، دیاشنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست، اور پریم چند کی زبان کیلئے جب اردو سن کا سامان ہو چکا، سرسید، شبلی، شرر، اور مہدی افادی کے اسلوب بیان کی سادگی، رعنائی اور دلآویزی کی تدفین کی تیاری ہو چکی، حسرت نے پرچھائیوں کو جو آب رنگ دیا تھا، جگر کی شاعری میں عشق کی بندگی اور بیچارگی حسن کی تمام جابرانہ استبدادیت پر طنز کے ساتھ جو مسکراتی نظر آتی تھی، فانی نے غم کی روح پگھلا کر اس سے آگ کا کام لینے والی جو تاثیر پیدا کی تھی ان سب کو بھلا دینے کی مہم پوری ہو چکی، تو اُردو کو صرف کفن پہنانے کی ضرورت تھی، حکومت نے اس کو ناتواں پاکر اس کو ہلکا کفن پہنانے میں اپنے آنچل کا سایہ اردو اکاڈمی کی صورت میں دیدیا، جو آوازِ د

ناسخ کو اپنے معشوق کے ذریعہ سے پوری نہیں ہوئی تھی، وہ اُن کی اضطراب زدہ، جفا دیدہ اور اجل رسیدہ زبان اردو کے ذریعہ سے پوری ہوتی نظر آئی، ناسخ نے اسی سرزمین میں اردوے معلیٰ کو اردوے معلا بنا کر ایک مرمریں محل میں بٹھا دیا تھا، مگر وہ آج وہیں غریب الوطن ہے، اس کو کہیں گھنی چھاؤں نہیں مل رہی ہے،

اگر حکومت اردو اکاڈمی کو اپنی امداد بند کردے، اس کی طرف سے مصنفوں کو انعامات بھی نہ ملیں، طلبا و طالبات اُس کے وظائف سے بھی محروم ہوجائیں، نادار بیمار مصنفوں کو علاج کے لئے مالی سہولتیں بھی نہ دی جائیں، اکاڈمی کے لئے عمارت بھی نہ بنے، تو اردو بولنے والوں کو کوئی شکایت نہ ہوگی بشرطیکہ اُردو ریاست کی ایک سرکاری اور علاقائی زبان تسلیم کرلی جائے، مگر حکومت اردو کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے، وہ اس کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لئے آمادہ نہیں، یہ شاید اس لئے بھی کہ اردو بولنے والوں میں اس کو آمادہ کرنے کا دم خم بھی نہیں، اس کے بعد اردو اکاڈمی کی حیثیت بس یہ ہے کہ

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک گلی بہاراں کی　　　بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

جب اپنی بے بسی اور مجبوری میں گریباں کی دھجی ہی غنیمت ہے تو ہوش مندی سے اکاڈمی کو فعال اور متحرک بنانے ہی میں مصلحت ہے، جو شاید یہ کہکر حکومت پر اثر انداز ہو کہ ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا، بدلے ہوئے حالات میں حکومت میں عزا خدلی اور اپنے شہریوں کی دلنوازی اور دلجوئی کا جو جذبہ پیدا ہو رہا ہے اس بنا پر کیا عجب ہے کہ اردو بولنے والوں کو وہ قانونی حق مل جائے، جو وہ اپنی کوتاہیوں اور مجبوریوں سے خود نہیں منوا سکتے،

ان سطروں کے لکھتے وقت خبر ملی کہ بہار میں اردو زبان وہاں علاقائی اور سرکاری زبان تسلیم کرلی گئی، جہاں اس کے بولنے والے پندرہ فی صدی ہیں بہار کی اس سبقت سے آتش انیس، دبیر، اکبر الٰہ آبادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہم وطنوں کو یہ پیام ملا ہے کہ وہ اپنی گراں خوابی کو چھوڑ کر اپنی جگر تابی کا ثبوت دیں، ورنہ ان پر یہ الزام رہے گا،

ع :- عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے

……⁂……

مقالات

اسلام میں مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۴)

ایک حج کے موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے تمام عاملوں کو طلب کیا، جب انکے ساتھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تو ان سے مخاطب ہو کر فرمایا "لوگو! میں نے ان عمال کو تمھاری نگرانی کے لیے بھیجا ہے، ان کو اس لیے نہیں مقرر کیا ہے کہ تمھارے مال، جان، عزت اور آبرو پر دست درازیاں کریں، اگر تم میں سے کسی پر ظلم ہوا ہو تو وہ کھڑا ہو جائے، پورے مجمع میں سے صرف ایک آدمی کھڑا ہو کر بولا امیر المومنین! آپکے ایک عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں، حضرت عمرؓ نے اس آدمی کو حکم دیا کہ وہ بھی ان کے سامنے عامل کو سو کوڑے مارے، یہ سن کر حضرت عمروؓ بن العاص اٹھے اور بولے، امیر المومنین! اگر ایسا کیا گیا تو یہ روایت بن جائے گی، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس شخص کو اس عامل سے قصاص نہ دلواؤں، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سے قصاص لیتے دیکھا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے بیچ بچاؤ کر کے مستغیث کو ایک ایک تازیانہ کے بجائے دو دو اشرفیاں دے کر راضی کیا۔ (کتاب الخراج باب ۱۲ فصل ۱)

حضرت عمرؓ کو معلوم ہو جاتا کہ کوئی عامل اپنے نمود و ترفع کا اظہار کرتا ہے، بیمار کی عیادت نہیں کرتا ہے، کمزور اس کے دربار میں پہنچ نہیں پاتے ہیں تو اس کو معزول کر دیتے، انھوں نے اپنے عاملوں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ ترکی گھوڑے پر نہ سوار ہوں، باریک کپڑے نہ پہنیں، چھنا ہوا آٹا نہ کھائیں، دروازہ پر دربان نہ رکھیں، اہل حاجت کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھیں، اگر کوئی ان ہدایتوں کی خلاف ورزی کرتا تو اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرتے، اس کے لیے جو سزا تجویز کرتے تو اس کی تعمیل ضرور ہوتی، ان کی ان سختیوں کی وجہ سے انکا نظامِ مملکت ایسا اعلیٰ اور عمدہ رہا کہ آج وہ دنیا کے بہترین حکمرانوں میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کی کامرانی کا راز یہ تھا کہ ان کا دل خدا کے بارہ میں نرم ہوتا تو جھاگ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتا، سخت ہوتا تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا،

ان کو اپنی مملکت میں کسی باغیانہ سازش کی خبر مل جاتی تو اس کو فرو کرنے میں بھی پوری سختی سے کام لیتے، یہ سازش اگر غیر مسلموں کی ہوتی تو ان کو سزا دینے میں تامل تو نہیں کرتے لیکن اس میں بھی ان کی رحمدلی، لینت اور رواداری بروئے کار آجاتی، شام فتح ہوا تو اس کی آخری سرحد پر ایک شہر عربسوس تھا، یہاں کے لوگوں سے معاہدہ ہو گیا، مگر وہ چپکے چپکے ایشیائے کوچک کے رومیوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کے راز ان کو بتاتے تھے، حضرت عمرؓ کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہاں کے حاکم عمیرؓ بن سعد کو لکھ بھیجا کہ ان کو ایک برس کی مہلت دو کہ وہ اپنی سازش سے باز آئیں، اور اگر باز نہ آئیں تو ان کی جائداد، زمین، مویشی اور اسباب کو شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دیدو اور ان سے کہو کہ کہیں اور چلے جائیں، اس حکم کی تعمیل کی گئی،

(بلاذری اردو ترجمہ ص ۲۵۵، عربی ص ۱۵۷، الفاروق جلد دوم ص ۴۶-۱۴۵)

نجران کے عیسائیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا تھا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ

اس کی توثیق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کی لیکن عہد فاروقی میں پتہ چلا کہ وہ باہر کے لوگوں سے ساز باز کر کے اپنے پاس اسلحہ جمع کر رہے ہیں، حضرت عمرؓ کو اندازہ ہو گیا کہ اب وہ مسلمانوں کیلئے خطرہ بنکر نقصان پہنچائیں گے، اس لیے ان کو نجران یمن سے نکل کر نجران عراق میں چلے جانے کا حکم دیا، لیکن اس جلاوطنی کے وقت یہ فرمان جاری کیا کہ نجران یمن چھوڑتے وقت وہ اللہ کی امان میں رہیں گے، کوئی مسلمان ان کو نقصان نہ پہنچائے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدہ کر کے ان کو امان دیا تھا، اس کی توثیق حضرت ابوبکرؓ نے بھی کی تھی، شام اور عراق کے امیر ان کو کھیتی کرنے میں مدد کریں، وہ راہ خدا میں ان کو صدقہ بھی دیں، ان سے کسی طرح کا تاوان نہ لیا جائے، ان پر ظلم کرنے والوں کے خلاف کارروائی کیجائے، ان پر جو جزیہ عائد کیا گیا ہے وہ ان کے پہنچنے کے بعد سے دو سال تک معاف کر دیا جائے، ان پر کوئی زیادتی اور دست درازی نہ کیجائے (کتاب الخراج، باب ۹، فصل ۱)

خیبر کے یہودیوں نے ایسی باغیانہ روش اختیار کی کہ نہ صرف مسلمانوں کے معاملات میں خیانت کی اور ان میں تباہی پھیلانی چاہی بلکہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبد اللہؓ کو بالاخانہ سے نیچے پھینک دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے، حضرت عمرؓ نے ان کو خیبر سے جلاوطن کیا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان سے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ وہ نصف زمین اور نصف پیداوار کے حصہ دار ہوں گے، اس لیے حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کرتے وقت نصف زمین اور نصف پیداوار کے معاوضے میں سونے چاندی اور اونٹوں کے پالان دیئے (فتوح البلدان عربی ص ۲۲، ۲۵، اردو جزء اول ص ۴۹، ۳۸)

فدک کے یہودیوں نے بھی سیاسی بغاوت کی، تو حضرت عمرؓ نے ان کو بھی جلاوطن کیا، مگر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی زمین اور اپنے نخلستان کے نصف حصہ پر مصالحت

کی تھی، اس لیے حضرت عمرؓ نے ان کو جلا وطن کرتے وقت نخلستان اور آراضی میں ان کا جتنا حصہ ہوتا تھا، اس کی عادلانہ قیمت تجویز کرنے کے لیے چند واقف کاروں کو بھیجا اور انھوں نے جو تجویز کی اس کے مطابق قیمت دیدی گئی (فتوح البلدان جزو اول، اردو ص ۹۹، عربی ص ۳۱)

ایک بار قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو ہلاک کر دیا، حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا جائے، اس حکم کی تعمیل ہوئی، قاتل حنین نامی کو مقتول کے وارثوں نے قتل کر ڈالا (الدرایہ فی تخریج الھدایہ ص ۲۹۰، الفاروق ج ۲ ص ۱۳۸)

ایک بار حضرت عمرؓ بیٹھے حضرت علیؓ سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی آیا اور بولا کہ وہ (حضرت) علی پر دعویٰ کرنے آیا ہے، امیر المومنین حضرت عمرؓ نے یہ سنکر حضرت علیؓ کو مخاطب کرکے فرمایا، ابوالحسن سامنے کھڑے ہو کر جواب دو، حضرت علیؓ اٹھے تو انکے چہرہ پر بل تھا، دعویٰ سنا گیا، مدعی جھوٹا ثابت ہوا، وہ چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا، جب ان کو کھڑے ہو کر جواب دینے کو کہا گیا تو وہ چین بجبیں تھے، کیا وہ یہودی کے برابر کھڑے ہو کر جواب دینا پسند نہیں کرتے تھے، حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ یہودی کے برابر کھڑے ہونے میں چین بجبیں ہونے کا سوال نہ تھا، مگر جب ان کو ابوالحسن کہہ کر کھڑے ہونے کو کہا گیا تو کنیت سے پکارنا نشان عزت ہے، خیال ہوا کہیں یہودی یہ نہ سمجھے کہ عدالت کو مدعا علیہ کا خاص لحاظ ہے، اسی لیے مدعی کے مقابلہ میں عزت کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے، اگر وہ ایسا سمجھ لیتا تو ہماری عدالت پر دھبہ لگتا (رحمۃ للعالمین، جلد سوم، از قاضی محمد سلیمان منصور پوری ص ۱۵۴)

حضرت عمرؓ کا ایک غلام عیسائی تھا، اس کو وہ اسلام قبول کرنے کی ترغیب دیتے، مگ

اس پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا، فرماتے کہ مذہب میں زبردستی نہیں، غلام ان کی زندگی میں عیسائی ہی رہا،
(کنز العمال بحوالہ طبقات ابن سعد جلد پنجم ص ۴۹ ، الفاروق ج ۲ ص ۱۴۳)

حضرت عمرؓ نے اپنے عمال اور لشکریوں میں اسلام کی سچی تعلیمات کی ایسی روح پھونک دی تھی کہ ان کے خوف خدا، اتباع سنت، تقویٰ، زہد، تواضع، خدمت گذاری خلق، مہمان نوازی، راستبازی، عدل، ترحم، مساوات، مخالفین سے حسن سلوک سے متاثر ہو کر مفتوحہ ممالک کے غیر مسلم خود بخود اسلام قبول کرتے چلے گئے، شام میں اسلامی لشکر پہنچا تو رومیوں کے سفیر جارج نے اسلام قبول کر لیا۔ (طبری ص ۲۰۹۸)، مصر کے شہر شطا کا رئیس دو ہزار آدمیوں کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوا (مقریزی ج ۱ ص ۲۲۶)، دمشق میں وہاں کا بشپ حضرت خالد بن ولیدؓ کے پاس آکر مسلمان ہوا (معجم البلدان ج ۷، ص ۱۴۳)، جلولہ کی فتح کے بعد یہاں کے امرا اور رؤسا خود اسلام لے آئے (فتوح البلدان عربی ص ۲۷۴، اردو جلد اول ص ۴۵۸)، قادسیہ کے معرکہ کے بعد ایران کا شاہی رسالہ چار ہزار لشکریوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا (فتوح البلدان عربی ص ۲۸۹، اردو جلد اول ص ۴۸۳،۴۸۴)، یزدگرد کے بعض فوجی افسر مسلمان ہوئے تو سیابجہ، زط اور اندغار جیسی قومیں بھی اسلام لے آئیں (فتوح البلدان ص ۳۰۲، اردو ج ۲ ص ۱۹)، مصر کے بعض قصبے کے لوگ بھی مسلمان ہوئے (مقریزی ج اول ص ۱۹۲) دمیاط کی فتح کے بعد بقارہ سے لیکر عسقلان تک پوری آبادی مسلمان ہو گئی (مقریزی ج ۱ ص ۱۸۴ نیز دیکھو تاریخ اسلام ج ۱ ص ۲۱۹ از شاہ معین الدین احمد ندوی) اور پھر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عراق، شام، مصر اور ایران کے سارے علاقے کی آبادی رفتہ رفتہ اسلام اس طرح قبول کرتی گئی کہ ان میں مسلمانوں کی اکثریت بڑھتی گئی اور وہ اسلامی ممالک کہلانے لگے، یہاں مسلمان اپنے روادارانہ کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش نہ کرتے تو ان کا اسلام کی طرف مائل ہونا کیسے

ممکن تھا، تھوڑے سے لوگوں پر تو جبر اور دباؤ ڈالا جاسکتا مگر پورے علاقے کو زور اور جبر و دستی سے کسی مذہب کی طرف مائل کرنا انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے،

حضرت عثمان ذی النورینؓ کی رواداری | حضرت عمرؓ کے زمانہ میں غیر مسلموں کے ساتھ جتنے معاہدے ہوئے تھے، وہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں برقرار رہے، اور جو نئے علاقے فتح ہوتے گئے وہاں بھی وہی روادارانہ اسپرٹ باقی رہی جس کی تعلیم رسول اللہؐ نے دی تھی، وہ تو اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل میں اپنے محبوب آقاؐ کی اتباع کرتے رہتے۔ ان کا عہد بعض اسباب کی بنا پر پرآشوب رہا، پھر بھی اسلام کے لشکریوں کی جانبازی سے طرابلس، الجزائر، قبرس، طبرستان، آرمینیہ وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے، ان کے زمانہ میں بغاوتیں بھی بہت ہوتی رہیں، ان کی طبیعت میں لینت، نرمی اور مروت بہت تھی، مگر ان بغاوتوں کو تشدد و تلطف کی حکمت عملی سے فرو کرتے رہے، مفتوحہ ممالک کی خوشحالی اور بدحالی سے باخبر رہنے کے لیے جلیل القدر صحابیوں کے وفود وہاں بھیجا کرتے، جمعہ کے دن منبر پر بیٹھکر اطراف ملک کی خبریں پوچھتے، اور عام اعلان کر رکھا تھا جس کسی کو کسی والی سے شکایت ہو، وہ حج کے موقع پر آکر بیان کرے، اس موقع پر تمام عمال کو بھی لازمی طور پر طلب کر لیتے تاکہ شکایتوں کی تحقیقات آسانی سے ہوسکے (طبری ص ۲۹۴۳، مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۴۳)

ان کے زمانہ میں نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں نے کچھ زیادتیاں کیں تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر اس کی شکایت کی، اس وقت وہاں کے حاکم ولید بن عتبہ تھے، حضرت عثمانؓ نے ان کو لکھ بھیجا کہ عراق میں نجران کے جو باشندے ہیں، ان کے اسقف عاقب اور سردار نے میرے پاس آکر شکایت کی ہے، اور مجھے وہ شرط دکھائی ہے جو عمرؓ نے انکے ساتھ طے کی تھی، مجھے معلوم ہوا کہ مسلمانوں سے ان لوگوں کو کیا نقصانات پہنچے ہیں، میں نے انکے جزیہ میں سے تیس جوڑوں کی تخفیف کردی، انھیں میں نے اللہ جل شانہ کی راہ میں بخش دیا ہے،

ریں نے ان کو وہ ساری زمین دیدی جو عمرؓ نے ان کو لینی زمین کے عوض صدقہ کی تھی، اب
ان کے ساتھ بھلائی کرو کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں ذمہ حاصل ہے، میرے اور ان کے
لقات بھی اچھے رہے ہیں، عمرؓ نے ان کے لیے جو صحیفہ تحریر کیا تھا اس کو غور سے دیکھ لو
راس میں جو کچھ درج ہے، وہ پورا کرو (کتاب الخراج اردو ترجمہ ص ۲۷۶)

ان کی خواہش رہی کہ ان کے محبوب آقاؐ کی تعلیمات کی تبلیغ زیادہ سے زیادہ ہوتی
ہے، مگر ان کا خود طریقہ یہ رہا کہ جو قیدی گرفتار ہو کر ان کی خدمت میں پیش کیے جاتے تو
ن پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کے بجائے دین متین کے صرف محاسن بیان کرتے، ایک بار بہت سی
دمی لونڈیاں گرفتار ہو کر آئیں، معمول کے مطابق ان کے پاس جا کر اسلام کی خوبیاں
ن کو بتائیں، ان میں سے صرف دو لونڈیوں نے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا، بقیہ اپنے
ال پر قائم رہیں (خلفائے راشدین از حاجی معین الدین ندوی ص ۲۴۴ بحوالہ الادب المفرد
ب خفض المرأة

حضرت علیؓ کی مذہبی رواداری حضرت علی مرتضیٰؓ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت بھی زیادہ تر پر آشوب
شور رہا، ان کے خلافت کی مدت پانچ سال رہی، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے قصاص
کے جھگڑے، خارجیوں اور سبائیوں کی فتنہ انگیزیوں کے خلاف جنگ، امیر معاویہؓ
سے اختلاف اور لیلۃ الحریر کی لڑائیوں، عجم، کرمان اور فارس میں بغاوتوں کی
بدولت ان کو وہ سکون حاصل نہ ہو سکا جو حکمرانی کے لیے ضروری ہے، مگر انھوں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ میں تربیت پائی تھی، اس لیے زہد، تقویٰ، عبادت،
تواضع، انفاق فی سبیل اللہ، حسن سلوک میں جو اعلیٰ نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں وہ ان کی
زندگی میں ملتے ہیں، شجاعت میں کوئی معاصر آپ کا حریف نہ تھا، مگر وہ برابر رسول اللہ کی

اس حدیث پر عمل فرماتے رہے کہ بہادر وہ نہیں ہے جو دشمن کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے، ان کی زندگی کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک لڑائی میں ایک یہودی کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر سوار ہوگئے، اور اس کو ہلاک کرنا چاہتے تھے کہ اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا، تو یکایک اس کے سینہ پر سے اتر کر علٰحدہ ہوگئے، یہودی نے متعجب ہوکر اس طرح علٰحدہ ہونے کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ پہلے تم کو خدا کی خاطر ہلاک کرنا چاہتا تھا، تم نے میرے منہ پر تھوکا تو اب میں تم کو ہلاک کرتا تو اپنے نفس کی خاطر کرتا جو صحیح نہیں ہوتا، یہ سنکر یہودی مسلمان ہوگیا،

وہ اپنے حسن سلوک کی وجہ سے بیحد مقبول رہے، ان کے اسی وصف پر بھروسہ کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اشاعت اسلام کا کام برابر لیتے رہے، فتح مکہ بعد حضرت خالدؓ ابن ولید بنو خذیمہ میں تبلیغ اسلام کے لیے مامور ہوئے، اس قبیلہ نے پہلے تو اسلام قبول کرلیا، پھر منحرف ہوگئے، حضرت خالدؓ نے ان میں سے کچھ لوگوں کو قید اور کچھ کو قتل کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو آپ کو دکھ ہوا، آپ کو حضرت علیؓ کے حسن معاملہ کی کارکردگی پر پورا اعتماد تھا، اس لیے آپنے اس غلطی کی تلافی کے لیے بنی خذیمہ کے پاس بھیجا، حضرت علیؓ نے رواداری سے کام لیا، قیدیوں کو رہا کردیا اور مقتولین کے وارثوں کو خونبہا دیا (فتح الباری ج ۸ ص ۴۹)، اسی طرح حضرت خالدؓ یمن تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تو وہ وہاں بھی ناکام رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہاں کے لیے حضرت علیؓ کا انتخاب کیا حضرت علیؓ پہلے تو اس کام کو دشوار سمجھے، مگر آپ نے ان کے سینہ پر دست مبارک رکھکر دعا فرمائی کہ "اے خدا اس کی زبان کو راست گو بنا، اور اس کے دل کو ہدایت کے نور سے منور کردے"۔ اس کے بعد ان کے سر پر عمامہ باندھا اور سیاہ علم دے کر یمن کی طرف روانہ کیا، حضرت علیؓ نے

اپنے حسن تدبیر اور حسن سلوک سے وہاں کا رنگ کچھ ایسا بدل دیا کہ ہمدان کا پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا (فتح الباری ج ۸ ص ۵۲، خلفائے راشدین ص ۸۳-۲۸۲)

خارجی حضرت علیؓ کے خلاف برابر سازش کرتے رہے، وہ مجوسیوں، مرتدوں، نومسلموں اور ذمیوں کو بغاوت پر آمادہ کرتے رہتے، مگر حضرت علیؓ نے ان کی بغاوتوں کو بڑے صبر و تحمل سے فرو کیا اور جب وہ زیر ہو جاتے تو ان سے لطف و ترحم کا برتاؤ کرتے، ایرانی باغی ان کے فیاضانہ سلوک سے یہ کہہ اٹھے تھے کہ امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب کے طریق جہاں بانی نے تو نوشیروانی طرز حکومت کی یاد بھلادی،

وہ مسلمانوں کی مذہبی بے اعتدالیوں کو گوارا نہیں فرماتے، سبائی ان کو خدا کہنے لگے تو فرمایا کہ ان کو سزا دینا بھی مذہب کی بڑی خدمت ہے، خدا کی وحدانیت کے غلبہ میں کچھ زندیقوں کو انھوں نے زندہ جلا دینے کی سزا دی، مگر جب حضرت ابن عباسؓ نے ان کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سزا کی ممانعت فرمائی ہے، تو اس سے ندامت کا اظہار فرمایا (کتاب الخراج ص ۹۹) مگر ذمیوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت و محبت کا برتاؤ رکھا، حضرت عمرؓ نے ان سے جتنے معاہدے کیے تھے ان کو برقرار رکھا، حضرت عمرؓ نے حجاز کے عیسائیوں کو نجران یمن سے جلاوطن کرکے نجران عراق میں آباد کرادیا تھا، کیوں کہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف گھوڑے اور اسلحہ جمع کرنے شروع کر دیے تھے، حضرت علیؓ کے زمانہ میں وہ واپس آنا چاہتے تھے، اور جب حضرت علیؓ سے اس کے لیے درخواست کی تو انھوں نے منظور کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ عمرؓ کے فیصلے بہت موزوں ہوتے تھے، پھر بھی ان کے لیے یہ تحریر لکھ دی کہ تم لوگ میرے پاس اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر لیکر آئے ہو جس میں تمھارے لیے تمھاری جان، تمھارے مال کے سلسلے میں شرط لکھی ہے، تمھارے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ اور

عمرؓ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ میں نے پورا کر دیا، لہذا اب جو مسلمان ان کے یہاں جائے اسے ان وعدوں کو پورا کرنا چاہیئے جو ان کے ساتھ کئے گئے ہیں، نہ ان کو دبایا جائے، نہ ان کے ساتھ ظلم کیا جائے، نہ ان کے حقوق میں سے کسی قسم کی کمی کیجائے (کتاب الخراج ص ۱۷۸۔۱۷۷، اردو ترجمہ)

حضرت علیؓ ذمیوں کے حقوق کی پامالی کسی حال میں گوارا نہیں کرتے، ان کے ایک عامل عمرو بن مسلمہ کی درشتی اور سخت مزاجی کی شکایت ذمیوں نے کی تو حضرت علیؓ نے ان کو لکھ بھیجا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھارے علاقے کے ذمی دہقانوں کو تمھاری درشت مزاجی کی شکایت ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے، تم کو نرمی اور سختی دونوں سے کام لینا چاہیئے۔ لیکن سختی ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے اور نرمی نقصان کی حد تک نہ ہو، ان پر جو مطالبہ واجب ہے، اس کو وصول کیا کرو، لیکن ان کے خون سے اپنا دامن محفوظ رکھو۔" اسی طرح ذمیوں کی آبپاشی کی ایک نہر پٹ گئی تھی تو وہاں کے عامل قرظہ بن کعب کو حضرت علیؓ نے لکھ بھیجا کہ اس نہر کو آباد کرنا مسلمانوں کا فرض ہے، میری عمر کی قسم مجھے اس کا آباد رہنا زیادہ پسند ہے، بہ نسبت اس کے کہ وہاں کے لوگ ملک سے نکل جائیں یا عاجز و درماندہ رہ کر ملک کی بھلائی میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں (یعقوبی ج ۲ ص ۲۳۹-۲۰۴ و تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی جلد اول ص ۳۶۸)

ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ کہیں گر پڑی، اس کو ایک نصرانی نے اٹھا لیا، انھوں نے اس کو دیکھ کر پہچان لیا۔ نصرانی نے زرہ دینے سے انکار کر دیا، حضرت علیؓ نے خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا، قاضی نے انسے پوچھا کہ آپ کے پاس آپ کی اس زرہ ہونے کا ثبوت ہے؟ وہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے، تو قاضی شریح نے نصرانی کے حق میں فیصلہ کر دیا، جس سے وہ متاثر ہو کر بولا کہ

یہ تو انبیاؑ کے جیسا انصاف ہے، امیرالمومنین مجھکو اپنی عدالت کے قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور قاضی ان کے خلاف فیصلہ دیتا ہے، اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا (ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۰، تاریخ اسلام جلد اول ص ۳۶۹)

حضرت علیؓ جب کوئی فوجی دستہ کہیں روانہ کرتے تو اس کو مخاطب کرکے فرماتے:

"میں تم کو اس اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں جس سے تمھیں لامحالہ ملنا ہے، اس کے علاوہ تمھاری منزل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ وہی دنیا اور آخرت کا مالک ہے، دیکھو! جس مہم پر تم روانہ کیے جا رہے ہو اس کا پورا اہتمام کرنا اور ایسے کام کرنا جو تمھیں اللہ عزوجل سے قریب کریں، کیونکہ دنیا کی وہی چیز کام آئے گی جو اللہ کے پاس پہنچ گئی۔" (کتاب الخراج فصل ۲، اردو ترجمہ ص ۱۳۱)

حضرت علیؓ کے فیاضانہ سلوک کی اعلیٰ ترین مثال وہ ہے جب ان کا قاتل ابن ملجم ان کے بستر مرگ کے پاس لایا گیا تو اسکو دیکھکر فرمایا اس کو اچھا کھانا کھلاؤ، اس کو نرم بستر پر سلاؤ، اگر میں زندہ بچ گیا تو اس کو معاف کرنے یا قصاص لینے کا اختیار مجھے حاصل ہوگا، اور اگر میں مرگیا تو خدا کے سامنے اس سے جھگڑ لوں گا، پھر یہ بھی وصیت کی کہ اس سے قصاص معمولی طور پر لیا جائے، یعنی اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ نہ کاٹے جائیں۔" (طبقات تذکرہ علیؓ بن ابی طالب، تاریخ اسلام جلد اول ص ۳۶۲)

اصلی اسلامی تعلیمات اسلام کی تعلیمات وہی ہیں جو قرآن مجید اور حدیث شریف میں ہیں، یا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ یا خلفائے راشدین کے حالات کے سلسلہ میں پائی جاتی ہیں، اس دور میں کوئی ایسی مثال نہیں ملے گی جس سے اسلام کی تبلیغ میں زور، جبر، زبردستی یا تشدد استعمال ہوا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے کہ دین کے بارے میں

کسی قسم کا جبر نہیں، اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ	اگر تیرا پروردگار چاہتا (کہ لوگوں
فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا	کو مومن بنادے) تو زمین کے سب لوگ
اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا	ایمان لاتے، تو کیا اے پیغمبر لوگوں پر
مُؤْمِنِيْنَ (یونس - ۱۰)	زبردستی کریگا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

آپ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بھی حکم ملا تھا، جنگ کے بعد جو لوگ پُرامن طریقہ سے رہنا چاہتے ہوں تو ان پر مذہب کے معاملہ میں کوئی زور اور دباؤ نہ ڈالا جائے، ان کے خلاف کوئی مذہبی جنگ بھی نہ کی جائے۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ	تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں، پھر
وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا	نہ لڑیں اور تمھارے سامنے صلح کی
جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ	طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر
سَبِيْلًا (نساء - ۱۲)	حملہ کرنے کی راہ نہیں دی،

آپ نے تو اپنے کسی قیدی پر بھی اسلام لانے پر جبر نہیں ڈالا، آپ قیدیوں کو کلام پاک سناتے، اسلام لانے کی تلقین کرتے، اگر وہ اسلام نہ لاتے تو ان کو امن کی کی جگہ پہنچا دیتے، کلام پاک میں لڑائی کے میدان میں بھی دشمنوں سے رواداری کی تلقین کی گئی ہے

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ	اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى	میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسکو
يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ	پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام

مَامَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (توبہ - ۱۰)　　سن لے، پھر اسکو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے، یہ اسلیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں،

اس کا ذکر پہلے آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو خیبر کی مہم پر بھیج رہے تھے تو حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنالیں، ارشاد ہوا کہ نرمی سے ان کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمھاری ہدایت سے اسلام لے آئے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے، اس کا بھی ذکر آچکا ہے کہ حضرت عمرؓ کا ایک غلام عیسائی تھا، اس کو چاہتے تو اپنی تلوار کے ذریعہ سے مسلمان بنا سکتے تھے، مگر انکی زندگی کے آخر وقت تک عیسائی رہا، ناظرین کی نظر سے ان ہی اوراق میں یہ بھی گذر چکا ہو کہ جو غیر مسلم قیدی آتے تو حضرت عثمانؓ انکو دین کے محاسن بتاتے مگر ان پر اسلام قبول کرنے کا جبر یا دباؤ نہ ڈالتے، رومی لونڈیاں ان کے پاس حاضر ہوئیں تو ان کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا، ان میں سے دو لونڈیوں نے تو اسلام قبول کرلیا، بقیہ اپنے پرانے مذہب پر قائم رہیں، گذشتہ اوراق سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ عہد رسالت سے لیکر مرتضوی دور تک عیسائیوں اور یہودیوں سے جتنے معاہدے ہوئے ان میں غیر مسلموں کی عبادت گاہوں، خانقاہوں، زیارت گاہوں، راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کو ہر طرح محفوظ رہنے کی پوری ضمانت دی گئی، اگر اس کی خلاف ورزی ہوتی تو عاملوں سے باز پرس ہوتی،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے فرمایا ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران - ۱۲)　　تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے لائے گئے ہو،

خیر الامت کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان دنیا میں اس لیے ہیں کہ وہ یہاں خیر بن کر نیکیاں

پھیلائیں، برائیوں سے پرہیز کریں، جب ان کو خیر امت ہونے کی بشارت دی گئی ہے تو تبلیغ کے سلسلہ میں ان کو ظالم اور سفاک بننے کی تعلیم کیسے دی جا سکتی تھی کوئی مسلمان حکمراں یا فاتح ایسا ہوا تو وہ اپنی بشری کمزوریوں نہ کہ اپنی مذہبی تعلیم کی بنا پر ہوا، اسلام کا تو یہ پیام ہے

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ	برائی کی مدافعت خوبی کے ساتھ
فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ	کرو، پھر تو تمھاری عداوت والا
عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ	بھی تمھارا گرم جوش دوست
(حٰمٓ السجدہ ۵-ع ۵)	بن جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر عمل کیا، برائی کی مدافعت نیکی سے کی ظلم کا جواب صبر کرکے دیا تو آپ کے عدو آپ کے گرم جوش دوست بن گئے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی طرف سے خیر اور نیکی کی تبلیغ شروع کی گئی تو اسی کے خلاف تلواریں اٹھیں، اور اس کی طرف سے جو مدافعت ہوئی، وہ انسانی تاریخ کا بے مثال نمونہ ہے۔

تبلیغ اسلام کی نوعیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت ملی تو پہلے گھر ہی سے اسکی تبلیغ شروع ہوئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا تھا،

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ	اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ	کو (خدا سے ڈرا) اور اپنی پیروی کرنیوالے
اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاِنْ	مومنین کے لیے نرم ہوجا، اگر تمھاری بات
عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا	نہ مانیں تو کہہ دو کہ میں تمھارے اعمال
تَعْمَلُوْنَ (شعراء - ع ۱۱)	سے بری ہوں۔

حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے ایمان لائیں، پھر حضرت علیؓ کو یہ شرف حاصل ہوا جن کی عمر اس وقت دس سال کی تھی، آپ کے غلام زید بن حارثؓ بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے، قریش کے سرداروں میں پہلے حضرت ابوبکرؓ آپ کے گرویدہ ہوئے، حضرت بلال حبشیؓ اور خالد بن سعیدؓ ابن وقاص نے بھی آپ کی دعوت کو قبول کیا، عورتوں میں حضرت خدیجہؓ کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کی بیوی ام الفضلؓ، اسماؓ بنت عمیس، اسماؓ بنت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ فاروق کی بہن حضرت فاطمہؓ بھی اس چھوٹے سے کارواں میں شریک ہوئیں، حضرت ابوبکرؓ کی مساعی سے حضرت عثمانؓ غنی، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ اور سعدؓ بن وقاص بھی مسلمان ہوئے، اس جماعت کی تعداد بڑھنے میں تین سال لگ گئے، غیر مسلموں کے خوف سے اس کی تبلیغ خاموشی سے ہوتی رہی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ایذا رسانی کے ڈر سے مکہ سے باہر جاکر پہاڑ کی گھاٹیوں میں مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرتے، وہاں بھی غیر مسلم پہنچکر جھگڑا کرتے جس سے خون بہنے کی نوبت آجاتی (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم عربی ص ۱۱۶۹، اردو ص ۷۵)، نبوت کے تین سال کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم ملا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ — پس تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے، اس کو
أَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ — کھل کر کہہ دے اور مشرکین سے دور رہو۔

اس حکم کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گلی کوچوں میں جاکر اسلام کی تبلیغ شروع کی، کبھی دعوت میں بلاکر احکام الٰہی سناتے، کبھی کوہ صفا پر چڑھ کر پیام دیتے، مکہ کے غیر مسلموں نے آپ کی اس تبلیغی مہم کو پسند نہیں کیا، ابولہب کے ساتھ مکہ کے اور سرداروں نے آپ کے خلاف مہم شروع کی، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ کے دروازے پر غلاظتیں

پھیلی گئیں، ان ایذا رسانیوں سے عاجز ہو جاتے تو آپ فرماتے [illegible] یہ
کیا ہمسایگی کا یہی حق ہے، جو ادا کر رہے ہو (طبری جلد اول حصہ سوم عربی ص ۱۱۹۹، اردو
ص ۱۰۰) ایک روز آپ خانہ کعبہ میں نماز ادا کر رہے تھے، تو آپ جب سجدے میں گئے تو
عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس کو کھینچنا شروع کیا، ایک
اور موقع پر جب آپ نماز میں مصروف تھے، تو ابو جہل کے اشارے پر اونٹ کی اوجھڑی
آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی گئی، آپ کو شاعر، مجنون، ساحر اور دوں سے سن سکر
[illegible] قوم میں پھوٹ ڈالنے والا، گھر کو توڑنے والا، بھائی کو بھائی سے
[illegible] سے جدا کرنے والا کہا گیا، نبوت کے چھٹے سال ایک روز آپ خانہ کعبہ میں وعظ
کر رہے تھے تو ابو جہل وہاں پہنچ گیا، اس نے آپ کو گالیاں دیں، پھر بری طرح ستا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، بے بسی کے ساتھ گھر واپس ہو گئے
آپ کے دوسرے چچا حضرت حمزہؓ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان کو ابو جہل
کی زیادتی کی خبر ہوئی تو آپ کی مظلومیت سے متاثر ہوئے، ابو جہل کے پاس پہنچے، اس کے
سر پر اس زور سے کمان ماری کہ وہ زخمی ہو گیا، اور جب ابو جہل کے حامی ان سے الجھے
وہ اسی وقت مسلمان ہو گئے (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۹۳، طبری ج ۱ حصہ سوم عربی
اردو ص ۹۰، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۲۳، مہاجرین حصہ اول ص ۱۷۰)

تبلیغ میں آلام و مصائب حضرت عمرؓ اور ان کے گھر والے اسلام لائے تو اسلام کی قوت
بڑھی، مسلمان اب تک چھپ کر اپنے گھروں میں نماز ادا کیا کرتے تھے، اب کعبہ میں جا کر پڑھنے
لگے، اس سے غیر مسلموں کا اشتعال اور بھی بڑھا، انھوں نے بنو ہاشم کا مقاطعہ شروع کر دیا
ان سے رشتے ناطے اور لین دین بند کر دیے، ان کا گلیوں میں نکلنا روک دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ

نے مجبوراً گھربار چھوڑ کر اپنے فدائیوں کے ساتھ شعبِ ابی طالب کی گھاٹیوں میں پناہ لی،
یہاں تین برس تک پناہ گزیں رہے، کھانے پینے کے سامان کی کمی کی وجہ سے بچے بھوک
سے بلکتے رہتے، پناہ گزیں پتیاں کھا کھا کر صبر و استقلال سے دن کاٹتے رہے، تین سال
کے بعد غیر مسلموں نے ان کو گھر آنے کی اجازت دی (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۹،
سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۲۵)

یہاں سے نکلنے کے بعد آپ مکہ سے باہر نکل کر تبلیغ کے لیے زید بن حارث کے ساتھ
طائف تشریف لے گئے، وہاں آپ کو پتھروں سے اس طرح لہولہان کیا گیا کہ
آپ زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے، زید بن حارث بازو تھام کر کھڑا کر دیتے،
طائف سے واپس ہوئے تو آپ پر مایوسی طاری نہیں تھی، ان مخالفوں کے لیے تباہی
کی کوئی بد دعا بھی نہیں کی، آپ کو یقین تھا کہ اگر اس وقت وہ سیدھی راہ پر نہیں آئے ہیں
تو ان کی آئندہ نسلیں ضرور خدائے واحد پر ایمان لے آئیں گی، اس لیے بد دعا
کے بجائے آپ نے یہ درد انگیز دعائیں مانگیں:

"خداوندا! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی
مجبوری کی شکایت تجھ سے کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے،
تو میرا رب ہے، تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے، کسی اجنبی کے جو مجھ پر ظلم کرے یا تو نے
میرے معاملہ کو کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے، اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو میں
ان مصائب کی پروا نہیں کرتا، تیری حمایت میرے لیے بہت زیادہ وسیع ہے،
میں تیرے اس نور کی پناہ میں آتا ہوں، جس سے تمام تاریکیاں روشن
ہو گئی ہیں اور جس پر دنیا و آخرت میں کامیابی کا مدار ہے، اس بات سے پناہ

پھیکی گئیں، ان ایذا رسانیوں سے عاجز ہو جاتے تو آپ صرف اتنا فرماتے، "فرزندانِ عبد مناف کیا ہمسائیگی کا یہی حق ہے، جو ادا کر رہے ہو" (طبری جلد اول حصہ سوم عربی ص ۱۱۹۹، اردو ص ۱۰۰) ایک روز آپ خانہ کعبہ میں نماز ادا کر رہے تھے، تو آپ جب سجدے میں گئے تو عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس کو کھینچنا شروع کیا، ایک اور موقع پر جب آپ نماز میں مصروف تھے، تو ابوجہل کے اشارے پر اونٹ کی اوجھڑی آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی گئی، آپ کو شاعر، مجنون، ساحر، اوروں سے سن سنکر افسانے بنانے والا، قوم میں پھوٹ ڈالنے والا، مکہ کو اجاڑنے والا، بھائی کو بھائی سے، بیٹے کو ماں سے جدا کرنے والا کہا گیا، نبوت کے چھٹے سال ایک روز آپ خانہ کعبہ میں وعظ کہہ رہے تھے تو ابوجہل وہاں پہنچ گیا، اس نے آپ کو گالیاں دیں، بری طرح ستایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، بے بسی کے ساتھ گھر واپس ہو گئے، آپ کے دوسرے چچا حضرت حمزہؓ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان کو ابوجہل کی زیادتی کی خبر ہوئی تو آپ کی مظلومیت سے متاثر ہوئے، ابوجہل کے پاس پہنچے، اس کے سر پر اس زور سے کمان ماری کہ وہ زخمی ہو گیا، اور جب ابوجہل کے حامی ان سے الجھے تو وہ اسی وقت مسلمان ہو گئے (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۹۳، طبری ج ۱ حصہ سوم عربی ص ۱۱۸۷ اردو ص ۹۰، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۲۳، مہاجرین حصہ اول ص ۱۷۰)

تبلیغ میں آلام و مصائب حضرت عمرؓ اور ان کے گھر والے اسلام لائے تو اسلام کی قوت بڑھی، مسلمان اب تک چھپ کر اپنے گھروں میں نماز ادا کیا کرتے تھے، اب کعبہ میں جا کر پڑھنے لگے، اس سے غیر مسلموں کا اشتعال اور بھی بڑھا، انھوں نے بنو ہاشم کا مقاطعہ شروع کر دیا، ان سے رشتے ناطے اور لین دین بند کر دیے، ان کا گلیوں میں نکلنا روک دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے مجبوراً گھر بار چھوڑ کر اپنے فدائیوں کے ساتھ شعبِ ابی طالب کی گھاٹیوں میں پناہ لی،
یہاں تین برس تک پناہ گزین رہے، کھانے پینے کے سامان کی کمی کی وجہ سے بچے بھوک
سے بلکتے رہتے، پناہ گزین پتیاں کھا کھا کر صبر و استقلال سے دن کاٹتے رہے، تین سال
کے بعد غیر مسلموں نے ان کو گھر آنے کی اجازت دی (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۲۹،
سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۴۵)

یہاں سے نکلنے کے بعد آپ مکہ سے باہر نکل کر تبلیغ کے لیے زید بن حارث کے ساتھ
طائف تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کو پتھروں سے اس طرح لہولہان کیا گیا کہ
آپ زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے، زید بن حارث بازو تھام کر کھڑا کر دیتے،
طائف سے واپس ہوئے تو آپ پر مایوسی طاری نہیں تھی، ان مخالفوں کے لیے تباہی
کی کوئی بد دعا بھی نہیں کی، آپ کو یقین تھا کہ اگر اس وقت وہ سیدھی راہ پر نہیں آئے ہیں
ہیں تو ان کی آئندہ نسلیں ضرور خدائے واحد پر ایمان لے آئیں گی، اس لیے بد دعا
کے بجائے آپ نے یہ درد انگیز دعائیں مانگیں:

"خداوندا! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی
مجبوری کی شکایت تجھ سے کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے،
تو میرا رب ہے، تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے، کسی اجنبی کے جو مجھ پر ظلم کرے یا تو نے
میرے معاملہ کو کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے، اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو میں
ان مصائب کی پروا نہیں کرتا، تیری حمایت میرے لیے بہت زیادہ وسیع ہے،
میں تیرے اس نور کی پناہ میں آتا ہوں، جس سے تمام تاریکیاں روشن
ہو گئی ہیں اور جس پر دنیا و آخرت میں کامیابی کا مدار ہے، اس بات سے پناہ

مانگتا ہوں کہ تیرا غصہ اور غضب مجھ پر نازل ہو، بے شک جب تک چاہے تجھے عتاب کرنے کا حق ہے۔ اور ہر قسم کی طاقت اور قوت حاصل ہے (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم عربی ص ۱۲۰۱، اردو ترجمہ ص ۱۰۲-۱۰۱)

اس دعا سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغی مہم کے لیے زور اور زبردستی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

رسول اللہؐ کی تبلیغی مہم جاری رہی۔ حج کا زمانہ آتا تو زائرین خانہ کعبہ کے پاس پہنچتے اور اللہ کا پیام سناتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے، جن میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلے مشہور تھے، آپ وہاں بھی پہنچکر توحید کا درس دیتے، بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرۃ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نصر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ اور حضارمہ جیسے قبیلوں میں بھی ایک تبلیغی مشنری کی حیثیت سے پہنچے، ابولہب آپکے پیچھے پیچھے جاتا اور جو کچھ آپ فرماتے اس کی تکذیب کی کوشش کرتا۔ (مستدرک حاکم جلد اول ص ۱۵، سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۵۲-۵۳)

آپ کی ایذا رسانی سے غیر مسلموں کو تسکین نہیں ہوئی تو انھوں نے آپ کے سر مبارک کو قلم کرنے کا ایک بڑا انعام مقرر کیا، جب کوئی قتل نہ کر سکا تو عرب کے ہر قبیلہ کے سرداروں نے آپ کے قتل کے لیے آپ کا گھر گھیر لیا، جس کے بعد آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ گھر چھوڑ کر غار ثور میں پناہ لی، گھر چھوڑ رہے تھے تو کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکہ! تو مجھکو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھکو رہنے نہیں دیتے"۔ یہ ایک دل دوز اور دلفگار صدا تھی۔ تین روز تک غار ثور میں پناہ لینے کے بعد مدینہ کی طرف بڑھے، غیر مسلموں نے آپ کی گرفتاری پر ایک سو اونٹوں کا انعام مشتہر کیا، اسی لالچ میں سراقہ بن جعشم

نے آپ کا تعاقب کیا، مگر رحمۃ للعالمینؐ کے ساتھ رب العالمین کی تائید تھی، آپ اپنے یارِ غار حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مدینہ محفوظ پہنچ گئے۔ اس موقع پر اپنے تمام اہل وعیال کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرکے مکہ ہی میں چھوڑ دیا تھا، جن میں آپ کی بیٹیاں حضرت فاطمہؓ اور حضرت زینبؓ اور چہیتی بیوی حضرت عائشہؓ بھی تھیں (صحیح بخاری ہجرۃ النبیؐ وسیرۃ النبیؐ جلد ۱ ص ۲۷۱) اسماء بنت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے باپ حضرت ابوبکرؓ کے جانے کے بعد قریش کے کچھ لوگ جن میں ابوجہل بن ہشام بھی تھا میرے یہاں آئے اور دروازے پر آکر کھڑے ہوگئے، میں اندر سے نکل کر انکے پاس آئی، انھوں نے پوچھا تمھارے باپ ابوبکر کہاں ہیں؟ میں نے کہا خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں، اس پر ابوجہل نے جو بہت ہی خبیث اور زشت خو تھا، میرے گال پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ میرے کان کی بالی گر پڑی، اس کے بعد وہ سب چلے گئے، تین دن تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہیں،

(طبری جلد اول حصہ سوم ص ۱۲۴۰ اردو ترجمہ ص ۱۳۲)

ان تمام ایذا رسانیوں تکلیفوں اور صعوبتوں میں آپ نے صبر، تحمل، استقلال، عفو و درگذر اور ترحم کی جو مثالیں پیش کیں۔ وہ اس متمدن دنیا کے لیے مشعل ہدایت ہے، جس میں انتقامی جذبے میں ہولناک لڑائیاں لڑنا قومی شعار بن گیا ہے، اور لڑکر علاقے کو تباہ اور برباد کرنا کوئی شرمناک فعل نہیں سمجھا جاتا ہے،

اسلام کی راہ میں صحابہ کرام کے مصائب

پھر مکہ کے جو لوگ اسلام لائے ان کی ایذا رسانی کی بھی کوئی حد نہ تھی، حضرت بلالؓ کے آقا امیہ بن خلف نے ان کو گرم ریت پر لٹایا، تپتا ہوا پتھر ان کے سینہ پر رکھا، ان کی مشکیں باندھ کر ستایا، ان کی گردن میں رسی ڈال کر

مکہ کی پہاڑیوں میں گھسٹوایا، ان تمام مصیبتوں میں ان کی زبان سے صرف احد احد کے نعرے نکلے" (اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۰۶، مہاجرین جلد اول ص ۱۸۶)

حضرت عثمانؓ بن عفان مسلمان ہوئے تو ان کے چچا نے کھجور کی رسی سے باندھکر مارا، (طبقات ابن سعد، تذکرہ حضرت عثمانؓ بن عفان، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۲۲، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۱ ص ۲۴۶)، زبیرؓ بن العوام جب سولہ برس کے تھے تو اسلام لائے، غیر مسلموں نے ان کو چٹائی میں لپیٹ کر باندھ دیا اور اس قدر دھواں دیا کہ ان کا دم گھٹنے لگا، ان کی زبان سے صرف یہ نکلا کچھ کرو، اب میں کافر نہیں ہو سکتا، (اصابہ ج ۱ تذکرہ زبیرؓ، مہاجرین حصہ اول ص ۷۰)

حضرت طلحہؓ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ایمان لائے تو ان کے حقیقی بھائی نے ان کو اور حضرت ابوبکرؓ کو ایک ہی رسی میں باندھ کر مارا (اسد الغابہ ج ۳ ص ۵۹، مہاجرین حصہ اول ص ۹۹-۱۰۰)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود اسلام لائے تو غیر مسلموں کے سامنے کلام پاک پڑھنا شروع کیا، انھوں نے ان کو اتنا مارا کہ ان کا چہرہ ورم کر گیا۔ پھر بھی ان کی زبان بند نہیں ہوئی، اور صرف اتنا کہا کہ دشمنان خدا آج سے زیادہ میری نظر میں کبھی ذلیل نہ تھے (اسد الغابہ تذکرۂ عبداللہ بن مسعود، مہاجرین حصہ اول ص ۳۰۵)

حضرت عمارؓ بن یاسر جب حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو غیر مسلموں نے ان کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف سے گذرے تو انکے سر پر دست مبارک پھیر کر صرف اتنا فرمایا "اے آگ تو ابراہیم کی طرح عمار پر ٹھنڈی ہو جا، حضرت عمارؓ کی والدہ حضرت سمیہؓ کو ابوجہل نے نہایت بے رحمی سے اپنے نیزہ سے شہید کیا، عمار کے والد حضرت یاسرؓ

اندازہ کے بھائی حضرت عبد اللہ بھی اسی راہ میں جاں بحق ہوئے، ایک بار حضرت یاسر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ایذا رسانی کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا صبر کرو، پھر دعا کی کہ "اے خدا آل یاسر کو بخش دے۔" آپ جب حضرت عمار کے گھر سے گذرتے تو ان خاندان کی مصیبت کو دیکھ کر فرماتے "اے آل عمار تمھیں بشارت ہو، جنت تمھاری منتظر ہے (طبقات ابن سعد قسم اول جزء ثالث ص ۱۸۸، مہاجرین حصہ اول ص ۳۳۴)

حضرت صہیب بن سنان مکہ میں غیر مسلموں کے مظالم سے تنگ آگئے تو مدینہ ہجرت کرنے کو تیار ہوئے، غیر مسلم سد راہ ہوئے تو انھوں نے ان کو اپنا ترکش دکھا کر کہا "تم جانتے ہو کہ میں تم لوگوں سے زیادہ صحیح نشانہ باز ہوں، خدا کی قسم جب تک اس میں ایک تیر بھی ہے تم میرے قریب نہیں آسکتے، اس کے بعد اپنی تلوار سے تمھارا مقابلہ کروں گا، اگر مال و دولت چاہتے ہو تو اس کو لیکر میرا راستہ چھوڑ دو، یہ غیر مسلم اس پر راضی ہو گئے، اور حضرت صہیب اپنا سب کچھ لٹا کر اپنے ایمان کی خاطر مدینہ پہنچ گئے (طبقات ابن سعد قسم اول جزء ثالث ص ۱۶۳، مہاجرین حصہ اول ص ۳۵۶)

حضرت عثمان بن مظعون سے برہم ہو کر ایک غیر مسلم نے ان کو اس زور سے طمانچہ مارا کہ ان کی ایک آنکھ زرد پڑ گئی، جب ان کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو بولے خدا کی حمایت سب سے زیادہ امن و عزت ہے، اور جو میری آنکھ صحیح ہے وہ بھی اپنے رفیق کے صدمہ میں شریک ہونے کی متمنی ہے (اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۸۶-۳۸۵، مہاجرین حصہ اول ص ۹۱-۳۷۸)

صحابہ کرام کے مشرف بہ اسلام ہونے پر ان پر غیر مسلموں کی طرف سے جو مظالم

ڈھائے گئے۔ ان کی اسی طرح کی مثالیں بکثرت ہیں، گھر سے ان کا نکلنا مشکل تھا، انکی جانیں غیر محفوظ تھیں، وہ علانیہ عبادت بھی نہیں کر سکتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان مظالم سے بچنے کے لیے حبشہ ہجرت کرنے کو فرمایا، پہلا قافلہ گیا" ۱۲ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل تھا، اس میں حضرت عثمانؓ بن عفان بھی تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ بھی تھیں، جو حضرت عثمانؓ سے بیاہی ہوئی تھیں، حبش کے بادشاہ نجاشی پر مکہ کے غیر مسلموں نے دباؤ ڈالا کہ ان کو اپنے یہاں سے نکال دے، نجاشی نے ان مہاجروں کو اپنے سامنے طلب کرکے ان سے پوچھا کہ تمھارا مذہب آخر ہم لوگوں کے مذہب سے کیا نرالا ہے جو تم نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا ہے، اس کا جواب حضرت جعفرؓ نے بہت ہی موثر انداز میں دیا، بادشاہ کے سامنے نڈر ہو کر ایک تقریر کی، جس میں یہ بتایا کہ ہم ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردے کھایا کرتے تھے، بدکاریوں کے عادی تھے، دلوں میں رحم نہ تھا پڑوسیوں کے ساتھ برا برتاؤ رکھتے، ہمارا زبردست فرد دوسرے زیردست فرد کو کھا جاتا، اتنے میں ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہوا جس کے صدق، امانت، شرافت کو ہم جانتے ہیں، اس نے ہم کو خدائے واحد کی طرف بلایا، اور سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجا چھوڑ دیں، ہم کو بتایا کہ ہم سچ بولیں، امانت ادا کریں۔ صلہ رحمی کریں، پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں، حرام باتوں اور خونریزی سے احتراز کریں فواحش سے باز آئیں، جھوٹ نہ بولیں، یتیم کا مال نہ کھائیں، عورتوں پر تہمت نہ لگائیں، خدائے واحد کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، ہم نے اس کو مانا، اس پر ایمان لائے، اب جب کہ ہم نے شرک چھوڑ کر خدا

اختیار کی، حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا تو اس پر ہماری قوم دشمن ہو گئی ہے"
ہم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانے لگی کہ ہم پھر خدا پرستی کو چھوڑ کر اصنام پرستی
شروع کر دیں (سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۲۔۱۸۱، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۳۸،
مہاجرین جلد اول ص ۴۵)

سیرۃ ابن ہشام کے مولف کا بیان ہے کہ اس تقریر کو سن کر نجاشی اور اسکے
درباری اسقف پر رقت طاری ہو گئی اور نجاشی نے کہا کہ یہ اور عیسیٰ کا لایا ہوا مذہب
ایک ہی چراغ کے دو پر تو ہیں،

یہ مہاجرین کچھ دنوں حبشہ میں رہ کر پھر مکہ واپس آگئے، لیکن ان کے مصائب
ابھی ختم نہیں ہوئے، غیر مسلموں کے مظالم پھر بڑھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے دوبارہ حبشہ کی ہجرت کی اجازت دیدی، ۸۳ مردوں اور ۲۰ عورتوں کا یہ قافلہ
پھر کسی نہ کسی طرح حبشہ روانہ ہو گیا،

ان ناساز گار حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ جاری رہی، رفتہ رفتہ بنو ہاشم، موالی بنو ہاشم،
بنو مطلب، بنو مطلب کے حلیف، بنو عبد شمس، بنو شمس کے حلیف، بنو نوفل، بنو اسد
بنو عبد دار، بنو عبد بن قصی، بنو زہرہ بن کلاب، بنو تیم بن مرہ، بنو مخزوم بن یقظہ
بنو عدی، بنو سہم، بنی جمح، بنو عامر بن لوئی، بنو فہر بن مالک، بنو اسد بن عبد العزیٰ
بنو عبد دار بن قصی اور ان کے حلیفوں میں سے کچھ لوگوں نے اسلام
قبول کر لیا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو مہاجرین حصہ اول مقدمہ ص ۵۷۔۵۰)
پھر بھی ان کی تعداد غیر مسلموں سے بہت کم تھی، جن کی ایذا رسانیاں جاری رہیں،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر تبلیغ اسلام فرماتے رہتے تھے، مدینہ کے لوگ

آپ کی تعلیم سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے لگے، تو مدینہ دارالامن بن گیا، یہاں پناہ ملنے کی امید ہوئی تو مسلمانوں کی ہجرت شروع ہوگئی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے وہاں کافی مسلمان پہنچ گئے، یہ جلاوطنی اسلام کی راہ میں بہت بڑی قربانی تھی،

یہ تفصیلات کچھ نئی نہیں ہیں، بلکہ اسلام کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عام ہیں، دارالمصنفین کی مطبوعات میں سے سیرۃ النبی، جلد حصہ اول و دوم، تاریخ اسلام جلد اول میں اس دور کی داستان کی اور بھی زیادہ تفصیلات ملیں گی، ان کو یہاں پر مختصر طریقہ سے دہرانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے ناظرین کے سامنے ایک بار پھر یہ حقیقت سامنے آجائے کہ ظالم قاہر، جابر اور عدم رواداری کون تھا، اور کون مظلوم، مقہور، مجبور اور روادار بن کر رہا، تشدد کس کی طرف سے جاری رہا، عدم تشدد کو کس نے اپنا وطیرہ بنایا، تلوار کس کے ہاتھ میں تھی، نہتا کون تھا، اسلام زور، جبر اور سختی سے پھیلا، یا ایثار، قربانی، امن پسندی، صلح جوئی، بے سروسامانی، پرامن تبلیغ، جذبۂ خدمت صبر، تحمل، بردباری اور رواداری سے بڑھا اور بڑھتا گیا۔ (باقی)

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی دلچسپ اور دلکش داستان تاریخی مستند ماخذوں اور حوالوں سے پیش کی گئی ہے۔ قیمت صرف ۹

عہد نبوی و عہد صحابہ میں مذہبی رواداری کا خوش آئند، سبق آموز اور قابل اتباع اسوہ زیر طبع ہے جو عنقریب چھپ کر منظر عام پر آئے گا۔

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن

جدید عربی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

از
ڈاکٹر سید اختشام احمد ندوی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی

جدید عربی شاعری درحقیقت جنگ عظیم کے بعد کی شاعری کو کہنا چاہئے مگر اس مضمون میں ادب عربی کی متداول تاریخوں کے طرز پر اس کا آغاز نپولین کے مصر پر حملہ اور محمد علی پاشا کے عہد سے قرار دیا گیا ہے۔ (معارف)

جدید عربی شاعری وسعت و عظمت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کی مالک ہے، اسکی تجدید کا سہرا بارودی کے سر ہے، مگر اس تجدید کو قدیم شاعری کے خلاف بغاوت سے تعبیر نہ کرنا چاہئے، اسلیے کہ جدید شاعری اچانک نہیں پیدا ہو گئی، بلکہ تدریجی طور پر عرب شعراء قدامت کے راستے سے تجدید کی شاہراہ تک پہنچے ہیں، جدید شاعروں نے فکر و فن کے لئے پہلے عباسی شعراء کی تقلید کی اور "عہد عثمانی" یا عصر ترکی کے شعراء کو پس پشت ڈالدیا، اس جاندار تقلید نے ان کے اندر فن کی پختگی اور عظمت پیدا کی، یہ کیفیت بارودی، شوقی، حافظ، رصافی اور زہاوی سب کے یہاں نمایاں ہے، پھر ان لوگوں نے مغرب کے نئے رجحان سے اپنے فن کو نئے آفاق دکھائے، نئے خیالات، نئی امنگوں اور نئے حوصلوں سے اپنی شاعری کو نئی زندگی و تابندگی عطا کی، اور یورپی ادب کی جدید جلوہ طرازیوں سے اس کے اندر نئی چمک دمک پیدا کی،

بارودی اور شوقی وغیرہ کے یہاں تجدید کی کوشش میں قدیم ادب کے احیاء کی سعی

کی گئی ہے، اسی بنا پر ان کے یہاں جدیدیت ایک محدود و مخصوص انداز میں نظر آتی ہے، قالب و ہیئت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، حافظ کہتے ہیں:

آن یا شعراء ان نفك قیودا　　قیدتنا بها دعاة المحال

اے شعرا! وقت آگیا ہے کہ ہم محال امور کے داعیوں کی قید و بند کو توڑ ڈالیں

حافظ نے قید تو نہیں توڑی مگر اتنا ضرور کیا کہ شاعری کو زندگی کا نباض بنا دیا اور سماجی شاعری سے اپنے دیوان کو پُر کر دیا، حافظ سے زیادہ بڑا اور عظیم تجدیدی کام دراصل شوقی نے انجام دیا ہے۔ انھوں نے عربی شاعری میں ڈرامہ نگاری کا آغاز کیا، یہ ایک بالکل نیا قدم تھا، عربی ادب تمثیلی شاعری سے نا آشنا تھا، انھوں نے مصرع کلوپٹرا، مجنوں لیلی اور قمبیز وغیرہ ڈرامے لکھے، چونکہ انھوں نے یورپی ڈرامہ کا فنی مطالعہ نہیں کیا تھا، اس لیے تمثیلی شاعری کے لیے نئے اوزان کی تشکیل کی جانب توجہ نہ کر سکے، ورنہ وہ ڈرامہ کی معراج تک پہنچ جاتے، عملی طور پر بھی ان کے ڈرامے کمزور سمجھے گئے، ڈرامہ کے لیے اسٹیج کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے،

دراصل اس دور میں کمی بنیادی نظریہ کی ہے، حافظ و شوقی کسی کے یہاں بھی فلسفۂ حیات، فلسفۂ فطرت اور اعتماد و ایقان کی انقلاب انگیز کیفیت نہیں پائی جاتی ہے، محض جدید ایجادات و اختراعات کا ذکر یا سیاسی و سماجی واقعات کا بیان ہی تجدید شاعری نہیں ہے۔

جدید تصور شاعری ایک تصور حیات اور ایک نظام فکر ہے، شعرا ایک نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر شعر کہتے ہیں، اور زندگی کو اسی پیمانے سے ناپتے ہیں، شاعری کو اتفاقی الہ قرار دینا دور جدید کا انداز فکر نہیں ہے، اب تو "شعوری الہام" ہوتا ہے، ایک فلسفۂ حیات

کے ذریعہ آلام روزگار کا حل اور ایک مربوط و منظم نظام حیات کی راہ سے مسائل کی تلاش، انسانی طبقات کے کچلے ہوئے افراد سے ہمدردی اور غمگساری تجدید کی اعلیٰ قدر ہے، یہ تغیر حافظ و شوقی کے بعد پیدا ہوا اور شعراء نے مغرب سے کسب فیض کیا، مثلاً اکثر جدید شعراء اور شعرائے مہجر رومانوی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں، تقلید کا یہ عالم ہے کہ بہت سے عرب شعراء نے عربی انداز چھوڑ کر بالکل مغربی انداز کی نظمیں لکھنی شروع کر دیں، انکی نظر میں عربوں کا اسلوب شاعری دور جدید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ فن کے پیمانے کسی قوم کے اندر ایک طویل عرصہ کے بعد وجود میں آتے ہیں، ان کو اچانک متروک قرار دینا آسان نہیں ہے، عربی شاعری کے روایتی طرز کو ترک کر کے پورے طور پر مغربی انداز کا اختیار کر لینا ممکن نہیں ہے، اسی بنا پر آزاد نظموں کو ابتک اتنی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جتنی قدیم اصناف سخن کو حاصل ہے، قدیم فنی روایتوں کو طاق نسیاں کے حوالہ کیے بغیر بھی جدید راہوں پر گامزنی کی جا سکتی ہے، مثلاً بہت سے شعراء نے عربی شاعری کے قدیم طرز پر بھی عمدہ اور مؤثر نظمیں لکھی ہیں اور جدید انداز میں بھی شعر لکھکر شاعرانہ عظمت و کمال کے جلوے دکھائے ہیں، شعرائے محافظین یعنی بارودی، حافظ اور شوقی وغیرہ کی کامیابی کا راز یہی ہے، اس کے برعکس اس طبقہ کو جو محض یورپ کا نقال ہے، زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ اس نے مغربی افکار و تصورات کو مغربی اسالیب میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

جدید عرب شعراء نے مغربی فلسفہ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے، اس لیے ان کے یہاں سطحی تقلید ہے، اسی بنا پر مغرب زدہ شاعری میں ہمیں کوئی خاص لذت و حلاوت نہیں ملتی، یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جبتک کہ عربی اور مغربی آخذ سے یکساں

کسب فیض نہ کیا جائے[1]

مغربی مذاقِ سخن پیدا کرنے کے لیے صرف یورپی تہذیب ہی سے کسب فیض کافی نہیں ہے، بلکہ یورپی اساطیر اور یورپی فلسفہ کا عمیق مطالعہ بھی ناگزیر ہے، طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب "حافظ وشوقی" میں لکھا ہے کہ شوقی اگرچہ فرانسیسی جانتے تھے، مگر انھوں نے فرانسیسی ڈرامہ اور ادب کا گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا، اس وجہ سے ان کے کلام میں زیادہ گہرائی نہ پیدا ہو سکی، مغربی تہذیب نے خود قدیم یونانی، رومانی اور عربی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن سے اپنا چراغ روشن کیا ہے،

یہ صحیح ہے کہ جدید عربی شاعری میں کوئی "اقبال" پیدا نہ ہو سکا، مگر جہاں تک موضوعات شاعری کا سوال ہے، اس میں ہمیں مایوسی نہیں ہوتی، عربوں نے جدید شاعری کا ایک عظیم ذخیرہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے، جو قوس وقزح کی طرح رنگین، بوقلموں اور دلکش وپرکیف ہے، اس میں قدما کی طرح شکوے، مبارکبادیاں، تاریخ پیدائش ووفات، مراثی وغسل صحت، اور قصائد وہجویات کا دفتر بے پایاں نظر نہیں آتا، مگر اس میں اجتماعی اور انفرادی انسانی زندگی کے متعلق جذبات واحساسات کا گہرا شعور نظر آتا ہے اور سیاسی، وطنی، معاشی اور معاشرتی حالات کی موثر تصویر نگاہ کے سامنے آجاتی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جدید عربی شاعری کا آغاز دراصل نپولین کے حملے سے ہوتا ہے، نپولین نے ۱۷۹۸ء میں مصر پر حملہ کیا، اس نے نہ صرف مصریوں میں نئی زندگی پیدا کی بلکہ اپنے ساتھ ماہرینِ آثار قدیمہ کی ایک جماعت بھی لایا، جس نے مصر کی قدیم تہذیب اور [illegible] کی عظمت کو زمین کے سینوں سے کھود کر نکالا، انھوں نے فرانسیسی زبان میں رسالے

---

[1] الشعر وشعراءه فی الشعر العربی [illegible] شوقی [illegible]

جاری کیے، اس طرح اہلِ مصر کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔

عرب ملکوں میں اہلِ یورپ نے بہت سے مشنری ادارے قائم کیے، روس، انگریز اور فرانس نے اس طرح کے کالج لبنان میں کثرت سے کھولے، چونکہ عربوں میں مذہبی پختگی تھی اس لیے ان کو عیسائی بنانے میں تو کامیابی نہ ہوسکی مگر فرنگیوں کی ہوشیاری نے انھیں اپنا آلۂ کار بنالیا، ڈاکٹر احمد امین فیض الخاطر میں لکھتے ہیں کہ عربوں میں غیر ملکی درسگاہیں کثرت سے کھولی گئیں حتی کہ صرف شام میں ان کی تعداد ۲، اتک پہنچ گئی، یہ صرف امریکی مشنریوں کے مدارس تھے جو گاؤں اور شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، چھوٹے بچوں کی درسگاہوں سے لیکر اعلیٰ تعلیمی ادارے غیر ملکی مشن چلاتے تھے، بیروت، قاہرہ اور استنبول میں امریکن یونیورسٹیاں قائم تھیں، ان اداروں میں مسلم طلبہ کو زبردستی چرچ لیجایا جاتا تھا اور ان سے عیسائی طرز پر عبادت کرائی جاتی تھی، جب طلبہ نے احتجاج کیا تو اصحاب حل و عقد نے کہا کہ ہم مالداروں سے بڑی بڑی رقمیں عیسائیت کی تبلیغ کے نام پر حاصل کرتے ہیں، اگر ہم مذہب کا عنصر نکالدیں تو ہمیں کون مدد دیگا۔[۱]

یہ ادارے سیاسی طور پر استعمار کی جڑوں کو مضبوط کرنے، طلبہ کے ذہن میں الحاد پیدا کرنے اور مذہبی شکوک کو ابھارنے کی کوشش کرتے تھے، ان اداروں نے عربوں میں جمہوریت، اصلاحِ شعر و ادب کا خیال دلایا۔

فرانسیسیوں نے ایسے تھیٹر بھی قائم کیے جن میں ڈرامے دکھاتے تھے، مصر میں انھوں نے دو ایسے جدید مدرسے بھی قائم کیے جن میں فرانسیسی لڑکوں کی تعلیم کا انتظام تھا، ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں یورپ کی بے شمار جدید کتابوں کے ساتھ عمدہ اور

---

[۱] فیض الخاطر ج ۱۰، ص ۱۵۰

نادر عربی تصنیفات بھی تھیں اور وہ مخطوطات بھی تھے جو انھوں نے مصر اور دوسری جگہوں سے جمع کر لیے تھے، جو اس کتب خانے سے فائدہ اٹھانا چاہتا وہ بڑی خوشی سے اس کو اجازت دیتے تھے۔[1]

اسی کے ساتھ فرانسیسیوں نے ایک مجلس "المجمع العلمی" کے نام سے قائم کی جو حکومت مصر کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مواد فراہم کرتی تھی، اس مجلس کے ذریعہ بہت سے اقتصادی، تاریخی اور ثقافتی امور سامنے آئے اور مصر کے قدیم تہذیبی آثار نمایاں ہوئے اور ایک کتاب وصف مصر (Description of Egypt) کے نام سے شائع کی، ازہر کے نو علماء کو نپولین نے مصری حکمران مجلس میں شریک کیا۔ اس ترکیب سے مصریوں کو حکومت میں شرکت کا خیال دلا کر ترکوں کی طرف سے استبداد کا خیال ذہن نشین کیا۔

محمد علی جب مصر کا والی ہوا تو ایک طرف اس نے اعلیٰ قسم کی جدید درسگاہیں کھولیں اور دوسری طرف طلباء کے ایک گروہ کو جدید علوم و فنون کی تحصیل کے لیے فرانس روانہ کیا جو آگے چل کر مصر اور یورپ کے درمیان واسطہ بنے۔ ان لوگوں نے ترجمہ کی مہم چلائی، جدید اصطلاحات وضع کیں اور بہت سا نیا لٹریچر تیار کر دیا۔[2]

اس جماعت میں رفاعۃ الطہطاوی نے کافی علمی خدمات انجام دیں، اسی کے مشورہ سے محمد علی نے زبانوں کا ایک ادارہ قائم کیا جس میں ایک ہزار سے زائد مغربی زبانوں سے کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں۔ فرانس کے دستور کا ترجمہ بھی کیا گیا، اور بہت سے فرانسیسی شاعروں کا کلام عربی میں منتقل کیا گیا، محمد علی نے ایک اعلیٰ درجہ کا مطبع بھی قائم کیا، جو "المطبعۃ الامیریہ" کے نام سے مشہور ہوا جس سے الوقائع المصریہ رسالہ نکلنے لگا۔

---

[1] تطور الشعر العربی الحدیث ص ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۵

جب اسمٰعیل تخت حکومت پر آیا تو اس کا علمی ذوق محمد علی سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس نے سارے یورپ کی علمی و تہذیبی ترقیوں کو سمیٹ لینے کا قصد کیا، اس نے ۱۰۲ وفود تعلیم کے لیے فرانس روانہ کیے، اس طرح اسمٰعیل کے زمانہ میں اسکولوں، کالجوں، اخباروں اور رسالوں سبھی چیزوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا، چند برسوں میں ملک کی ذہنی حالت بدلنے لگی،

اسی زمانہ میں عربوں میں اپنے قدیم ذخیرۂ علوم کو مرتب کرنے اور پرانے ادب کے احیاء کا خیال پیدا ہوا، آغانی، تاریخ ابن خلدون، وفیات الاعیان وغیرہ بہت سی اہم کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوگئیں، جس کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا مذاق سوسائٹی میں عام ہوگیا،

اس سلسلہ میں مستشرقین کی خدمات بھی بہت اہم ہیں، انھوں نے عربی کی نادر کتابوں کو شائع کرنے اور مرتب کرنے میں بڑا حصہ لیا۔

پھر جب انگریزوں کا نفوذ بڑھا تب بھی علمی و تہذیبی سرگرمیاں عربوں میں جاری رہیں، اور مغرب کے اثر سے قومی جذبات برانگیختہ ہونے کی وجہ سے تحریک آزادی پورے جوش کے ساتھ شروع ہوگئی، اسی زمانہ میں سید جمال الدین افغانی اور ان کے شاگردوں کی تحریک اصلاح نے قومی کارکنوں اور حریت کے علمبرداروں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور آزادی کے جذبہ کے ساتھ انھیں اسلام سے بھی وابستہ رکھا، افغانی اور شیخ عبدہ کے اثرات سے اس دور کا نہ کوئی ادیب محفوظ تھا اور نہ شاعر،

سید محمد درویش، عبداللہ فکری، اور ناصف الیازجی وغیرہ کی شاعری جدید دور

سے بالکل الگ ہے۔ لیکن ان کے بعد بیسویں صدی کے نصف آخر میں جو شعراء سامنے آتے ہیں ان کے یہاں صنائع و بدائع کسی حد تک کم ہیں بلکہ ان کے اسلوب پر بحتری وغیرہ کے اثرات ہیں، کیونکہ اس زمانہ میں قدیم لٹریچر پڑھنے کا عام ذوق پیدا ہو گیا تھا جیسا کہ پہلے کہا جا چکا۔

صالح مجدی جس کا انتقال ۱۸۸۱ء میں ہوا، مصر پر غیر ملکیوں کے نفوذ سے نفرت ظاہر کرتا ہے، اور اپنی سوسائٹی کے احساسات کا اس طرح اظہار کرتا ہے

ومن عجب فی السلم انی بموطنی   اکون اسیرا فی وثاق الاجانب

تعجب کی بات ہے کہ میں امن کی حالت میں اپنے وطن میں غیر ملکیوں کے چنگل میں اسیر پڑا ہوں۔

ولا ینثنی عن مصر فی ای حالة   الی اهله الا بملء الحقائب

غیر ملکی جب بھی مصر سے جاتے ہیں تو اپنی جیبیں بھر لے جاتے ہیں۔

وہ اہل وطن سے پکار کر کہتا ہے:

یا بنی الاوطان هیا   خیموا فوق الثریا

اے ابنائے وطن آؤ اور ثریا کے اوپر خیمے نصب کرو۔

بارودی کی اس طرز شاعری کو ان کے بعد عبد المطلب، رافعی، تایاتی، جارم اور کاظمی نے اپنایا۔ یہ شعراء محافظین اس بنا پر کہلاتے ہیں کہ ماضی سے انھوں نے جو وراثت پائی تھی اس کو پوری طرح قائم رکھا۔ انھوں نے عصر عباسی و اموی کی شاعری کو نمونہ سمجھا اور قرآن سے بھی استفادہ کیا[1] لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ان شعراء نے اچھا خاصہ تاثر اپنے زمانہ کے حالات سے بھی قبول کیا۔

جارم مغرب کے اثر سے تجدد کا دعویٰ کرنے والے شعرا کا ان الفاظ میں مذاق اڑاتا ہے؛

---

[1] شعرائے مصر وبیئاتهم فی الجیل الماضی ص ۳۴ تالیف عباس محمد عقاد

جلبوا للقریض ثوبا من الغر ب ولم یجلبوا سوی الاکفان

شعر کے لیے مغرب سے لباس لائے (لیکن یہ) کفن کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

لا تثوروا علی تراث امرئ القیس وصونوا دیباجۃ الذبیانی

امرئ القیس کی وراثت پر حملہ مت کرو اور ذبیانی کی وجاہت کو بچاؤ،

لیکن یہ گروہ جدید احساسات بھی رکھتا ہے، چنانچہ جارم سعد زغلول کے مرثیہ میں ان کی قومی خدمات کو ان الفاظ میں سراہتا ہے،

واصاب فی المیدان فارس امۃ رفع الکنانۃ بعد طول نضال

ایک امت کے شہ سوار کو میدان میں ایک طویل جنگ کے بعد ہلاک کر دیا

من ذالک المتمر الوثوب وذالک الاسد المزئیر ذو الندا العالی

کون ہے یہ کودنے والا چیتا؟ اور یہ اونچی آواز والا شیر!

سوسائٹی کے مسائل سے بھی یہ شعراء اسی طرح تعرض کرتے ہیں جس طرح سے یہ لوگ وہ موضوعات پیش کرتے ہیں جو قدماء کے یہاں رائج تھے، رافعی اہل عرب کے انحطاط کا نوحہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

الست تری العرب الماجدین وکیف تهدم مجد العرب

کیا تم شریف عربوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ (اس دور میں) کس طرح عرب کے مجد کو ڈھا رہے ہیں۔

عبد المطلب مغربی تہذیب کے فحش ماحول کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے

یا منزل القرآن نورا للبصائر والعقول

اے قرآن نازل کرنے والے جو عقل و بصیرت کے لیے نور ہے

عمیت بصائر اهل وادی النیل عن وضح السبیل

اہل وادی نیل کی نگاہیں واضح راستہ سے ہٹ گئی تھیں، اندھی ہو گئی ہیں)

قایاتی کہتا ہے:

حذار حذار ان تصلہ ظباء کم   فیرتد ذاک الحسن غیر مصون

بچو بچو اس بات سے کہ تمھاری ہرنیاں شکار کر لیجائیں اور پھر یہ حسن غیر محفوظ ہو کر لوٹے،

ان شاعروں کے بعد جن شعراء کا دور آتا ہے وہ ان مذکورۂ بالا شاعروں سے کہیں زیادہ تجدد پسند اور مغربی تہذیب سے متاثر ہیں لیکن اس کے بعد بھی وہ فنی طور پر قدیم ہی طرز کی شاعری کے حامل ہیں، ان کے یہاں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ شکل کے بجائے معانی میں ہوئی ہیں، اس طبقہ نے وطنی و سیاسی شاعری کو غیر معمولی طور پر فروغ دیا، اس طبقہ میں شوقی، حافظ، صبری، کاشف، عزیز فہمی، ماحی، عبد الغنی اور عزیز اباظہ وغیرہ شامل ہیں،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شوقی و حافظ وغیرہ کے ذکر سے پہلے مصر پر مغربی اثرات اور وہاں کے ماحول کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو جائے بیسویں صدی کے اوائل میں مصر کے کیا حالات تھے،

مصر پر انگریزوں کے تسلط کے بعد وہاں انگریزی تہذیب و تعلیم کا غیر معمولی غلبہ ہو گیا، جو لوگ یورپ سے لوٹ کر آئے اور مصر کی اجتماعی زندگی میں داخل ہوئے یا جو یورپی اشخاص بطور اساتذہ یا اور کسی حیثیت سے مصر کی زندگی میں دخیل ہوئے، ان کا اثر عربوں پر ہوا، انگریزی مدارس نے طلبہ کے ذہن میں تبدیلیاں پیدا کیں، اس کے بالکل برعکس ایک وہ تعلیم یافتہ طبقہ تھا جس کی تہذیب اسلامی قدروں کی حامل تھی، اور جس کی تربیت ازہر کے زیر سایہ ہوئی تھی، ان کی فکر کا مذکورہ گروہ سے قطعاً مختلف تھا، اس طرح ایک ذہنی کشمکش پیدا ہو گئی اور یہ قدیم و جدید کے درمیان تقسیم ہو گئی،[1]

---

[1] تطور شعر العربی الحدیث ص ۸۰

جدید طبقہ نے مغرب کی اتباع کی دعوت دینی شروع کی اور اخبار و رسائل کے ذریعہ ذہن کو بدلنے کی کوشش کرنے لگے، یہ لوگ مشرقی عادات و اطوار کا مذاق اڑاتے، بسا اوقات دین کا احترام بھی نظرانداز ہوجاتا،

لیکن اس کے برعکس شعراء و ادباء کا اعتدال پسند گروہ عربی شاعری کے گذشتہ سرمایہ سے غیرمعمولی طور پر متاثر نظر آتا ہے، ان کے قصائد کا وہی رنگ ہے، ان کی نظمیں اور غزلوں کا اسلوب وہی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان شعراء نے کچھ تاریخ سے مدد لی ہے، کچھ زندگی کے واقعات و حوادث سے کام لیا ہے،

پرانے عرب شعراء جب محبوب کے دروازہ پر جاتے تھے تو پاسبانوں کا ذکر کرتے تھے، یہ تمام چیزیں اس دور میں بھی نظر آتی ہیں، حافظ کہتے ہیں کہ میں رات کو جب محبوب کے دروازہ پر گیا تو پاسبان میری تلوار کے خوف سے سو گئے

فغطوا جمیعا فی المنام لیصرفوا شبا صارمی عنهم وقد کان منهلا

تو سب گر گئے نیند میں تاکہ میری تلوار کی دھار کو اپنے سے دور کردیں جو کہ میان میں تھی

کاشف کہتا ہے

فتعرض الحراس واجتهدوا لما رأونا نطرق الخدرا

تو جب چوکیداروں نے مجھے رات میں پردے میں جاتے دیکھا تو مجھ سے تعرض کرنے لگے اور خفا ہونے لگے

اسی طرح نسیم کہتا ہے

سموت لها والليل مرخ سدوله على وحراس الخباء هجود

میں اس تک پہنچا اس حال میں کہ رات سخت اندھیری تھی اور خیمہ کے چوکیدار سورہے تھے،

اس طرز شاعری کو دیکھکر گذشتہ شعراء سے ان جدید شعراء کا رشتہ بہت قوی نظر آتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ شعراء طبیعی شاعری میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں، وصف اور منظر نگاری میں شوقی بہت آگے ہیں،

چونکہ اس دور میں قومی و سیاسی زندگی میں آزادی کے لیے ایک ہلچل بپا تھی اور پورے عرب میں انگریزوں کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس لیے شعراء کا اس قومی زندگی سے متاثر ہونا ضروری تھا، ان میں خاص خاص حوادث جن کا ذکر اس دور کے قریب قریب تمام شعراء کے یہاں ملتا ہے، مندرجہ ذیل ہیں،

"حادثۂ دنشوای" (یہ ایک گاؤں کا نام ہے جہاں انگریزوں نے مظالم ڈھائے تھے)، کرومر کا مصر سے جانا، مصری عورتوں کے مظاہرے، ملنر کے قوانین و تصریحات ۱۹۲۲ ۔ سعد زغلول پر زیادتی، شہداء کا ذکر، عبدالحمید کا دستور عطا کرنا، پھر عبدالحمید کا سقوط، جنگ طرابلس، دمشق کا حادثۂ جانکاہ، جس میں ہزاروں عرب کام آئے، یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن کا عرب شاعروں نے دل کھول کر ذکر کیا ہے،

کاشف کہتا ہے:

لم هذا النوم عن حفظ الحمى　　　　وهو يدعوكم ويشكو ان لما

ملک کی حفاظت سے یہ غفلت کیا معنی رکھتی ہے جبکہ وہ تم کو پکارتا ہے اور شکوہ سنج ہے،

ولی الدین یکین اختراعات جدیدہ کی تعریف کرتا ہے،

الناس ملوا من المطايا　　　　فجاء من بعدها البخار

لوگ سواریوں سے اکتا گئے تو پھر بھاپ آئی

وملوه اكتفوا البرايا　　　　ثم اعتلوا في السماء فطاروا

اور اس سے بھی لوگ اکتا گئے تو پھر آسمان پر بلند ہو کر اڑنے لگے۔

یا حبذا عصرنا الجدید

خوش آمدید اے ہمارے عصر جدید

جدید عربی شاعری کا ارتقا یورپی اثرات کے تحت ظہور پذیر ہوا، اسی بنا پر اس میں وہ تمام عناصر نظر آتے ہیں جو انگریزی اور فرانسیسی شاعری کا بنیادی سرمایہ ہیں، اس میں وہ تمام ادبی تحریکیں منعکس ہیں جنھوں نے یورپی ادب کو متاثر کیا، چنانچہ جدید عربی شاعری میں رومانیت، رمزیت، سرائیلزم اور دوسری ادبی تحریکوں کے اثرات پوری طرح جلوہ گر و ضوفگن نظر آتے ہیں، دراصل جدید اور قدیم شاعری کا بنیادی فرق بھی اسی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ قدیم شاعری میں قوت، اسلوب کی پختگی اور زبان کی بلندی نمایاں ہے، مگر معانی کے لحاظ سے اس میں تقلید پرستی اور اضمحلال کی کیفیت ہے، اس کے برعکس جدید شاعری معنوی لحاظ سے قوی تر ہے، اس میں پہلی بار عربی شاعری زندگی سے اور مسائل زندگی سے دست وگریباں نظر آتی ہے، بلاشبہہ ابتدا سے عربی شاعری کی بنیاد حقائق حیات پر تھی، مگر ابو تمام، متنبی اور ابو العلا معری نے اس کو فلسفہ کے رنگ میں رنگ دیا، بعد کی شاعری تو بالکل تقلیدی ہو کر رہ گئی جس کا تعلق زندگی سے بالکل نہ رہ گیا،

چونکہ جدید شاعری نے ایک سیاسی اضطراب اور نیم غلامانہ فضا میں جنم لیا اس لیے اس میں سب سے اہم عنصر وطن پرستی ہے، پوری جدید شاعری وطن پرستی، قوم پرستی اور علاقہ پرستی کے جذبات سے پُر ہے، عربی بولنے والے ہر ملک کے شاعر نے اپنے ملک کی قدیم تاریخ، امتیازات اور ممتاز شخصیتوں پر فخریہ انداز سے نغمہ سرائی کی ہے،

عرب انشاء پردازوں اور مورخوں نے اپنے اپنے ملک کی جانب توجہ کی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوکہ جدید عربی شاعری کو وطنی شاعری سے تعبیر کیا جاسکتا ہو مصری اور لبنانی شعراء نے تو وطن کے نغموں سے اپنے دواوین پُر کر دیے ہیں، بعض وقت تو طبیعت ایک ہی موضوع کی تکرار سے اکتانے لگتی ہے، وطن پرستی کا یہ عنصر بھی یورپ کے اثرات کا نتیجہ ہے،

وطنی شاعری کے بعد رومانی اور سماجی شاعری ہے، واقعہ یہ ہے کہ عرب شعراء نے زندگی اور زمانہ کی تصویر کشی میں بڑی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے، انھوں نے سماج کے مختلف طبقات کی ترجمانی کی ہے، خصوصاً غریب و بدحال طبقہ کے جذبات احساسات اور قابل رحم حالات کا بیان بڑے مؤثر انداز سے نظر آتا ہے،

وطن پرستی، عربیت اور اسلامی عناصر یہ جدید عربی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں جن کی مثالوں سے شعراء کے دواوین پُر ہیں، یہ عناصر باہم دست و گریبان نظر آتے ہیں، جدید عربی شاعری میں اقدار اور نظریہ ہائے حیات کی کشاکش و کشمکش پوری قوت کے ساتھ جاری و ساری نظر آتی ہے، اس میں مغرب کے مقلدین بھی ہیں اور مشرقی زندگی کے پرستار بھی، اسلام کے تعمیری رجحانات کے علمبردار بھی اور مذہب سے بیزار بھی یہاں بنیادی تبدیلی یہ نظر آتی ہو کہ اب شاعری میں جو قدریں ہیں وہ مذہبی یا غیر مذہبی بہرحال زندگی سے متعلق ہیں، اب شاعری شخصی کیفیات کی ترجمانی اس معنی میں نہ رہ گئی جیسا کہ پہلے تھی کہ بادشاہ کی مدح، اس کے یہاں ولادت ہو تو تہنیت، بیمار ہو کر شفا ہو تو قصیدہ اور مر جائے تو مرثیہ، موجودہ شاعری میں موضوعات ہی نہیں بلکہ شکل و ہیئت تک بدل گئی، یہ تبدیلی عربوں کی صدیوں بلکہ ہزاروں برس کی تاریخ میں کبھی وجود میں نہ آئی تھی، انھوں نے کبھی شاعری کی ہیئت کو تبدیل نہ کیا تھا

صرف پوری تاریخ میں اسپین کی عربی شاعری میں ہیئت و قالب کے لحاظ سے ایک نئی قسم ایجاد کی گئی تھی، جس کا نام تھا "الموشح" بعد میں اس کا رواج بھی عام نہ ہوسکا اسکے برعکس دور جدید میں آزاد شاعری اور شعر منثور کا عربوں میں رواج ہوا،

عربی شاعری ایک غنائی شاعری ہے، اس میں نغمہ اور وزن کو اہمیت حاصل ہے، اسی بنا پر اگرچہ جدید شاعری عربی میں اب بھی مری نہیں مگر اس کو قبولیت عامہ کا شرف حاصل نہ ہوسکا،

آزاد، مرسل اور شعر منثور کو سب سے زیادہ لبنان میں ترقی کا موقع ملا، اس کی ایک وجہ تو "شعرائے مہجر" ہیں، سیاسی و معاشی وجوہ کی بنا پر جو شعرا امریکہ اور یورپ میں جا کر مقیم ہوگئے تھے انھوں نے وہاں کی زندگی سے پورا فائدہ اٹھایا، اور اپنی شاعری میں یورپی انداز و افکار پیش کیا، قومی رنگ و آہنگ کو بھی انھوں نے باقی رکھا اور ذاتی رنج و محن کی تصویر کشی بھی کی، پھر چونکہ "لبنان" پہلا علاقہ ہے جہاں روسی، فرانسیسی اور امریکی تعلیم گاہیں قائم تھیں، اس لیے سب سے زیادہ جدید اثرات لبنانی شعراء پر مترتب ہوئے، اور آج بھی سب سے زیادہ آزاد نظمیں ہم کو انھیں لبنانی شعراء کے دواوین میں نظر آتی ہیں، یہی نہیں بلکہ انھیں اسباب و وجوہ سے لبنانی شعراء میں تحریک رمزیت سرریئلزم اور رومانوی اثرات مصری، شامی اور عراقی شعراء کے مقابلہ میں زیادہ گہرے نظر آتے ہیں،

"شعرائے مہجر" میں جو دو جدیدیت کی علمبردار تحریکیں اٹھیں ان میں در اصل لبنانی شعراء تھے، تحریک "رابطۂ قلمیہ" اور تحریک "عصبۂ اندلسیہ" درحقیقت

انی ادبا و شعراء کے افکار کی صدائے بازگشت تھیں، ان میں سے بہت شعراء
میں لبنان واپس بھی آگئے، مثلاً میخائیل نعیمہ وغیرہ، اس وجہ سے لبنانی شاعری
، وطنیت کی زیادتی اس لیے ہے کہ اکثر شعراء کو جلا وطن رہ کر وطن کی محبت
الطف تیز سے تیز تر ہوگیا، دوسری طرف براہ راست مغربی زندگی نے انکے
شاعرانہ جذبات کو اپنے رنگ میں رنگ لیا اور ان کے یہاں شاعری میں مادہ و
الب دونوں بدل گئے، یا کم از کم تغیر پذیر ہوکر اور اپنی قدیم شکل بدل کر ہمارے
سامنے آئے،

اگرچہ مصر جدید شاعری میں اہمیت کا حامل ہے، یہاں سے دو عظیم ادبی تحریکیں
اٹھیں، جنھوں نے عربی شاعری پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے، یعنی تحریک
"الدیوان" اور تحریک "ابو لو" مگر جہاں تک مغربیت اور جدیدیت کے
اثرات کو قبول کرنے کا سوال ہے، اس میں سب سے زیادہ اولیت شعرائے مہجر
اور شعرائے لبنان کو حاصل ہے جنھوں نے پہلا بار عربی شاعری کی ہیئت میں تغیر پیدا کردیا اور
نئے نئے انداز سے طبع آزمائی کرکے عربی شاعری کے دامن کو وسیع کردیا،

عربی شاعری کا دور جدید انیسویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوتا ہے،
یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اجتماعی زندگی میں عربی صحافت کو غیر معمولی اہمیت حاصل
ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قدیم عربی ادب میں نئی زندگی پیدا کرنے
کے عام ذوق وشوق نے لوگوں کے دلوں کو سرشار کردیا، عصر عباسی کے شعرا
کا اثر عرب شاعروں پر غیر معمولی طور پر قائم رہا، جس سے وہ رفتہ رفتہ نجات
حاصل کرتے رہے، پہلا شاعر جس نے قدما کے پرتکلف اسالیب سے ذرا ہٹ کر اپنی

اپنی شاعری کی بنیاد رکھی، وہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، محمود سامی بارودی تھا، اس نے اپنی قدامت کے باوجود اپنے دور کے رجحانات سے آب ورنگ حاصل کیا ہے، عبد المطلب، رافعی، کاظمی، جارم اور قایانی وغیرہ ایسے شعرا ہیں جو ایک جانب قدیم شاعری کے محافظ ہیں، اور دوسری جانب زمانہ کی رفتار سے مجبور ہو کر سوسائٹی کے تقاضوں کو بھی اپنی شاعری میں پیش نظر رکھتے ہیں،

اس موقع پر یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ جب شام و مصر میں مغربی تہذیب کا چراغ روشن ہوا تو عربوں کو نظر آنے لگا کہ وہ کتنے اندھیرے میں ہیں، اور ان کی تہذیب کتنے پیچھے رہ گئی ہے، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے قومی آزادی کے نشہ سے عربوں میں سیاسی بیداری کا صور پھونکا، جس نے پہلے ترکوں کی حکومت کو ختم کیا، بعد میں وہی جذبۂ حریت ان استعماری طاقتوں کی بیخ کنی میں استعمال ہوا، شعراء نے آزادی کی لہروں سے اپنے دواوین کو متموج و متلاطم بنا دیا، انھوں نے عوام کے جذبۂ حریت، وطن کی غلامی و مجبوری، استحصال بالجبر، استعماری مظالم، عربوں کی پستی، قومی بلندی کے حوصلے اور آزادی کے لیے جد و جہد کو پورے زور و شور کے ساتھ اپنی شاعری میں مصور و منور کر کے پیش کیا، اس مقصد کے لیے انھوں نے اسلامی تاریخ سے وہ اوراق زریں لیکر عربوں کے سامنے کر دیے، جب کہ وہ فاتح، ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کے حامل اور زندگی میں اعلیٰ اقدار کے ترجمان تھے، اور انھوں نے ساری دنیا میں عدل و انصاف، شرافت و انسانیت اور ادب و تہذیب کی فضا قائم کر دی تھی، اس طرح عربوں کے جذبات

برانگیختہ کرکے ان کو شعراء نے عمل واقدام پر ابھارنے کا کام بڑے موثر انداز سے لیا ہے،

یہاں ایک حقیقت اور پیش نظر رکھنی ضروری ہے، وہ یہ کہ جب مغربی تہذیب کا سیل رواں عربوں تک پہنچا اور اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے تو وہ طبقہ جو بالکل مغرب زدہ اور جدیدیت پسند تھا اس نے ہر قدیم کی برائی اور ہر جدید کی تعریف شروع کردی اور مغرب کی تقلید کا پرزور داعی بن گیا، اس طرح عربوں میں دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ایک ذہنی کشمکش اور جدید قدیم کی کشاکش کا آغاز ہوگیا، عربوں میں جامع ازہر کا تعلیم یافتہ طبقہ مذہبی تھا، اب گویا مغربی تہذیب اور اسلامی روایات کا براہ راست تصادم تھا، ایک طرف عربوں کی نگاہیں یورپ کی مادی ترقی سے مبہوت تھیں اور دوسری جانب ماحول، مطالعہ اور تاریخی عظمت کے باعث انکے ذہن میں عربوں کی برتری اور اسلام کی اہمیت جاگزیں تھی، اذہان میں یہ کشمکش جاری تھی کہ عربوں کے سامنے سید جمال الدین افغانی کی عظیم و جسیم شخصیت آتی ہے، جنھوں نے اپنے اعلیٰ افکار، اپنے جمہوری نظریات اور اپنے انقلابی واقدامی تصورات سے ہر جگہ ایک ہلچل پیدا کردی، وہ جہاں گئے وہاں انقلاب کے جراثیم اس طرح بکھیر دیے کہ بغاوت ہوگئی اور جمہوریت پسند عناصر پرجوش ومتلاطم ہوگئے، ان کے وجود سے ہر ملک میں جہاں وہ گئے بادشاہوں نے خطرہ محسوس کیا، یہی کیفیت مصر میں ہوئی، مصر کا نیا طبقہ خواہ وہ شعرا کا ہو یا ادبا کا، علما کا ہو یا سیاست دانوں کا، ان سب نے جمال الدین افغانی جیسے بطل حریت سے

تاثر قبول کیا، مصر پر افغانی کے بعد ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہٗ کے اثرات بڑے گہرے پڑے، ان بزرگوں نے ادب و دین دونوں کی خدمت کی، جدید شعر و ادب کا ذکر ان کے بغیر ادھورا رہ جائے گا، انھوں نے خطرہ محسوس کیا کہ مبادا کہیں عرب اپنی گذشتہ علمی ثقافتی اور اسلامی میراث جدیدیت کے سیلاب میں کھو نہ بیٹھیں، چنانچہ ان کی فکری تحریک نے مغربی استعمار کے خلاف ایک فضا ہموار کر دی، جس کا مظہر اعرابی پاشا کی بغاوت میں ظاہر ہوا اور دوسری جانب انھوں نے اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعہ جدید طبقہ کے ذہن کو اسلامی اقدار حیات سے آشنا کیا، افغانی اور محمد عبدہ نے عربوں کے تمام اہل نظر و مفکرین کو متاثر کیا، ان کی اس کاوش کا نتیجہ ہے کہ عرب اگرچہ اپنی معاشرت میں مغرب زدہ ہو گئے مگر اسلام اور عربیت کی برتری کا نقش ان کے فکر و شعور پر غالب ہے، حافظ، شوقی اور زہاوی وغیرہ کی شاعری کو دیکھنے سے اس حقیقت کا ثبوت فراہم ہو سکتا ہے،

بہرحال قدیم و جدید کی کشمکش عربی ادب میں باقی رہی، عربی شاعری میں بھی یہ دونوں انداز فکر موجود ہیں، محمد علی نے یورپ کو بہت سے وفود حصول تعلیم کے لیے روانہ کیے، مگر ان میں ابتدائی دور میں تو کچھ حرکت و عمل کی عظمت نظر آتی ہے، مگر بعد میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس انداز سے ترقی شروع ہوئی تھی، وہ جاری نہ رہ سکی، چنانچہ ڈاکٹر احمد امین رقمطراز ہیں کہ رفاعۃ الطہطاوی کے بعد پھر ترجمہ کی مہم بھی کمزور پڑ گئی، اور کوئی غیر معمولی تصنیف بھی منصۂ شہود پر نہ آسکی، بعضوں کا خیال ہے ترجموں اور تصانیف کے بارے میں انگریزوں نے

عمداً ایسا رویہ اختیار کیا جس سے عربوں کی ہمت شکنی کیجائے،

اسی کے ساتھ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، عربوں میں قدیم علوم کے احیاء کا جذبہ پیدا ہوا، اس کا آغاز مستشرقین نے کیا تھا، انھوں نے اپنے کتب خانوں میں عربی کتابوں کے عظیم ذخیرے جمع کر لیے، پھر محنت و مشقت اٹھا کر ان کو بڑے اہتمام سے شائع کرنا شروع کر دیا۔ مصر نے بھی اس کی تقلید کی اور محمد علی نے مطبعہ "بولاق" قائم کیا، ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یورپین علماء عربی کتابوں کو شائع کرتے ہیں، تو وہ بڑی محنت و لگن سے کام کرتے ہیں مگر عرب ممالک میں تجار نفع اندوزی کے لیے یہ کام کرتے ہیں، اس لیے مستشرقین کی کتابیں زیادہ اہمیت وعظمت کی حامل ہوتی ہیں[1]

یہی عربی و غربی مخلوط انداز فکر شاعری پر بھی محیط ہے، پوری علمی زندگی، شعر و ادب اور تعلیم و تفکیر تک میں مغربیت و مشرقیت کی کشمکش جاری ہے

بعض شعراء امرء القیس کو اعلیٰ شاعری کا نمونہ تصور کرتے ہیں اور بشار و ابونواس کی مثالوں کو سامنے رکھتے ہیں، مگر مغرب زدہ شکسپیر اور گوئٹے وغیرہ پر جان دیتے ہیں، نثر میں عربیت پرست ابن مقفع، جاحظ اور حریری کو نمونہ تصور کرتے ہیں، مگر مغرب زدہ طبقہ ہیگو اور والٹیر کے شائق ہیں، اس طرح یہ شریعت اسلامیہ کو بہتر تصور کرتے ہیں، مگر مغرب زدہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے قوانین کے مداح ہیں،

(باقی)

---

[1] فیض الخاطر ج ۱ ص ۲۶۹

اسلامی تصوف کی مابعد الطبیعی بنیادیں

از جناب غلام محمد ادنتو صاحب ریسرچ اسکالر شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

اسلام میں تحریک تصوف کے مطالعہ کے لیے بالعموم دو طریقے اختیار کیے جاتے رہے ہیں، ایک طریقہ تو خود مسلمانوں مثلاً شاہ ولی اللہؒ اور ان کے متبعین سید احمد شہیدؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ کا ہے جو تصوف کو عین روح شریعت سمجھتے ہیں، انکے خیال کے مطابق اسلام جہاں افراد کے خارجی اعمال کو منضبط کرنے کے لیے مختلف سماجیاتی اداروں کی تشکیل کرتا ہے، اور ان کے لیے قوانین و شرائع وضع کرتا ہے، وہیں وہ ان کے باطنی تزکیہ و تصفیہ کی بھی فکر کرتا ہے، اور اس کے لیے ایک علحدہ لائحۂ عمل مرتب کرتا ہے، جس طرح شریعت کے احیاء کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں، اسی طرح اسلام میں روح شریعت یعنی تصوف کی تجدید بھی ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے، اس لیے تصوف کی تاریخ خود اسلام کی تاریخ سے علحدہ کوئی چیز نہیں ہے، اس کے برعکس مستشرقین اس کو غیر اسلامی تحریک قرار دیتے ہیں، انکا خیال ہے کہ تصوف ایک طرف تو وقت کے سیاسی و سماجی حالات سے متاثر ہوا، اور دوسری طرف یہ نوفلاطونیت، زردشتیت اور ویدانتی فلسفہ کے اثرات قبول کرتا رہا، اسلیے یہ حقیقی اسلام سے ایک علحدہ چیز ہے،

اگر پہلے نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو تصوف کو اسلام سے ایک الگ بات کے

سمجھنے کی بات ہی بے معنی ہو جاتی ہے، دوسری طرف اس کو سرتاسر غیر اسلامی افکار کا
پروردہ اور زوال کی علامت سمجھنا اس لیے غلط ہے کہ ہر زمانے میں صوفیا نے شریعت
سے اپنی وابستگی و وفاداری کا اظہار کیا ہے جو اس کو اسلامی طریق فکر سمجھنے کے لیے کافی
ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدا تو اس کے ماننے والوں کی سادہ اطاعت اور اتباع
سے ہوئی لیکن کچھ ہی برسوں کے اندر جو سیاسی حالات پیدا ہوئے اس بنا پر سکون
پسند اور ہنگاموں سے دور بھاگنے والے اصحاب کو گوشہ نشینی کی زندگی گذارنے کیلیے
مجبور کر دیا، یہ گوشہ نشین صوفیا شریعت کے پابند رہے، اس کے مبلغ بھی اور ہر قسم کی اختراع
و بدعت سے متنفر تھے، لیکن گوشہ نشینی اور تنہائی پسندی کا جب رجحان بڑھتا گیا تو
اعتدال رفتہ رفتہ جاتا رہا، اور غیر اسلامی فلسفوں کے زیر اثر جہاں ایک طرف عقائد
میں نو فلاطونی، ویدانتی اور یونانی تصورات کی آمیزش ہوئی وہیں ایسے اعمال و
اشغال کو بھی دخل حاصل ہوا، جسے اسلام کی سادگی سے مطابقت دینا مشکل ہے،
لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صوفیا کے گروہ میں حکما کی طرح عقائد و اعمال کو قرآن و
سنت سے مطابقت دینے کی شعوری کوشش برابر جاری رہی جس کی وجہ سے تصوف
بحیثیت مجموعی اپنی اسلامی حیثیت سے بہت دور نہ ہو سکا، یہاں ضمناً یہ بات بھی
کہی جا سکتی ہے کہ صوفیا نے جو مبہم اور کثیر المعنی اصطلاحات استعمال کیے تو فقہا کا
اعتماد جاتا رہا، اس عدم اعتماد کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ ایک صوفی نے کوئی اصطلاح کسی خاص
معنے میں استعمال کی لیکن اس کے متبعین نے اس کو دوسری طرح سمجھا اور پھر ان کے
مریدوں نے اس کو تیسری طرح پیش کیا جس سے اس کی اصل صورت ہی مسخ ہوتی گئی،
تصوف کا مطالعہ مابعد الطبیعیاتی علمی اور اخلاقی حیثیت سے کیا جا سکتا ہے،

زیر نظر مضمون میں ہم صرف پہلے حصے سے بحث کریں گے، ما بعد الطبیعیات سے مراد یہ ہے کہ شہودی کثرتوں اور تنوعات کے پیچھے کسی واحد حقیقت کی جستجو کیجائے، خدا، کائنات اور روح اس کے خاص موضوعات ہیں، نیز ضمناً اس میں ذات و صفاتِ خداوندی، غاییت، جبر و قدر اور زندگی بعد موت کی بھی بحث آجاتی ہے، یہ ما بعد الطبیعی موضوعات فلسفہ اور مذہب کے مشترک موضوعات ہیں، قرآن کا براہ راست مخاطب چونکہ فرد ہے اور فرد کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ان تمام مسائل سے ہے اس لیے ان پر دیگر مذاہب کی طرح قرآن بھی روشنی ڈالتا ہے،

قرآن کے مطابق حقیقت الحقائق خدا کی ذات ہے، جو ہمہ تواں، ہمہ داں، اور ہمہ گیر ہے، وہ تنہا، مطلق اور غیر مرکب ذات ہے، جس کی بیشمار صفات ہیں جنھیں ہم اس کے ناموں کی حیثیت سے جانتے ہیں، خدا نے اپنی مرضی سے کائنات کو عدم سے وجود میں تبدیل کیا، اور ایک مخصوص ارتقائی عمل سے گذار کر اس حد تک تیار کیا کہ انسان اس میں اپنی زندگی گذار سکے، اس نے انسان کی تخلیق سوکھی کھنکھناتی مٹی سے کی، پھر اس کی شکل و صورت متعین کی اور پھر اس میں اپنی روح پھونک دی، جس سے انسان باشعور اور اشرف المخلوقات ہوا، جسم آدم میں روح پھونکنے کے بعد خدا نے اپنی دوسری مخلوق یعنی فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے اطاعت گذار ہوں، اس حکم کے تحت تمام فرشتوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے جو کہ ایک جن تھا، سرکشی کی، پھر ابلیس نے حضرت آدم و حوا کو بہکایا جس کے نتیجہ میں خدا نے ان کو ابلیس کے ساتھ زمین پر ایک وقت معینہ تک رہنے کے لیے بھیج دیا، کائنات بے مقصد نہیں پیدا کی گئی ہے، بلکہ اس کا ایک آغاز اور انجام ہے، انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا گیا کہ وہ خدا

کی عبادت کریں، انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے، جبکہ دیگر موجودات کچھ بندھے ٹکے قوانین کی پابند ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ساجی نظم بہتر طور پر چلانے کی ہدایت دی، وہ اگر ان ہدایات کو قبول کر کے ان کے مطابق عمل کرے گا تو آخرت میں اس کا اجر و ثواب جنت کی صورت میں ملے گا، ورنہ اسے جہنم کا ابدی عذاب برداشت کرنا ہوگا،

خدا، کائنات اور روح انسانی کی علٰحدہ علٰحدہ نوعیتوں اور ان میں باہمی تعلق کی نسبت جو تفصیل قرآن نے پیش کی وہ سادہ لوح عوام کو تو مطمئن کر سکتی تھی لیکن فلسفیانہ تجسس رکھنے والے دلوں میں یہ شکوک پیدا ہوتے تھے کہ اگر خدا ایک خاص اور مفرد ذات تھا تو اس کے اندر سے مادی اجسام کا ظہور کس طرح ہوا، نیز یہ کہ اگر خدا تعالےٰ ہی اصل حقیقت ہے تو اس کے مقابلہ میں اس کائنات کا کیا مقام ہے، کیا یہ بے حقیقت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بعض مسلمان حکما، اور صوفیا، نے خدا اور کائنات کے تعلق کی وہ تشریح نوفلاطونی فکر کے ذریعہ سے کی، فلوطینوس (Plotinus) کے مطابق ذاتِ خداوندی اگرچہ ہر طرح کی کثرتوں اور تنوعات سے پاک و منزہ ہے لیکن ساتھ ہی تمام موجوداتِ عالم جسم و ذہن نیز صورت و مادہ کا منبع ہے، خدا اپنی ذات میں ہر شے کو شامل کیے ہوئے ہے، وہ غیر معلول علت ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا، اور ہر شے اسی سے پیدا ہوئی ہے، کثرت اور وحدت میں گہرا اور ناقابل انقطاع تعلق ہے، وحدت کے بغیر کثرت کا تصور ناممکن نیز اسے موخر الذکر پر اولیت بھی حاصل ہے، وہ ایک ارتفاعی اور انتزاعی وجود ہے جسے صفات سے متصف کرنا اس کو محدود کرنا ہے، حسن

جمال، حق، خیر شعور اور ارادہ وغیرہ سبھی اس کی ذات پر منحصر ہے، اور وہ خود ان سے بلند ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ سوچتا یا ارادہ کرتا ہے، کیونکہ سوچنا یا ارادہ کرنا اس بات کا متقاضی ہے کہ کچھ سوچا یا ارادہ کیا جائے، اس طرح سے خدا موضوع اور معروض میں بٹ جائے گا اور اس کی انتزاعیت متاثر ہوگی، کائنات کے متعلق فلوطینوس بتاتا ہے کہ اس کی ابتدا خدا کے وجود سے ہوئی لیکن خدا کائنات کا خالق نہیں ہے کیونکہ تخلیق کا انحصار شعور و ارادہ پر ہے، اور خدا ان سے مبرا ہے، یہ خدا کی ارتقا یافتہ شکل بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی ذات میں کامل و اکمل ہے، وہ نظریہ تخلیق کے برعکس نظریہ بروز یا نظریہ صدور (Theory of Emanation) پیش کرتا ہے۔ جس کے مطابق عالم کا صدور خدا کی ذات سے ہوتا ہے، خدا ایک سرچشمہ ہے جہاں سے اشیاء کے دھارے اپنے منبع کی لامتناہیت کو متاثر کیے بغیر مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں، جس طرح سے کہ نوری شعاعیں لامتناہی طور پر اپنے مبدء یعنی سورج سے نکلتی ہیں، تمام اشیائے عالم اپنے وجود کے لیے خدا کی ذات کی حاجتمند ہیں، نیز اس کے مقابلے میں قطعی بے حقیقت ہیں ۔

خدا سے عالم کا صدور تین مرحلے میں ہوا، بالکل ابتدا میں صرف خدا تھا، جو خیال مطلق یا عقل مطلق تھا، پھر اس نے ایک مثالی اور کامل ترین کائنات کا تصور کیا اور اس طرح وہ موضوع و معروض میں بٹ گیا، لیکن یہ موضوع و معروض بھی اس کی اپنی ذات ہی تھی، اس نے خود سے خارج کسی شے کا تصور نہیں کیا، اس کا تصور کرنا ایسا ہے کہ تصور کرنے والا، تصور کرنے کا عمل اور تصور کی جانے والی شے ایک ہی ہوتے ہیں۔ خدا کے اس تصور کرنے سے روح کا

صدور ہوا، روح اس خیالِ مطلق کا ایک معلول یا عکس یا ظل تھی جس کا صدور خدا کی ذات سے ناگزیر تھا، کیونکہ ہر تصور یا فکر خود کو منصۂ شہود پر لانے کے لیے جد وجہد کرتی ہے، یہ روح اپنے جوہر کے اعتبار سے ایک طرف تو خدا سے جڑی ہوئی ہے اور دوسری طرف اس کا تعلق عالم محسوس سے ہے، اپنی پہلی حیثیت میں یہ خیال ہے اور تصورات پر غور کرتی ہے، فلوطینوس اسے روحِ عالم کا نام دیتا ہے، دوسری حیثیت میں یہ عالم طبیعی ہے، اور اپنے اظہار کے لیے مادہ وجود میں لاتی ہے، مادہ اس صدوری عمل میں اسفل ترین درجہ کا حامل ہے، اور تاریکی و شر کی علامت ہے، مادہ کے اوپر جب روح اپنا عمل کرتی ہے تو ان کے اختلاط سے محسوس اشیاء کا ظہور ہوتا ہے، کائنات میں جو حسن، ترتیب، تنظیم اور وحدت پائی جاتی ہے وہ روحِ عالم کے ہی باعث ہے، جس کا رخ اپنے مبدء یعنی خدا کی طرف ہے،

کائنات اور خدا کے درمیان ابداعی تعلق کی جو نوفلاطونی تشریح اوپر بیان کی گئی اس میں دو باتیں خاص طور پر توجہ دینے کی ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ فلوطینوس کے مطابق کائنات خدا کے کسی ارادہ کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی ان دونوں میں کوئی زمانی تفریق ہے بلکہ خود خدا کی فطرت کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ کائنات کا صدور اس کی ذات سے ہو، یعنی یہ کہ کائنات بھی خدا کی ہم وجود اور اس کے ساتھ ازلی و ابدی ہے، دوسری بات یہ تھی کہ اس نے کائنات اور خدا میں معلول اور علت کا فرق ختم کرکے کائنات کو خود خدا کا مظہر قرار دیدیا، اور اس طرح وحدت الوجود کے نظریہ کی تائید کی، یہ دونوں ہی تصورات قرآنی تصورات سے متصادم تھے جس کے مطابق خدا ایک ارتفاعی اور انتزاعی وجود ہوکے بھی کائنات میں جاری و ساری تھا، نیز کائنات خدا کے شعوری

ارادہ کا نتیجہ تھی، نہ کہ کوئی غیر شعوری و غیر ارادی صدور، ظاہر ہے کہ دونوں اقسام کے ساتھ یہ تشریح ان مسلمان حکما، وصوفیا کے لیے جو کہ قرآنی آیات کی صداقت پر گہرا ایمان رکھتے تھے، اپنی پوری تفصیل کے ساتھ ناقابل قبول تھی لیکن اسکے باوجود ایک فلسفیانہ توجیہہ کی حیثیت سے قابل غور ضرور تھی، مسلمان حکما، نے اس بات کی کوشش کی کہ کوئی ایسا فلسفہ ایجاد کیا جائے جو عقل کے بھی مطابق ہو اور قرآنی آیات کی بھی نفی نہ کرتا ہو، اس کے لیے انھوں نے نوفلاطونی تشریح میں مختلف ترمیم و اضافے کیے اور اسے قرآن سے مطابقت دینے کی کوشش کی،

فارابی جو ایک منظم اور مربوط فلسفیانہ نظام ترتیب دینے والا پہلا مسلمان فلسفی ہے، اس نے پہلے پہل اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، اس نے منطقی اصولوں کی بنیاد پر موجودات کو واجب الوجود اور ممکن الوجود دو حصوں میں تقسیم کیا، واجب الوجود وہ شے ہے جس کا تصور ناگزیر طور پر اس کے وجود کا متقاضی ہوتا ہے، جبکہ ممکن الوجود اشیاء کے تصور کے لیے وجود لازمی نہیں ہے، یعنی یہ کہ ممکن الوجود کو جہاں غیر موجود تصور کیا جاسکتا ہے، واجب الوجود کے ساتھ ایسا ممکن نہیں ہے، ممکن اشیاء کا وجود چونکہ مشروط اور اضافی ہے، اس لیے یہ اپنے وجود کے لیے ہمیشہ ایک علت کی محتاج ہوتی ہیں، یعنی اس علت کے سیاق میں وہ ممکن شے موجود ہوتی ہے، جبکہ فی ذاتہ قطعی ناموجود، فارابی بتاتا ہے کہ اگر ہم کائنات کی تمام اشیاء پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ ہر شے کسی نہ کسی علت کی معلول اور اس طرح ممکن الوجود ہے، چونکہ تمام اشیاء معلول لیکن پھر بھی موجود ہیں، اس لیے ان کا بالآخر کوئی نہ کوئی علت اول ہونا چاہیے، علت و معلول کا سلسلہ پیچھے چلتا ہوا کہیں نہ کہیں رکنا ضرور چاہیے، فارابی کے مطابق وہ ہستی جو کہ

سے پہلے موجود تھی، یعنی جہاں علت و معلول کا سلسلہ رک جاتا ہے وہی خدا ہے۔ اسے وہ علت اول، غیر معلول علت، علت العلل یا خدا کا نام دیتا ہے، چونکہ خدا کے وجود کی کوئی علت نہیں ہے اور وہ خود سے موجود ہے اس لیے وہ واجب الوجود ہے۔

تخلیق کے بارے میں فارابی بتاتا ہے کہ یہ خدا کا کوئی غیر ارادی اور طبعی فعل نہیں ہے اور نہ ہی اس معنی میں ارادہ کا نتیجہ ہے، جس معنی میں کہ ہم عام طور پر اسے استعمال کرتے ہیں، خدا کے انسانوں کی طرح ارادہ کرنے کا مطلب اسے محدود کرنا ہے، خدا ہمہ داں اور قادر مطلق ہستی ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ باشعور ہے بلکہ خود شعور بھی ہے، نو فلاطونیت کی مطابقت میں اس نے بھی بتایا کہ خدا نے پہلے خود اپنا علم حاصل کیا اور اس عمل میں علم معلوم اور عالم تینوں ایک ہی تھے، خدا نے جب اپنی ہمہ گیر صفات کا علم حاصل کیا تو اس سے عقل اول کا ظہور ہوا، یہ عقل اول ایک کامل باشعور اور غیر مادی وحدت تھی اور خدا سے براہ راست صادر ہونے کی وجہ سے اس سے اقرب تھی، نیز اس کے علاوہ چونکہ یہ معلول تھی اس لیے فی ذاتہ ممکن اور کثرتوں کی حامل تھی لیکن خدا کے حوالے سے واجب الوجود اور مفرد تھی، عقل اول نے جب اپنی پہلی حیثیت کا اذعان حاصل کیا تو اس سے عقل ثانی کا ظہور ہوا جو کہ اسی کی طرح غیر مادی تھی، لیکن اپنی امکانی حیثیت کے تفکر کے نتیجہ میں فلک اول پیدا ہوا، جو روح اور جسم دونوں پر مشتمل ہے، عقل ثانی سے عقل ثالث اور فلک ثانی کا صدور ہوا، اور اس طرح یہ سلسلہ دس عقول اور نو افلاک پر ختم ہوا۔ فارابی دس عقلوں کے سلسلہ کو جو کہ خالص روحانی اور غیر مادی ہیں عالم امر کہتا ہے، اور افلاک کے سلسلہ کو عالم خلق، اسکے مطابق عقل آخر نے فلک آخر کے اتصال سے روح عالم اور مادہ کو جنم دیا جن کے باہمی

عمل سے عالم محسوس وجود میں آیا،

اوپر کی گفتگو سے واضح ہے کہ فارابی اور دوسرے مسلمان فلاسفہ نے بھی جہاں خدا کے علت عالم ہونے کی حیثیت برقرار رکھی وہیں تخلیق کے لیے کچھ درمیانی واسطوں کو بیچ میں لاکر اس کی وحدت کی حفاظت کی، صوفیا، عام طور پر حکماء کی اس تفریق کو کہ خدا واجب الوجود ہے اور دوسری اشیاء ممکن، صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن خدا اور کائنات کے تعلق کے بارہ میں ایک دوسری تفصیل پیش کرتے ہیں،

شاہ اسمٰعیل شہید (۱۷۷۹-۱۸۳۱) نے اپنی کتاب عبقات میں فلسفہ تصوف کے مختلف مسائل پر بہت اچھی بحث کی ہے جس سے صوفیا کے عام نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ فلسفۂ تصوف کی یہ شاہکار کتاب جہاں ایک طرف مصنف کی عمیق، متوازن اور سلجھی ہوئی فکر کی آئینہ دار ہے، وہیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تصوف اپنے اس آخری مرحلہ میں راسخ العقیدگی سے کس قدر قریب ہو گیا تھا۔ شاہ صاحب کا اساسی اصول جس سے وہ تمام مابعد الطبیعیاتی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ خدا کی قیومیت ہے جو عصر حاضر کے وجودی فلسفہ کے تصور ہستی (Being) سے بہت حد تک مماثل ہے، یعنی وہ شے جو کہ کائنات کی تمام کثرتوں میں پوشیدہ مشترک اور ان کی بنیاد ہے، خدا محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ وہ قیوم کائنات (Sustainer) بھی ہے، یعنی یہ کہ عالم میں جو اشیاء نظر آ رہی ہیں انکا قیام خود ان کے وجود پر منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دوسری پس پردہ ذات کے ذریعہ قائم ہیں اور کائنات کی تمام ماہیتیں، ہویتیں اور شخصیتیں اس کے

مظاہر ہیں، خدا ایک مستور جوہر ہے جو اختلافات اور کثرتوں کی بنیاد ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کرسی، میز اور تخت وغیرہ لکڑی سے بنائے جاتے ہیں تو اگرچہ ان کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں لیکن ان کی ذات یعنی لکڑی ایک ہی ہوگی۔ قیوم واحد میں کثرتوں کے ظہور کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"بہر حال اس مثالی تمہید کے بعد سمجھو کہ دنیا میں پیدا ہونے والی ہر شے ایک ترکیبی جوڑ کی حیثیت رکھتی ہے، یعنی اس میں ایک چیز تو وہ پائی جاتی ہے جو اپنے وجود میں مستقل ہوتی ہے لیکن باوجود مستقل ہونے کے شے میں مستور و پوشیدہ رہتی ہے، یہی شے کا قیوم ہے اور دوسرا جزء اس میں وہ جو موجود تو ہوتا ہے اسی قیوم کے ساتھ اور قیوم کی بدولت لیکن ظاہر و نمایاں اسی کا وجود ہر شے میں ہوتا ہے یہی ظل ہے، پھر جب قیوم پر اظلال کا اژدحام شروع ہوتا ہے اور پہلے پیدا ہونے والے ظل کی پیدائش کی صلاحیتیں ابھر و نما ہوتی ہیں اور انکی وجہ سے ہوتیوں کی کثرت کا جو ظہور ہوتا ہے تو اس وقت ایسے امکانی نقوش کے نورانی ہیکلوں کے عجائب بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں جنکے آثار کبھی باہم ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے جدا بھی ہوتے ہیں، اس وقت ہستی کے اس بحر رحمانی کی سطح پر کوہ پیکر موجیں اٹھ اٹھکر متلاطم ہونے لگتی ہیں، اور قیوم کے آئینے میں بے شمار صورتیں منطبع ہو ہو کر جلوہ افروز ہونے لگتی ہیں جن میں عجیب و غریب استواری و محکم نسبتیں پائی جاتی ہیں،......"

(ص ۴۴-۴۳)

لیکن مندرجۂ بالا تحریر سے یہ اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس طرح تو خدا اور کائنات ہم موجود قرار پاتے ہیں، اور ان میں تقدم و تاخر یا سببیت نتیجہ کی نسبت باقی نہیں رہتی،

مزید یہ کہ اس سے خالق و مخلوق کے درمیان وجودی اتحاد کو نیز موخر الذکر کو اول الذکر کی صفت ماننا پڑے گا۔ پہلے شبہہ کا جواب دیتے ہوئے شاہ صاحب کہتے ہیں کہ جس طرح کرسی یا میز یا تخت اپنی ہیئت میں آنے سے قبل یعنی اپنی اصل ذات میں لکڑی تھی، اسی طرح اشیاء بھی اپنی مختلف صورتوں میں آنے سے قبل خدا تھیں، خدا کو تمام اشیاء پر تقدم حاصل ہے اور وہ ان کی علت ہے، خواہ اسے علت ناقصہ کی حیثیت سے لیا جائے یعنی جیسے برف ٹھنڈک کا سبب ہے یا علت تامہ کی حیثیت سے لیا جائے جیسے کہ خدا تمام علتوں کی علت ہے، دوسرے شبہہ کی توجیہ میں کہتے ہیں کہ کسی چیز کو کسی چیز سے موصوف ہونے میں صرف وجودی اتحاد ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اتحاد خواہ انضمامی ہو یا انتزاعی، اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے وجود کا ظرف و موطن بھی ایک ہو، جس طرح ایک آدمی کا ذہن گدھے یا گھوڑے کا تصور کرنے سے گدھے یا گھوڑے کی صفت سے متصف نہیں ہو جاتا، اسی طرح سے اگر خدا کی ذات سے اشیاء متعلق ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دونوں ایک ہی ہیں،

قیومی وحدت تمام اشیائے کائنات کی خالق اور تمام کثرتوں و اختلافات کا سرچشمہ ہے، اس اعتبار سے صرف اسے ہی دوام و استقلال حاصل ہے اور دوسری چیزیں اسکے سامنے بے حقیقت و بے حیثیت ہیں، کائنات کو جب خدا کے مقابلہ پر رکھ کر دیکھا جائے گا تو یہ قطعی بے حقیقت ہو گی، لیکن جب خواب و خیال سے اس کا موازنہ کیا جائے گا تو یہ عین حقیقت ہو گی، اس کی مثال ایسی ہے کہ جب کوئی شخص خواب دیکھتا ہے تو خواب میں دیکھی جانے والی چیزوں کے بارے میں اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ موجود و حقیقی ہیں، حالانکہ وہ چیزیں حقیقی اشیا کے مقابلہ میں جن کا وہ عکس ہوتی ہیں بے حقیقت ہوتی ہیں،

اسی طرح مظاہر عالم بھی اصل حقیقت کا ایک عکس محض ہیں جنکو ہم ہمارے حواس خمسہ بطور حقیقت کے لیتے ہیں اور ان سے تعلق قائم کرتے ہیں مزہ یہ کہ حالت خواب میں اگر کوئی شخص کسی کو یہ بتائے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ فریب نظر یا وہم ہے تو وہ اس کی آواز کو بھی اسی خیالی دنیا کا ایک حصہ سمجھے گا، ٹھیک اسی طرح اس دنیا میں یہ آگاہی کہ دنیا اصل حقیقت کے مقابلہ میں ایک خواب محض ہے، ہمیں اسی واقعاتی دنیا کا ایک حصہ لگتی ہے شاہ صاحب کے مطابق ـــ "حضرت صوفیائے کرام تو یہ فرماتے ہیں کہ عالم کی حیثیت حضرت حق سبحانہ کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے خیالات کی حیثیت خیال کرنے والے کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔" (ص ۵۷)

خالق و مخلوق کے درمیان باہمی تعلق نیز تکوینِ عالم کو سمجھانے کے لئے وہ ایک مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

فرض کیجئے کہ کوئی ایک حکیم و دانا شخص ہے جو فلاحت و باغبانی و کاشتکاری فنون میں ماہرانہ قابلیت رکھتا ہے، اس کے ساتھ وہ فن تعمیر اور فوجی تربیت نیز آلات حرب کے استعمال کے قواعد و اصول سے بھی واقف ہے، وہ مدنی سیاسیات اور منزلی تدبیر کے اسرار و رموز کا بھی عالم ہے، اور بجائے خود طبیعت میں اسکے لطافت، نزاکت اور نفاست پائی جاتی ہے، ذہن بھی اسکا لطیف و پاکیزہ ہے۔ وہ ستاروں اور افلاک کی حرکات اور انکے مقامات و منازل کو خوب جانتا ہے اور پہچانتا ہے، اب فرض کیجئے کہ ان گوناگوں صلاحیتوں کا حامل حکیم شخص اپنے خیال میں ایک حکومت قائم کرتا ہے، ایسی حکومت جو کہ طویل و عریض ممالک اور علاقوں پر مشتمل ہے، اپنی اس حکومت کے دائرے میں وہ

ان ساری چیزوں کو مہیا کرتا ہے جنھیں اپنے فطری سلیقہ اور کمالات و معلومات کی بنیاد پر فراہم کرسکتا ہے۔ اپنے خیال میں اس طرح کی حکومت قائم کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ یہ آتا ہے جب وہ حکیم ہر چیز سے منقطع ہو کر انتہائی یکسوئی سے اس خیالی سلطنت کے تصور میں کچھ اس طرح سے مستغرق ہو جاتا ہے کہ جو چیزیں اب تک اس کے تحت الشعور میں تھیں، اب وہاں سے نکل کر تفصیلی شعور میں آجاتی ہیں۔ یعنی اس مرحلہ میں اشیاء اس حکیم کی ذات سے غیر اور بطور معروض سامنے آجاتی ہیں۔ خدا کی مثال بھی ایک ایسے ہی حکیم کی طرح ہے اور کائنات اس کا ایک خیال محض ہے جو اس کے لیے اس وقت بطور معروض کے ہو جاتا ہے، جب خدا اسے معقول سے متخیل کرتا ہے۔ اب جس طرح حکیم اپنے خارجی وجود کے لحاظ سے اپنی تمام مخلوقات اور ان کی صفات سے پاک ہے، اسی طرح حق تعالیٰ کی ذات بھی اپنے مقطورات کے آثار و خواص سے منزہ اور مقدس ہے۔" (ص ۷۵)

اوپر کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ صوفیا کے یہاں کائنات کی حیثیت خدا کی ذات کے مقابلہ میں ایک خواب سے زیادہ کی نہیں ہے، کائنات کا یہ تصور شنکر کے ویدانتی تصور کائنات سے بہت زیادہ قریب ہے، شنکر بھی عالم کو مایا کہکر اس کی بے حقیقتی پر زور دیتا ہے، اور اس کی نفی کرتا ہے، اس کے مطابق حقیقت الحقائق ایک مطلق ذات ہے، جو تمام صفات سے مبرا نیز خالص وحدت ہے۔ یہ ذات جس کو وہ برہم کا نام دیتا ہے، کثرتوں اور تنوعات سے قطعی عاری ہے، ایسا نہیں ہے کہ کثرتیں ذات مطلق کی مخلوق ہیں بلکہ یہ کہ وہ قطعاً غیر موجود ہیں، یہ ہمارا جہل یا عدم علم ہے جو ان کے ادعا کے لیے ہمیں مجبور کرتا ہے، ایک ایسا شخص جو عرفان کی دولت سے

مالا مال ہے، وہ کبھی طبیعی دنیا کی کثرتوں کا اقرار نہیں کرسکتا طبیعی دنیا کی بذاتہٖ حقیقت میں یقین رکھنے والے کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اندھیرے میں چلا جا رہا ہو اور کسی پڑی ہوئی رسی کو سانپ سمجھ بیٹھے۔ دنیا کی ظاہری حقیقت رسی کے بظاہر سانپ معلوم ہونے سے زیادہ نہیں ہے، جس طرح سے روشنی ہوتے ہی شخص پر حقیقت عیاں ہو جاتی ہے اسی طرح سے عرفانِ ذات ہونے پر عارف کے اوپر کائنات کی بے حقیقتی عیاں ہو جاتی ہے۔

عموماً یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ کائنات کو محض خوابِ خیال قرار دینا ایک ایسی بات ہے جسے وجدان کبھی قبول نہیں کرسکتا، اشیائے عالم کا ٹھوس، مرئی اور منفرد ہونا ہمیں ہر وقت ان کو حقیقی سمجھنے کے لیے مجبور کرتا ہے، مگر کیا واقعی یہ اشیاء ویسی ہی ٹھوس اور حقیقی ہیں، جیسا کہ ہم انھیں فہم عام کے ذریعہ سمجھتے ہیں، کیا اشیائے عالم کی مادی و حقیقی نوعیت کا انکار صوفیا نے ہی کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی مابعد الطبیعی تحلیل خواہ فلسفیانہ اعتبار سے کریں خواہ سائنسی اعتبار سے، ہم بہر حال اسی نتیجہ تک پہونچیں گے کہ جن چیزوں کو ہم موجود اور حقیقی سمجھتے ہیں، وہ فی الاصل غیر موجود و غیر حقیقی ہیں۔

یورپ کی فلسفیانہ تاریخ میں زمانہ قدیم سے لیکر آج تک فلاسفہ کی ایک عظیم اکثریت عالم ظاہر کی حقیقت کی کسی نہ کسی شکل میں منکر رہی ہے، بالکل ابتدائی یونانی حکما مثلاً تھیلس اور انکسیمنز وغیرہ اگرچہ حقیقت کو مادی مانتے تھے، تاہم کائنات اپنی ظاہری شکل میں حقیقت ان کے نزدیک بھی نہیں تھی، پارمینائڈ نے اصل حقیقت استقلال کو مانا اور تمام ظاہری تبدیلیوں اور حرکات کا انکار کیا، اس کے برعکس ہراقلیطس نے استقلال کو فریب نظر اور تبدیلی کو اصل حقیقت سمجھا، لیکن جو بات ان دونوں حکما میں مشترک رہی وہ کائنات کی شہودی اور ظاہری حیثیت کا انکار تھا، افلاطون نے عالم طبیعی کو ایک غیر مرئی اور

ماورائی عالم کا عکس بتا کر کائنات کی حقیقی توجیہ کو سب سے بڑی ضرب پہنچائی، اور ایک اعتبار سے بعد کے زمانہ کی بہت سی صوفیانہ تحریکوں کا سرچشمۂ فیضان بن گیا۔ عہد جدید کے فلسفہ میں اسپنوزا، لائبنز، ہیگل وغیرہ تمام اہم فلاسفہ کسی نہ کسی صورت میں حقیقی فلسفہ کے مخالف رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدائی دو تین دہائیوں کو چھوڑ کر جس میں کہ سائنس کے زیر اثر مختلف فلسفیانہ مکاتب فکر نے حقیقیت Realism بحیثیت تصور حقیقت اختیار کیا، فلسفہ میں عمومی روایت مخالفت حقیقیت رہی ہے لیکن یہ فلسفہ بھی اب اپنا اثر کھو چکا ہے، موجودہ زمانہ میں جو تحریکیں فلسفہ میں برسر عروج ہیں مثلاً لسانی تحلیل اور وجودیت دونوں ہی مابعد الطبیعیات کی مخالف ہیں، اس لیے ان کے یہاں فلسفۂ حقیقیت کا تصور ہی ختم ہو چکا ہے،

امریکہ اور انگلینڈ جہاں کہ حقیقیت کا زیادہ چرچا رہا وہاں اس فلسفہ کے زوال کی سب سے بڑی وجہ کچھ اور نہیں بلکہ خود سائنس ہی تھی، ایک اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایتی ایٹمی طبیعیات بھی کائنات کے حقیقی تصور سے متناقض تھی، کیونکہ یہ عالم کو ایسے ذرات کی اصطلاح میں توجیہہ کرتی تھی جو کہ اپنی نوعیت اور تعریف کے اعتبار سے غیر مرئی اور ناقابل تحلیل تھے، اس سائنس کی روشنی میں عالم کو اس کی ظاہری حیثیت میں ہم بحیثیت حقیقت نہیں لے سکتے تھے، بایں ہمہ حقیقیت کو سب سے بڑا دھکا اس وقت پہنچا جب کہ آئن اسٹائن نے نظریۂ اضافیت کی ایجاد کر کے طبیعیات میں انقلاب پیدا کر دیا، کائنات اپنی انتہائی تشکیل کے اعتبار سے مادہ نہ رہی بلکہ مادہ کا تصور توانائی کے تصور کے ذریعہ بدل دیا گیا اس نئے طبیعیاتی نظریہ کی روشنی میں کائنات کو اس کی ظاہری حیثیت میں حقیقی ماننا محال ہے، اشیاء مادی نہ تو ٹھوس ہیں اور نہ ہی جسیم، کائنات میں علت و معلول

کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، معروضی اور مطلق زمان و مکان محض ہماری ذہنی اختراعات ہیں، مختصر یہ کہ عالم شہود محض ایک فریب نظر اور حواس کا دھوکہ ہے،

کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سائنس کی یہ نئی ایجاد ہمارے مذہبی یا متصوفانہ تصور کائنات کی پوری طرح مصدق ہے، قابل ذکر بات صرف اتنی ہے کہ اگر صوفیا نے اپنی فکر کے ذریعہ عالم شہود کی بے حقیقتی پر زور دیا تو وہ ایسا کرنے میں منفرد تھے، سچی بات یہ ہے کہ کائنات کو اس کی آخری مابعد الطبیعی نوعیت کے اعتبار سے غیر حقیقی ماننا اور اس سے اعراض و قطع تعلق کرنا دو مختلف چیزیں ہیں، مابعد الطبیعی غیر حقیقیت، فلسفہ، سائنس اور تصوف کی تمام تحریکوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، جو بات ان میں تمیز پیدا کرتی ہے وہ ماننے والے کا عملی رویہ ہے۔ کیا وہ کائنات کو مطلق غیر حقیقی سمجھ کر اپنے اندر انفعالیت اور رہبانیت کو پرورش دیتا ہے جیسا کہ ہندو اور نوفلاطونی تصوف میں ہم دیکھتے ہیں، یا اس کے برعکس کائنات کی مطلق ناقابل فہم نوعیت انسان کو زیادہ سے زیادہ لذات اور مسرتیں حاصل کرنے کی طرف راغب کرتی ہے اور انسان تمام اخلاقی حدود و قیود کا انکار کر بیٹھتا ہے، جیسا کہ مغرب کی معاصر تہذیب میں ہم پاتے ہیں، یا پھر یہ کہ انسان ایک معتدل نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے، یعنی یہ کہ وہ کائنات کو اصل حقیقت کے مقابلہ میں بے حقیقت سمجھتے ہوئے بھی عملاً اس سے تعلق قائم کرے اور اس کی تہذیب و اصلاح کے لیے جد و جہد کرے، جیسا کہ بیشتر مسلمان صوفیا کا رویہ رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تصوف کا نقطۂ امتیاز ہی یہ رہا ہے کہ وہ رہبانیت (Asceticism) اور لذت پرستی (Hedonism) کی انتہا پسندی کے درمیان اعتدال پیدا کرتا ہے، ایک طرف تو وہ حقیقت الحقائق خدا کی ذات کو بنا کر عالم کی

رضانی ناحقیقتی پر زور دیتا ہے، تو دوسری طرف رہبانیت کی سختی سے تردید کرتا ہے، نیز انسان میں ایجابی رجحانات کی پرورش کرتا ہے، عام صوفیا کی زندگی ان کے نظریہ کی بہترین ترجمان ہے مثال کے طور پر اگر ہم شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی زندگی کو ہی لیں تو دیکھیں گے کہ ان کی زندگی میں عملیت اور حرکیت بدرجۂ اتم تھی۔ ان کی زندگی کا بیشتر شعوری حصہ اسی فکر میں گذرا کہ عملی جدوجہد کے ذریعہ کس طرح دکھی انسانیت کی نجات کا سامان کیا جائے، بحیثیت ایک مومن کے ان کا عقیدہ تھا کہ محض اسلامی شریعت کی ترویج و نفاذ کے ذریعہ ہی ایک ایسا سماجی ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جس میں کہ افراد تمام مادی راحتیں حاصل کر سکیں اور اپنے روحانی ارتقا کی طرف متوجہ ہو سکیں، چنانچہ ان کی زندگی کا خاتمہ میدان جنگ میں ہوا نہ کہ خانقاہ میں جو کہ غالباً عملیت کا ایک کامل ترین اظہار ہے۔

اس کے علاوہ اس مسئلہ کا ایک نظری پہلو بھی ہے جسے ذہن میں رکھنا چاہئے، فرض کیجئے ایک شخص کچھ خیالی مخلوقات تصور کرتا ہے، نیز یہ بھی فرض کیجئے کہ وہ خیالی مخلوقات فہم و فراست کی بھی حامل ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں، اب ظاہر ہے کہ بحیثیت باشعور مخلوقات کے ان کی سمجھ میں کبھی نہیں آئیگا کہ وہ کسی خیال کرنے والے کا خیالِ محض ہیں اور ان کی اپنی کوئی خود مختار حیثیت نہیں ہے، یہی معاملہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے کہ اگرچہ وہ ایک ذہن مطلق کا خیال محض ہیں، لیکن چونکہ باشعور ہیں اس لیے خود کو کاملاً حقیقی و موجود سمجھتے ہیں، مخلوقات کی ناحقیقتی محض خالق کے سیاق و تعلق میں ہوتی ہے، ورنہ غیر موجودات کے مقابلہ میں وہ عین حقیقی ہوتی ہیں، صوفیا کا عالم کی بے حقیقتی پر اصرار بھی دراصل اسی معنی میں تھا، انھوں نے مطلق نفی کبھی نہیں کی، شنکر بھی عالم کی جو نفی کرتا ہے وہ خدا کے مقابلہ پر رکھ کر نہ کہ بالذات

وہ کہتا ہو کہ عالم "ناممکنات مثلاً "بانجھ عورت کی اولاد" یا "گدھے کی سینگ" وغیرہ کے مقابلہ میں عین حقیقی ہے۔

خدا اور کائنات کے درمیان تعلق کی مندرجہ بالا تشریح سے وہ بحث بھی کسی حد تک سلجھ جاتی ہے جو کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کے ماننے والوں میں چلی آرہی ہے۔ اول الذکر نظریہ جس کے بانی اسلامی تاریخ میں شیخ اکبر محی الدین ابن العربی ہیں کے مطابق وجود صرف خدا کا ہے اور تمام غیر اشیا غیر موجود یا عدم ہیں، اس کے برخلاف شیخ احمد سرہندیؒ کا نظریہ وحدت الشہود خدا کی انتزاعیت اور کائنات سے تفریق پہ اصرار کرتا ہے، اس کے مطابق اگرکثرتوں اور تنوعات کی اصل نیستی ہی تاہم وہ خدا کی ذات وصفات سے منور ہیں، اور اس لیے ان میں ہستی کا ایک عنصر ہے۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے یہ دونوں نظریے بالعموم ایک دوسرے کے متضاد اور مخالف سمجھے جاتے ہیں، اور ایک زمانے تک صوفیا میں ان میں سے کسی ایک کو اختیار اور دوسرے کا ابطال کرنے کا رجحان رہا ہے، لیکن شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب التطبیق بین الوجود والشہود اور پھر شاہ اسمٰعیل شہید نے عبقات میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں ہی دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں اور ان میں نزاع واختلاف محض لفظی ہے، مثلاً شاہ اسمٰعیل شہید لکھتے ہیں:۔

> اس گروہ (قائلین وحدت الوجود) اور ان لوگوں میں جو شہودیہ ظلیہ کے نام سے موسوم ہیں، ان دونوں میں تحقیقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کسی قسم کا واقعی اختلاف نظر نہیں آتا، البتہ صوفیا کے ان دونوں طبقات سے جن لوگوں کا تعلق ہے چونکہ ان کے مقامات مختلف ہیں اور "لاہوت" (خدا) تک پہنچنے کی راہوں کا جو اختلاف ہے

اس کی وجہ سے دونوں تعبیروں میں اختلاف ضرور پیدا ہوگیا ہے لیکن یہ تعبیروں کا اختلاف ہے نہ کہ واقعہ اور حقیقت کا۔ مطلب یہ ہے کہ ان میں کچھ حضرات تو ایسے ہیں جن کی نظر لاہوت میں کچھ اس طرح ڈوب جاتی ہے کہ عالم (خدا کے سوا جو کچھ ہے) سب ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، وہ اس ذات کے جلال وجمال کے مشاہدہ میں مستغرق ہو جاتے ہیں، جس کے سوا انھیں دوسری کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی اور ان کا یہ حال ایسا ہی ہے کہ اس کے بعد اگر وہ یہ کہتے ہوئے چیخ اٹھیں کہ ہستی کے اس دائرے میں خدا کے سوا کچھ بھی نہیں تو اپنے حال کے مطابق ان کو یہ کہنے کا حق ہے، انکا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ لاہوت ہی سب کچھ ہے اور وہی ہر چیز کا عین ہے یا وہی ہر چیز ہے بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی غیر کا یہاں نام و نشان ہی نہیں پایا جاتا....

.....لیکن ان ہی کے مقابلہ میں دوسرا طبقہ ان لوگوں کا بھی ہے جن کے سینوں کو خدا کھول دیتا ہے، نظر میں ان کے وسعت پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائناتی کثرتوں کا احساس لاہوت (یعنی حق تعالیٰ) کی ذات میں استغراق وانہماک کا جو حال ان کو میسر آتا ہے اس حال میں مزاحم نہیں ہوتا بلکہ ان ساری کثرتوں کو وہ حق تعالیٰ ہی کے کمال کی تفصیل قرار دیتے ہیں اور ان کثرتوں کے آئینہ میں ہی اپنے محبوب کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں" ص ۸۶ - ۸۵)

کائناتی کثرتوں کے ہوتے ہوئے بھی اگر شیخ اکبر نے وجود کو واحد قرار دیا تو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے مطابق اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ہم زید کو تنہا ذات قرار دیتے ہیں حالانکہ اسکے ذہن و خیال میں کثیر و متعدد اشیاء و تصورات ہیں، یعنی جس طرح تصورات کی کثرت زید کی وجودی وحدت کو متاثر نہیں کرتی اسی طرح اشیائے کائنات کا تعدد ذات باری

کی وجودی وحدت کی نفی نہیں کرتا، شیخ اکبر نے واقعہ کے اس پہلو پر زور دیا کہ عالم میں جو کچھ ہے سب کا احاطہ لاہوت کیے ہوئے ہے اور کائنات کی کثرتیں ذات حق سے لاینفک طور پر تو میں کے رشتہ میں بندھی ہوئی ہیں، لیکن اسکے برخلاف شیخ مجدد سرہندیؒ نے جو خدا کی ارتفاعیت اور تنزیہیہ پر زور دیا تو اسکا سبب یہ تھا کہ ان کے دل و دماغ لاہوت کی عظمتِ جلال سے معمور تھے، لاہوت میں اور کائنات کی کثرتوں میں موطن وظرف وجود کا جو فرق ہے اسکا احساس ان پر کچھ اس طرح مسلط اور مستولی تھا، خالق و مخلوق میں مغائرت کا تعلق انکو اتنا گہرا نظر آیا جس کی انکے نزدیک کوئی حد تھی نہ انتہا، انھوں نے پایا کہ لاہوت کے سامنے کائنات کی ان کثرتوں کی نہ کوئی حیثیت ہے نہ قیمت اور اسکے مقابلہ میں انھوں نے لاہوت کے وجود کو سب سے بے نیاز اور مستغنی پایا.........

اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالق و مخلوق کے وجود میں اتحاد کا جو رشتہ و تعلق پایا جاتا ہے، اس پہلو کی تفصیل و تشریح میں انھوں نے اجمال سے کام لیا اور مغائرت کی نسبت کی تعبیر و تشریح کو اپنا نصب العین بنایا" (ص ۸۷)

شیخ اکبر اور مجدد سرہندی کے درمیان تضاد و مخالفت کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جہاں شیخ اکبر نے بعض تحریروں (مثلاً فتوحات مکیہ کے ابتدائی ابواب میں) بہت واضح الفاظ میں ذات باری کو اشیائے عالم کی کثرتوں اور تنوعات سے پاک و منزہ قرار دیا ہے، نیز اول الذکر کے موخر الذکر سے انصاف کی سختی سے مخالفت کی ہے وہیں مجدد سرہندی کی بھی کچھ تحریریں ایسی ہیں جن سے شیخ اکبر کے مسلک کی تائید ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے تصور توحید میں بگاڑ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم مظاہر کائنات کو اس کی ظاہری حیثیت میں نیز اس کے تغیر و تبدل کو خدا میں تغیر و تبدل تصور کرنے لگتے ہیں۔

باب التقریظ والانتقاد

سید احمد شہیدؒ

ہز لائف اینڈ مشن

سید احمد شہیدؒ۔ ہز لائف اینڈ مشن (انگریزی) مصنفہ محی الدین احمد کتابت وطباعت عمدہ، ضخامت ۴۲۲ صفحے ناشر اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکشنز، لکھنؤ، قیمت۔ چالیس روپیے۔

جناب محی الدین احمد کے نام سے وہ علمی حلقہ اب اچھی طرح واقف ہو چکا ہے، جس کو اسلامیات اور لکھنؤ کے ادارۂ تحقیقات ونشریات اسلام کی مطبوعات سے دلچسپی ہے، وہ اس ادارہ کے بہت ہی لائق، سرگرم اور ہونہار رکن ہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مشہور تصنیف تاریخ دعوت وعزیمت کی دو جلدوں، مذہب اور تمدن، مسلمان اور معرکۂ مذہب و مادیت کے انگریزی ترجمے کر کے انگریزی زبان لکھنے کی مہارت کا ثبوت دے چکے ہیں، وہ لکھنؤ سکریٹریٹ کے ایک سرکاری عہدیدار ہیں، اگر کسی یونیورسٹی میں ہوتے تو ان کی شہرت اب تک بہت پھیل چکی ہوتی، ان کو سرکاری دفتر کے کام کی الجھنوں سے جو بھی وقت ملتا ہے لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے ہیں، جو قلمی جہاد سے کم نہیں، وہ اسلام اور اسلامی تحریکوں سے بڑا شغف رکھتے ہیں، اسی لیے ان کا قلم ان ہی موضوعات پر بڑا رواں دواں ہو جاتا ہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی سے ان کو محبت ہی نہیں بلکہ بڑی فریفتگی ہے، ان ہی کی صحبت میں نہ صرف علمی تربیت بلکہ ذوق کی پاکیزگی، اور تحریر کی سلاست روی حاصل کی، ان ہی کی وجہ سے

ان کو سید احمد شہید بریلویؒ سے عقیدت پیدا ہوئی، مولانا موصوف کی تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ بریلوی بہت مقبول ہے، جس میں اس بطل حریت اسلام کے کارناموں سے متعلق پہلی دفعہ مفید تفصیلات پیش کی گئی تھیں، اس کی اشاعت کے بعد ان پر اور کتابیں بھی نکلیں، محی الدین صاحب چاہتے تو مولانا کی اس تصنیف کا بھی ترجمہ انگریزی میں بہت آسانی سے کر سکتے تھے، مگر ان کو اسلام کے اس سرفروش اور کفن بردوش غازی سے کچھ ایسی غیر معمولی عقیدت ہوئی کہ انگریزی میں ایک علیحدہ مستقل کتاب لکھ کر اپنی علمی اور تحقیقی تشنگی بجھائی، اس کتاب میں وہ سب کچھ ملے گا جو اب تک سید احمد شہیدؒ پر لکھا جا چکا ہے، اور وہ بھی ملے گا جو اب تک ان پر نہیں لکھا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ انگریزی میں ان پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی، انگریزی داں حلقہ اس کو پڑھ کر نہ صرف اس شیر دل مجاہد اسلام کے دلیرانہ کارناموں، مبلغانہ کاوشوں اور مخلصانہ مذہبی سرگرمیوں سے پورے طور پر واقف ہوگا، بلکہ اگر قارئین میں سے کوئی اسلامی حمیت رکھتا ہوگا تو وہ اس کے مصنف کے لیے دلی دعائیں بھی دے گا،

کتاب کے شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک بہت ہی پر مغز مقدمہ ہے، اس میں بعض ان انگریز مصنفوں کی ان مفسدانہ غلط بیانیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو وہ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے متعلق کرتے رہے ہیں، اس کے بعد کتاب میں حسب ذیل ابواب ہیں (۱) اٹھارہویں صدی میں مسلم انڈیا، (۲) سید احمد شہیدؒ انکے آباد اجداد، اور ان کی ابتدائی زندگی، (۳) راہ طریقت کا سالک (۴) نواب امیر خان کے یہاں قیام (۵) خادم خدا (۶) حج (۷) جہاد کا تخیل (۸) سکھوں کا عروج (۹) رائے بریلی سے نوشہرہ تک (۱۰) امیر المومنین کا انتخاب، (۱۱) عظیم فریب

(۱۲) بھاگا اور رکھر، (۱۳) شریعت کا نفاذ، (۱۴) زیدہ کی جنگ (۱۵) ہزارہ کی جنگی سرگرمیاں (۱۶) پشاور پر قبضہ (۱۷) خوفناک سازش (۱۸) بالاکوٹ (۱۹) غریب الوطن مجاہدین (۲۰) علی برادران (۲۱) مولانا عبداللہ (۲۲) ابتلا، آزمائش اور مصائب (۲۳) کردار اور کارنامے، ان ابواب کے علاوہ ایک ضمیمہ میں سید احمد شہید بریلویؒ کے ایک خط کا انگریزی ترجمہ ہے،

اس کتاب کا آٹھواں باب اس لحاظ سے پڑھنے کے لائق ہے کہ اب تک ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف یہ زبردست قلمی مہم جاری ہے کہ انھوں نے اپنے مذہبی تعصب میں مندروں کی بے حرمتی کرکے ان کو منہدم کیا، جس کو پڑھ کر ہندوؤں میں بڑا اشتعال پیدا ہوتا ہے، مگر لائق مصنف نے کنھیا لال، میلکم، اور مائیکل اسمتھ کی تاریخوں سے یہ دکھایا ہے کہ سکھوں نے اپنے دور حکومت میں کس طرح پنجاب کی مسجدوں کی بے حرمتی کی، وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی رواداری کے معترف ہیں مگر انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ اس کے عہد حکومت میں ہزاروں مسجدیں منہدم کرکے ان کی جگہوں پر سکونتی مکانات بنا لیے گئے، روشن الدولہ ظفرخان کی بنائی ہوئی سنہری مسجد پر قبضہ کرکے وہاں ادی گرنتھ رکھی جانے لگی، وہاں سے ملا نکال دیے گئے، اس کے فرش کو گوبر سے لیپا گیا، اس کی ملحق دوکانوں پر گردوارے کا قبضہ ہو گیا، موذن کو اذان دینے سے روک دیا گیا، (ص ۱۴۹) لاہور کی بادشاہی مسجد فن تعمیر کے لحاظ سے مشہور ہے، اس کی بھی بے حرمتی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی، اس کے اندر لاکھوں روپیے کی قندیلیں لٹکی رہیں، قیمتی قالین بچھے رہتے، لیکن سکھوں نے اس پر قبضہ کرکے اس کو لشکرگاہ توپخانہ اور بارودخانہ میں منتقل کر دیا، فرش پر جو قیمتی پتھر بچھے ہوئے

وہ بھی اکھاڑے گئے، مستی دروازہ پر جو مسجد تھی، وہ بارود تیار کرنے کی ایک فیکٹری بنالی گئی، سکھوں کو مسلمانوں کی طرح ٹوپی اور لباس پہننے کو بھی روکا گیا، (ص ۱۴۹) سکھوں ہی میں سے بندا نے ۱۷۱۰ء میں سرہند پر قبضہ کیا، تو اس کے حاکم کو قتل کر دیا، چار دن یہ شہر لوٹا جاتا رہا، اس لوٹ میں ہر قسم کی سفاکی سے مسجدوں کی بے حرمتی اور عورتوں کی آبروریزی کی گئی، عام مسلمان تہ تیغ کئے گئے، (ص ۱۳۶) خود مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی موجودگی میں پشاور کی مسجدوں کی بے حرمتی کرائی (ص ۱۸۵) اس طرح کے اور بھی واقعات تاریخ میں ملتے ہیں، ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں غیر مسلموں کی طرف سے بھی مسجدیں شہید ہوتی رہیں، ۱۹۴۷ء کے خونریز ہنگاموں میں دہلی سے مشرقی پنجاب کی آخری سرحد تک معلوم نہیں کتنی مسجدیں شہید کی گئیں، کتنی مویشی خانہ بنادی گئیں، اور کتنی سکونتی مکانات میں منتقل کر دی گئیں، حکومت کی کوششوں کے باوجود ان کی واگذاشت ابھی تک نہیں ہو سکی ہے، اگر ان کی تفصیلات اسی انداز میں لکھی جائیں جس میں مسلمان حکمرانوں کے عہد کے مندروں کے انہدام کی تفصیلات لکھی جارہی ہیں تو نہ صرف محمود غزنوی اور اورنگزیب کی مندر شکنی کے جھوٹے سچے افسانے بھلا دئے جائیں بلکہ غیر مسلم مورخوں کی فرقہ وارانہ قلمی مہم میں اس لحاظ سے کمی آجائے کہ خود غیر مسلموں کا دامن اس سلسلہ میں پاک نہیں بلکہ بہت زیادہ آلودہ ہے،

سکھوں نے بالاکوٹ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی لاش کی جو بے حرمتی کی وہ بھی انتہائی تکلیف دہ کہانی ہے شیر سنگھ نے تو اسکو دفن کرادیا، لیکن دہان سنگھ اور لکھمیر نے اور دوسرے سکھوں سے مل کر لاش کو قبر سے باہر نکالا، اس کو ٹکڑے ٹکڑے کیا، پھر دریا میں پھینک دیا، (ص ۳۸۶) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے

عہد میں ایسی سفاکی کی مثال مشکل سے ملے گی، سکھوں نے یہ سب کچھ اپنی تھوڑی سی مدت کی حکومت میں کر ڈالا، مسلمان حکمرانوں کو چھ سو سال سے زیادہ حکمرانی کا موقع ملا اس طویل مدت میں ان کے یہاں ایسی سفاکانہ مثالیں اگر مل بھی جائیں تو ان کی حکومت کی مدت کی طوالت سے زیادہ قابل اعتنا نہیں، زیر نظر کتاب کے مرتب کوئی پرانے اور جانے بوجھے مورخ نہیں، لیکن انھوں نے تاریخی واقعات کی ترتیب تنظیم، پہچان اور نتائج کے استنباط میں مورخانہ دیدہ وری دکھائی ہے، ۲۳ ویں باب میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے کردار اور کارناموں پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ بہت ہی مدلل ہے، ان کی زندگی اس حیثیت سے ایک مثالی نمونہ ہے، کہ ہر قسم کی بے سروسامانیوں مالی پریشانیوں اور سیاسی مشکلوں کے باوجود محض دینی غیرت ملی حمیت اور ایمانی بصیرت کی بدولت مسلمانوں کے جمود کو ختم کر کے ان کی زندگی کو متحرک اور فعال بنا دیا، انھوں نے رائے بریلی سے پشاور تک اپنے اردگرد کے لوگوں میں جو دلیری، جاں نثاری اور سرفروشی کا جو جذبہ پیدا کیا، وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے شمع راہ ہے۔ وہ کوئی باضابطہ تربیت یافتہ فوجی سپہ سالار نہ تھے، اور نہ ان کے مقلدوں کو کوئی حربی تجربہ تھا، لیکن انھوں نے مختلف لڑائیاں لڑ کر وہ سارے اوصاف دکھائے جو آزمودہ کار، اور تربیت یافتہ فوجی دکھا سکتے تھے، ان کی صحبت میں تربیت پا کر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ مولوی ولایت علی، مولوی عنایت علی، اور مولوی یحیٰی علی وغیرہ نے جو سیرت اور کردار کے نمونے پیش کیے ہیں وہ مسلمانوں کی زندگی کے لیے گویا ہر شب چراغ بن کر رہیں گے، حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد ان کے مقلدوں نے ہندوستان میں انگریزوں کی سامراجی قوت سے ٹکر لینے میں جو سرفروشی دکھائی

وہ بھی زندئیں حروف سے لکھے جانے کے لایق ہے، زیر نظر کتاب کا بائیسواں باب اسی سرفروشانہ جہاد کی بڑی جیتی جاگتی تصویر ہے،

حضرت سید احمد شہیدؒ کو بالاکوٹ میں شکست ضرور ہوئی، مگر مسلمانوں کی یہ تاریخ ہی ہے کہ ہر کربلا کے بعد اسلام زندہ ہوتا ہے، بالاکوٹ بھی ہندوستانی مسلمانوں کا ایک کربلا تھا لیکن حضرت سید احمد شہید بریلویؒ نے اپنی مجاہدانہ تحریک سے ہندوستانی مسلمانوں کی جامد زندگی میں جو روح پھونکی، اس سے قال اللہ اور قال الرسول کی صدا ایسی گونجتی رہی کہ انگریزوں نے اپنی جابرانہ اور قاہرانہ قوت سے مسلمانوں کے تاج وتخت پر تو قبضہ کر لیا، مگر وہ اپنے دور حکومت میں مسلمانوں کے دل و دماغ کی تسخیر نہ کر سکے، یہ روح کیسے پیدا ہوئی اس کی پر کیف داستان زیر نظر کتاب میں ملے گی،

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں بالاکوٹ کی شکست ایک بہت بڑا المیہ ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ کی مجاہدانہ مہم میں جہاں ایسے ہزاروں مجاہدین شریک ہوئے تھے، جو صحابۂ کرام کے نقش قدم پر چل کر ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نئی زندگی عطا کرنے والے تھے، وہاں اس میں یار محمد خاں، سلطان محمد خاں اور فتح خاں وغیرہ جیسے آستین کے سانپ بھی شریک ہوے، اگر وہ غداری، ایمان فروشی اور خود پرستی کے بجاے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے اور جان نثاروں کی طرح پاک باطنی، روشن ضمیری اور وفاداری کا حق ادا کرتے تو ہندستان کے مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی، اس کتاب میں ان غداروں کی منافقانہ کارروائیوں کی بھی پوری سرگذشت ملے گی،

اردو میں حضرت سید احمد شہید بریلوی پر مولینا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا غلام رسول مہر کی دو اچھی کتابیں پہلے بھی نکل چکی ہیں، جن میں ان کی زندگی اور کارنامے کی پوری تفصیل ہے پھر بھی محی الدین احمد صاحب کی کتاب پڑھنے میں ایسی ہی، کہ بجا ئے تازگی محسوس ہو گی، اس میں ان کے

انداز بیان اور تحقیق کا دقت گو بڑا دخل ہے، امید کہ یہ کتاب علمی حلقہ میں شوق سے پڑھی جائیگی،

لائق مصنف کی کتاب میں جا بجا انگریزوں کی تصانیف کے بھی حوالے ہیں میری ذاتی رائے ہے کہ یورپ اور امریکی مصنفوں کی کتابوں کو بالکل ہی نظر انداز کرنے کی مہم چلائی جائے، خواہ ان کی تحریر اسلام اور مسلمانوں کی حمایت ہی میں کیوں نہ ہو ان کی کسی اچھی رائے کو بھی قابل اعتنا قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی مخالفانہ اور معاندانہ رائے کی اہمیت غیر شعوری طور پر بڑھ جاتی ہے زیر نظر کتاب کے ص۹ پر لوتھروپ اسٹوڈرد کی کتاب دی نیو ورلڈ آف اسلام سے جو اقتباس دیا گیا ہے وہ اس اچھی کتاب میں نہ ہوتا تو اچھا تھا، خود لائق مؤلف اٹھارہویں صدی کے اسلام کی زبون حالی کی تفصیل اپنے ہی قلم سے پیش کر سکتے تھے، ولفرڈ کینٹول اسمتھ کی تحریروں کو بھی اہمیت نہیں دینی چاہئے تھی، وہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے کچھ تعریفی کلمات لکھ کر ان کی برائی بیان کرنے میں اپنے قلم اور تحقیق کی مہارت دکھاتا ہے ہیلکم اِل، ولسن، گرنیڈ ڈف، کنگھم، ولیم ہنٹر ہوں یا مشہور مستشرقین سب کو نظر انداز کرکے ان کو احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ اب مسلمانوں کی نظروں میں اپنی بددیانتی اور علمی فتنہ پردازی سے اتنے بدنام ہو چکے ہیں، کہ ان کی کتابیں اور تحریریں مسلمانوں کے حلقہ میں قابل وقعت نہیں سمجھی جانے لگی ہیں،

کتاب میں طباعت کی کچھ ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں، جو اس عمدہ کتاب کیلئے بالکل نامناسب ہیں، مثلاً بعض الفاظ اس طرح چھپ گئے ہیں، کہ غزنی کو گزنی (ص ۴۲) فقیر کو فکیر (ص۱۴۸) قافلہ کو کافلہ (ص۱۳۱) مولوی غفار کو مولوی گفار پڑھا جاتا ہے، امید کہ اس کے دوسرے ۔۔۔۔ اڈیشن میں طباعت کی یہ فروگذاشتیں درست کر دی جائیں گی،

(ض ع)

مطبوعات جدیدہ

محاسن موضح القرآن ۔ مرتبہ مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی تقطیع متوسط کاغذ معمولی کتابت قدرے بہتر صفحات ۸۰ ۔ قیمت تحریر نہیں، پتہ ادارہ رحمت عالم شیخ چاند اسٹریٹ لال کنواں، دہلی،

حضرت شاہ عبد القادر دہلویؒ کے ترجمۂ قرآن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، لیکن یہ ڈیڑھ سو سال پہلے کا ہے، اس طویل عرصہ میں کتابت و طباعت کی غلطیوں کے علاوہ ناشروں نے بھی خاصا تصرف کر دیا ہے، نیز اب اردو کا اسلوب بہت کچھ بدل گیا ہے، اور بعض الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو چکی ہیں، اسلئے پہلے بھی بعض اہل علم شاہ صاحب کے ترجمہ و فوائد کے مشکل لفظوں کی تشریح کر چکے ہیں، اب مولانا اخلاق حسین قاسمی نے بھی ترجمہ فوائد کا ایک صحیح نسخہ مرتب کیا ہے، جس کو آئندہ شائع کریں گے، زیر نظر رسالہ میں قدیم وجدید اڈیشنوں کی طباعتی غلطیوں اور ناشروں کے تصرفات کی نشاندہی کر کے اصل ترجمہ کے محاسن دکھائے ہیں، اس سے مصنف کی محنت و عرق ریزی کا اندازہ ہوتا ہے، خدا کرے موضح القرآن جلد شائع ہو،

مسیحیت ۔ مترجمہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰ مجلد مع گردپوش، قیمت ۔ عسہ پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔

اردو میں رد عیسائیت پر مفید کتابیں پہلے سے موجود ہیں، یہ متولی یوسف جلبی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے، وہ جامعہ ازہر کے فاضل اور انڈونیشیا میں تبلیغ اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اس میں مسیحیت کی تاریخ، اصلی دعوت، اس کے فرقوں، اس کی کونسلوں، اصلاحی تحریکوں اور مغرب میں اس کی مذہبی و اخلاقی حالت اور کلیسا کے جبر و تشدد وغیرہ کا ذکر ہے، مصنف نے حضرت مسیحؑ کو خدا کی توحید و عبادت کا داعی اور شریعت موسوی کا متمم بتا کر ثابت کیا ہے کہ تثلیث کا نظریہ فلسفیانہ اور اقانیم ثلاثہ کا تصور کلیسا کی کونسلوں کی پیداوار ہے، جو حضرت مسیحؑ اور اصل انجیل کی تعلیم کے منافی ہے، ان کے نزدیک قرآن مجید ہی عیسائیت کا صحیح ماخذ ہے، کیونکہ خود مسیحی علما کی تصریحات کے مطابق اصل انجیل ناپید ہے، اور اس کے صرف ناقابل اعتبار ترجمے باقی رہ گئے ہیں، جن کے مترجمین تک کا بھی پتہ نہیں، اس سلسلہ میں اناجیل اربعہ اور انجیل برنابا کی زبان اور جمع و تدوین پر گفتگو کر کے واضح کیا ہے کہ انکا حضرت مسیحؑ تو درکنار، خود اپنے گمنام مصنفین سے بھی تعلق واضح نہیں، انھوں نے حضرت مسیحؑ کے بعد سے انیسویں صدی تک کلیسا کی منعقدہ کونسلوں کی کارروائیوں کا جائزہ لیکر اصل مسیحیت کو مسخ کرنے کی کوششوں کو بھی نمایاں کیا ہے، اور حضرت مسیحؑ اور عیسائیوں پر رومیوں کے دردانگیز مظالم بھی بیان کیے ہیں، آخر میں عیسائیت، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے بارہ میں قرآنی موقف کی وضاحت ہے، اسی ضمن میں اہل کتاب خصوصاً عیسائیوں سے مسلمانوں کے سیاسی و اجتماعی تعلقات کی نوعیت کا ذکر بھی ہے، لائق مترجم نے رواں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے، مگر زبان کی صحت کا زیادہ لحاظ نہیں کیا ہے، چنانچہ تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے

استعمال میں کافی غلطیاں ہیں جیسے طلب (ص۱۵) صورت (ص۱۶) کتاب (ص۲۶) نام شماری و حکومت (ص۶۵) سند (ص۱۱۲) سفارت (ص۱۲۵) خواہشات (ص۱۳۰-۱۴۶) جماعتون (ص۱۳۹) جماعت (ص۱۵۱) مخلوق (ص۱۴۳) شہریت (ص۱۵۹) وغیرہ کو مذکر اور کلیسا (ص۱۷) کو مونث لکھا ہے، اور اختلاف (ص۴۹) حکم (ص۱۷) تضاد (ص۱۱۱) وغیرہ مفرد لفظوں کو جمع استعمال کیا ہے، زبان و بیان کی غلطیوں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،" پادری ابراہیم سعید نے بشارت لوقا کی شرح میں ایسی ہی بے فائدہ ہمت کی ہے، (ص۲۵) تدوین کی زبان اور تاریخ (ص۵۲) ان کی خارق عادت زندگی میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو بحیثیت ابن اللہ کے ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں،" (ص۶۳) وہ فلسطین کی کوئی بول چال کی زبان رہی ہوگی، (ص۶۹) مسیح نے پاس کی اخیر حالت میں اپنے" باپ" کی طرف نہیں متوجہ ہوئے، (ص۸۴) عیسائیت سے تفصیلی بحث کی اور ان کی غلطیون کی نشاندہی کی، (ص۶) اللہ کے حکم کا نشانہ ہوں (ص۶۹ و ۹۲) کلام مجید کی آیتوں کے ترجمہ میں بھی غلطیاں ہیں، ایک ہی آیت کا ترجمہ کہیں کچھ اور کہیں کچھ اور کردیا ہے، بعض فقروں کا ترجمہ نہیں کیا ہے، اور بعض جگہ ترجمہ میں بلاضرورت اضافہ کر دئے ہیں، فریقاً کذبوا و فریقاً یقتلون کا ترجمہ کیا ہے " ان میں سے ایک فریق نے جھٹلایا، اور دوسرے نے قتل و فساد مچایا" (ص۳۰) فریق مفعول تھا، مگر ترجمہ میں اسکو فاعل بنا دیا گیا، قتل و فساد مچانا خلاف محاورہ ہے، یہود نے فساد مچانے ہی پر اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ وہ قتل انبیاء کے بھی مرتکب ہوئے تھے، یہاں اسی کا ذکر ہے، مگر یہ ترجمہ سے واضح نہیں ہو سکا، الذین اٰتینٰھم الکتاب من قبلہ ھم بہ یؤمنون کا یہ ترجمہ جنھیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ بھی ایمان لا رہے ہیں" (ص۱۴۳) درست نہیں ہے" بہ" کا ترجمہ چھوڑ دینے سے

یہ مفہوم ہوگیا کہ اہل کتاب رسول اکرمؐ پر ایمان لا رہے ہیں، جب کہ قرآن کا منشا یہ ہے کہ وہ اپنی اس کتاب پر جو انھیں دی گئی تھی، ایمان لائے ہیں، اسی صفحہ پر انا کنا من قبلہ مسلمین کا یہ ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جس پر ہم پہلے بھی ایمان لائے تھے" اسلام و ایمان میں فرق ہے اور قبلہ کی ضمیر کا مرجع حق (قرآن) ہے اس پر پہلے سے ایمان لانے کا کوئی مطلب نہیں بنتا مطلب تو یہ ہے کہ صالحین اہل کتاب اپنے متعلق یہ بتا رہے ہیں کہ ہم قرآن کے آنے سے پہلے ہی سے مسلم (فرماں بردار) تھے، سورہ مائدہ کی ایک آیت میں سماعون کے لفظ کا ترجمہ جاسوسی کرنے والے اور سحت کا سود کیا ہے، اسی طرح قفینا بعیسی الخ کا ترجمہ جانشین بنایا بھی درست نہیں ہے، فلذلک فادع کا ترجمہ" اس لیے آپ دعوت دیجئے" ص۱۳۱ صحیح نہیں بلکہ اس (دین الٰہی جس کی وصیت انبیائے سابقین کو کی گئی) کی دعوت دیجئے صحیح ہوگا، اشارات اور ضمیروں کے مرجع کی یا تو تعین نہیں کی ہے اور اگر کی ہے تو اس میں غلطی ہو گئی ہے، اور عدم تعین کی وجہ سے بعض جگہ ترجمہ غیر واضح ہے، تمہید میں سورۂ مائدہ کی وہ آیت نقل کی ہے، جس میں یہود کے مقابلہ میں نصاریٰ کو مسلمانوں سے زیادہ قریب بتایا گیا ہے، مگر اس کے سلسلہ میں کوئی وضاحت نہیں کی ہے، ظاہر ہے اس سے عام مسیحی خصوصاً فرنگی قومیں مراد نہیں ہیں، جو پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کے پیرو اور کفارہ و تثلیث کے قائل ہیں، بلکہ حضرت مسیحؑ کے مخلص متبعین مراد ہیں، جو ان کو ابن اللہ کے بجائے خدا کا بندہ اور رسول مانتے تھے، علاوہ ازیں نصاریٰ اور مسیحی مترادف نہیں ہیں، رد عیسائیت کے متعلق کتابوں میں مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم وغیرہ کی کتابوں کا ذکر رہ گیا ہے، ان فروگذاشتوں کی نشاندہی اس لئے کی گئی ہے، تاکہ آئندہ اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے، خامیوں کے باوجود کتاب مفید ہے اور اس سے اردو میں مسیحیت پر ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا"

انوکھے سنسار کی انوکھی باتیں، از جناب بدیع الزماں اعظمی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱للعہ غیر مجلد سے، پتہ از مصنف ۱۴۰ ۔ کرمی ٹولہ، اعظم گڈھ، یو۔ پی،

جناب بدیع الزماں اعظمی ریٹائرڈ ٹیچر ہیں، درس و تدریس کے علاوہ ان کو بچوں کی ذہنی تربیت سے بھی بڑی دلچسپی ہے، اس غرض سے وہ برابر مضامین، ڈرامے اور کتابچے لکھتے رہتے ہیں انھوں نے اس مصور کتاب میں دنیا کی انوکھی اور دلچسپ باتیں عام فہم زبان میں لکھی ہے، پہلے زمین آسمان، ستاروں، سیاروں، قدیم بری و بحری جانوروں، پرندوں، مکانات، اور رسم ورواج دلچسپ ذکر ہو، پھر ہندوستان میں پنج سالہ منصوبوں کے درمیان بنائے گئے باندھ جھیلوں بھی گھروں نہروں اور بڑے بڑے کارخانوں کے متعلق مفید معلومات قلمبند کی گئی ہیں آخر میں آنیوالی اکیسویں صدی کے بارہ میں بعض دلچسپ پیشین گوئیاں ہیں، یہ مفید اور پرازمعلومات کتاب سکولوں کے طلبہ کے مطالعہ میں شامل کئے جانے کے لائق ہے،

اجالے از جناب کالیداس گپتا رضا صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت طباعت عمدہ صفحات ۸۰ مجلد مع گرد پوش قیمت عہ پتہ دل پبلیکشنز، ۱۰ جولی بھون نمبر ۱، نیو مرین لائن چرچ گیٹ بمبئی نمبر ۲

جناب کالیداس رضا گپتا مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں اجالے ان کا نیا مجموعۂ کلام اس میں پہلے نعتیہ کلام اور آخر میں حضرت حسینؓ کی منقبت و شہادت سے متعلق اشعار ہیں لیکن بعض اشعار غیر موزوں اور کہیں کہیں زبان و انداز بیان عجیب ہے، مثلاً:-

تھی یہی شانِ محمد کہ رسالت پاکر ساری مخلوق کو قرآن کے جھلائے جھولے

اے حسینؑ آل نبی، ابن علی، ذبح عظیم عالم شعر سے منظور ہو شاعر کا سلام

ذبح عظیم کے بجائے صاحب ذبح عظیم اور منظور کے بجائے مقبول کہتے تو کچھ بات بنتی، پھول اس ا مونث لکھا ہے، قیمت بھی زیادہ ہے،

" ض "

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

۱- مہاجرین جلد دوم قیمت: ۹-۱۲

۲- سیر الصحابہ جلد ۶ " ۴-۹

امام حسینؓ کے حالات زندگی کے ضمن میں واقعہ ہائلۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳- سیر الصحابہ جلد ۷،

۴- تابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح، قیمت: ۵۰-۱۲

۵- تاریخ اسلام اول (عہد رسالت خلافت راشدہ) قیمت: ۵۰-۱۲

۶- تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰۰-۱۱

۷- تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول) قیمت: ۰۰-۱۴

۸- تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم) قیمت: ۰۰-۱۵

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت ۶۵-۱۵

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں، قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنو)

۱۲- دین رحمت قیمت: ۰۰-۱۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۷۵-۴

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی علمی تعلیمی قومی ملی سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلاویز مرقع۔ اور اپنے اسلوب و طرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ قابل مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۵۰-۲۷

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہونچ گیا ہے، مستشرقیات کے جن غیر مسلم فضلار نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب ورالکی نگرانی میں دار المصنفین کے رفقار محققین نے ان کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دیئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں،

مکمل فائلوں کی تفصیل

۱۹۳۴ء   ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء

۱۹۷۱ء

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں،   "منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ جون ۱۹۷۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن ـ عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

جلد ۱۲ ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۳ء عدد ۶

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

گذشتہ مہینہ لکھنؤ میں حلقۂ پیام انسانیت کا ایک کل ہند کنونشن ہوا، اس کے بانی اور روح رواں ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں، جو اپنے انسانی اخلاق کی بلندی کردار کی پاکیزگی اور محبوب شخصیت کی دلآویزی سے قرون اولیٰ کے بزرگوں کی یاد تازہ کرتے ہیں وہ اب سے تین سال پہلے ملک کی بگڑتی ہوئی صورت اور انسانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی سے بہت دلگیر ہوئے تھے تو انھوں نے حلقۂ پیام انسانیت قائم کیا تھا جس کے ذریعہ سے ہندوستان کے شہریوں اور خصوصاً مسلمانوں کو للکار کر ان کو انسانیت اور اخلاق کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی ممکن ہے کہ اُن کی آواز ہندوستان کے عام شہریوں تک نہ پہنچی ہو لیکن مسلمانوں کو اُن کے پیام کو لازمی طور پر اپنانا ہے، اس برصغیر میں بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمان تو اپنے سارے مسائل دینی حکومتوں کے ذریعہ سے طے کر سکتے ہیں مگر ہندوستان کے مسلمانوں کو اب سلاطین دہلی یا مغل بادشاہوں کی طرح یہاں کی حکومت حاصل نہیں ہو سکتی ہے جو مسلمان قومی دھارے کا ساتھ دیتے رہیں گے اُن کو بڑے سے بڑا عہدہ بھی ملتا رہیگا، یا مختلف ریاستوں میں ان کو وزارت میں کچھ حصہ بھی دیا جاتا رہیگا مگر ان افراد کے معزز عہدوں سے مسلمانوں کی اجتماعی مشکلات دور نہیں ہو سکتی ہیں پھر سوال یہ ہے کہ وہ کریں تو کیا کریں اُن کو کوئی الہ دین کا چراغ بھی نہیں مل سکتا جس سے وہ اپنے مذہبی، سیاسی، عمرانی اور معاشرتی مسائل کو حل کرتے رہیں،

مگر الہ دین کے چراغ سے بڑھ کر ان کے اخلاق، کردار اور سیرت کا چراغ ہے بشرطیکہ وہ خود اس کو روشن رکھیں، وہ اچھے انسان بن کر اپنی ہر قسم کی مشکلات کو دور کر سکتے ہیں، اور اس ملک کے قومی دھارے پر بھی اجتماعی طور سے اثر انداز ہو سکتے ہیں، اگر وہ سچے مسلمان بن جائیں تو اچھے انسان خود بخود بن جائیں گے

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو اس کے فاتح حضرت ابو عبیدہؓ نے ان کو وہاں آنے کی دعوت دی، جب وہ وہاں داخل ہو رہے تھے، تو ان کے معمولی لباس اور بے سروسامانی کو دیکھ کر مسلمان شرمائے کہ عیسائی ہنسیں گے، اس لئے انھوں نے اپنے امیر المومنین کو ترکی گھوڑے اور قیمتی پوشاک لا کر دی، اُن کو دیکھکر حضرت عمرؓ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے، ہمارے لئے یہی بس ہے، حضرت عمرؓ کے خیال میں مسلمان ہونا بیت المقدس کے غیر مسلموں کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھا، ہندوستان کے مسلمان سوچیں کہ کیا وہ ایسے مسلمان ہیں جو یہاں کے غیر مسلموں کو متاثر کر سکتے ہیں،

ع: تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو،

انسانیت کو سنوارنے کے لئے ایمان، تزکیۂ نفس، زہد، تقوی، عفت، دیانتداری، حیا، رحم، عدل، عہد کی پابندی، عفو، درگذر، حلم، تواضع، خوش کلامی، ایثار، اعتدال پسندی، خودداری، شجاعت، استقامت، حق گوئی اور استغنا وغیرہ جیسے اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے، ان سب کی تعلیمات ہمارے رسول اکرمؐ نے دیں، اور خود بھی ان پر عمل کر دکھایا، آپ کا ارشاد ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں، آپ نے اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دی کہ سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، قیامت کی ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی اور چیز نہ ہوگی، لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں، ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں، ہندوستانی مسلمان اپنا محاسبہ کریں کہ وہ قدرت کے اس بہترین عطیہ کے حقدار کس حد تک ہیں، آج سے پون صدی پہلے مسلمانوں کے متعلق شاعر اسلام نے جو یہ کہا تھا،

یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

کیا یہ اب بھی ان پر اطلاق نہیں ہوتا ہے ؛ ؟

مسلمان سوچیں کہ انکی اجتماعی زندگی کی نشاۃ الثانیہ کا ذریعہ وہی اخلاق بن سکتا ہے جسکی تعلیم ان کے مذہب نے دی ہے، یا کسی سیاسی مفکر کا نظریات کو حیات نو دیسکتا ہے؟ یہ دور مذہب سے بیزاری کا ہے، اسکی فرسودگی، عدم رواداری، انسانوں کے درمیان افتراق انگیزی اور جنگ میں اسکی خون آشامی سے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ

خیالات ذہن پر کامل تسلط ہو چکا ہو مگر اس دور میں ہندچینیا اور ویت نام میں انسانیت کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی ہے وہ مذہب کی تاریخ میں نہیں پڑھی جا سکتی ہو مگر یہ بہت کچھ مادی، ثقافتی، عریانی اور مشینی بے فکری عیاشی کے جب تمام تجربات ختم ہو چکے ہونگے تو پھر روحانی سکون کی تلاش ہوگی جو مذہب ہی کے ذریعہ سے ملیگا مذہب کی بیزاری کا امام روس سمجھا جاتا ہے، مگر وہ بھی اب مذہبی اجتماعات کرانے کی فکر میں رہنے لگا ہے۔

ہندوستان کی سیکولرزم کا خوش آیند پہلو یہ ہے کہ یہاں ہر مذہب کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا گیا ہے جبلی طور پر ہندوستان کا مزاج بھی مذہبی واقع ہوا ہے جدید نظر و فکر سے وقتی طور پر اس کا مذہبی شعور دب جاتا ہے مگر پھر ابھر آتا ہے، ہندوستان کی سیاست میں گاندھی جی کی مہاتمائیت کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہیگا جنگ آزادی میں انکی مذہبیت کے سامنے بہتوں کی نظری اور فکری موشگافیاں دب کر رہ گئی تھیں مولانا محمد علیؒ پر الزام تھا کہ ان پر مذہب کا جنون طاری رہا مگر انھوں نے لندن کی گول میز کانفرنس میں اپنی مشہور تقریر میں یہ کہا تھا کہ ہم ہندوستان میں ریاست ہائے متحدہ کے بجائے مذاہب متحدہ کے مالک ہونگے، جو ایک دوسرے سے بالکل مشابہ تو نہیں لیکن انکی نیرنگی میں یکرنگی ہوگی ہم اپنی آپ عزت کر کے دوسروں کی عزت کریں گے انفرادی حیثیت سے مختلف ہوں گے لیکن اس میں اس طرح ملے ہوں گے، جس طرح محبت کرنیوالے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ یہ کوہ سینا کا کوئی عطا نہیں بلکہ رسول عربی کی آواز بازگشت ہے آپ کا ارشاد ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اس کے نزدیک سب پسندیدہ لوگ ہیں جو اس کے کنبہ کے ساتھ نیکی کریں،

اگر ہندوستان کے مسلمان یہ ثابت کر دکھائیں کہ رحمۃ للعالمین نے انسانی اخوت کا جو درس دیا ہے اس کے وہ عملی نمونے ہیں تو اُن کے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ آجائے گا جس کے بعد دنیا اُن کے پیچھے دوڑے گی، وہ دنیا کے پیچھے دوڑتے نظر آئیں گے ع تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری،

اگر مسلمانوں کا یہ طرز فکر ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے حلقہ پیام انسانیت کو ایک سیاسی پارٹی تو نہیں بلکہ ایک نئی اور مانوس صدا لگانے والوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنانے میں کامیاب نہ ہوں،

مقالات

اسلام میں مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۵)

میرے استاد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ جلد چہارم میں صحیح مسلم کتاب الایمان سے دو بہت ہی موثر اور سبق آموز واقعات کا ذکر کیا ہے، ایک تو یہ کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ سے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے "میں مسلمان ہوتا ہوں" تو میں کیا کروں، اس کو قتل کردوں"۔ فرمایا نہیں، اس کا قتل جائز نہیں عرض کی یارسول اللہ میرا ہاتھ اس نے کاٹ ڈالا، پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں، فرمایا اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ وہ ہوگیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤگے جو وہ اس اقرار توحید سے پہلے تھا،

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ کے چہیتے خادم اسامہؓ بن زید ایک مہم پر بھیجے گئے تو جب گھسان کی لڑائی ہو رہی تھی تو ایک شخص ان کی زد میں آگیا، انھوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا الہ الا اللہ پکار اٹھا، حضرت اسامہؓ سمجھے کہ اس نے جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ لیا ہے، اس لیے نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اسامہ سے سخت آزردہ ہوئے، اسامہ نے عرض کی یارسول اللہ! اس نے صرف تلوار کے

ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا، پھر برابر یہ فرماتے رہے، اے اسامہ! تم قیامت میں اس کے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دوگے،

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے تحریر فرمایا ہے، کہ دیکھو واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے، واقعہ تو یہ تھا کہ اسی حملہ آورانہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار اور مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے تو جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے، تو اپنی جان بچانے کے لیے فوراً کلمۂ شہادت پڑھ دیتے تھے، اور یہاں اس صورت میں کہا جاتا ہے کہ اسلام نے تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا، کیا یہ صداقت ہے؟

ایک حدیث یہ ہے،

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ	مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے
حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَا اِلٰهَ	اس وقت تک لڑائی کروں جب
اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ	تک وہ لا الٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ نہ کہیں
اللّٰهِ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ	جب وہ اقرار کرلیں تو انھوں نے اپنے
اَعْصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَهُمْ وَ	جان و مال کو مجھ سے بچا لیا، انکی نیت
اَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ	کی پرسش خدا کا کام ہے،
وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ (بخاری)	

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے استاذی المحترم لکھتے ہیں کہ اس کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا تو جائز نہیں، لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت تک جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے، اور جب اس نے یہ کرلیا تو پھر اس سے بھی لڑنا جائز نہیں

خواہ وہ تلوار کے ڈر سے لا الہ الا اللہ پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو، اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا، انسان کا فرض نہیں ہے، خدا کا ہے، یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو یہ معنے میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لئے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا اور دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کر دیں گے، غور کرو، اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار توحید کے بغیر آسانی سے چھوڑے جاتے؟ یا ہاری ہوئی قوموں سے اسلام قبول کرانے کے بجائے صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا، اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ اگر کفار کا محارب فریق صلح کیلئے جھکے تو تو بھی جھک جا، (انفال - ۸) بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں، ان سے صلح نہ کرنا، اور نیز کیا یہ مسلمانوں کو حکم ہو سکتا تھا کہ لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسکو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اسکو اس کے امن کی جگہ پہونچا دے، (توبہ - ۱) بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اسکو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اسکو قتل کر کے جہنم میں پہونچا دو، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ پلٹ کر بیان کیا جاتا ہے، (سیرۃ النبی جلد چہارم، ص ۲۶۹ - ۲۶۶)

غزوات جارحانہ تھے یا مدافعانہ. ہجرت نبوی کے بعد مسلمانوں کے نیام سے ضرور تلواریں نکلیں مگر کب؟ مدینہ کے قیام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ۲ھ میں بدر اور سویق، ۳ھ میں احد، ۵ھ میں مریسیع، ۷ھ میں خیبر، ۸ھ میں موتہ، حنین اور اوطاس وغیرہ میں لڑائیاں لڑنی پڑیں، مگر یہ ساری لڑائیاں ان دشمنوں کے خلاف تھیں، جو حملہ آور ہو کر اسلام اور مسلمانوں کا استیصال چاہتے تھے،

آیندہ صفحات سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کے خلاف تلواریں اٹھیں تو اسلام کے نیام سے بھی تلواریں نکل پڑیں،

رسول اللہؐ اپنے جان نثاروں کے ساتھ مدینہ منورہ میں آکر ابھی اچھی طرح سکونت پذیر بھی نہیں ہوئے تھے کہ مکہ کے غیر مسلموں کا ایک خط مدینہ کے ایک بڑے سردار عبداللہ بن ابی کے نام پہونچا کہ تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے یہاں پناہ دی، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے۔ اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے، (بخاری باب التسلیم من المسلمین والمشرکین سیرۃ النبی، جلد ۱ ص ۳۰۵) اس دھمکی کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی نیند حرام ہوگئی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگتے، صحابہ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے، ۲ھ ہجری میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا

قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ	خدا کی راہ میں ان لوگوں سے
يُقَاتِلُونَكُمْ (بقرہ ۲-۲۴)	لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں،

اس آیت سے ظاہر ہے کہ مسلمان خدا کی خاطر ان سے لڑیں جو ان سے لڑتے ہیں، یہ حکم نہیں ہے، کہ خدا کی راہ میں ہر کس و ناکس سے لڑیں رسول اللہؐ نے حفاظت خود اختیاری میں جہاں اور تدبیریں کیں، وہاں قبائل سے معاہدے بھی کئے، تاکہ وہ مکہ کے حملہ آوروں سے مل کر آپ کے لیے خطرناک نہ بن جائیں، آپ نے جہینہ، بنو ضمرہ، بنو مدیح سے بڑے فراخدلانہ شرائط طے کیے، مثلاً جہینہ کے قبیلہ سے یہ معاہدہ ہوا کہ وہ بالکل غیر جانب دار رہیں گے بنو ضمرہ سے یہ طے ہوا کہ ان لوگوں کے جان و مال محفوظ رہیں گے، اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا، اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی،

بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لیے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے، بنو مدلج سے بھی اسی قسم کے معاہدہ ہوا، (زرقانی جلد ۱ ص ۴۰۹، و سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۳۱۰-۱۲)

احتیاطی تدبیر ہی کے سلسلہ میں آپ نے حضرت عبد اللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ نخلہ بھیجا جو مکہ اور طائف کے درمیان تھا، تاکہ وہ قریش کی جنگی کارروائیوں اور سرگرمیوں کی خبروں سے آپ کو وہاں سے مطلع کرتے رہیں، نخلہ کے قیام کے زمانہ میں مکہ کے چند معزز اشخاص شام سے منقے، چمڑے اور تجارتی مال لے کر آرہے تھے، حضرت عبد اللہؓ نے ان پر حملہ کر دیا، اور ان کے ایک اہم آدمی عمرو بن الحضرمی کو قتل کر دیا، اور دو شخص کو گرفتار کر لیا، ان کو اور مال غنیمت کو لے کر حضرت عبد اللہؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کو بڑا دکھ ہوا، اور فرمایا "میں نے تم کو ماہ حرام میں قتال کا حکم نہیں دیا تھا"، مال غنیمت لینے سے انکار کر دیا، صحابہ بھی حضرت عبد اللہؓ سے برہم ہوئے کہ تم وہ کر گذرے جس کا حکم تم کو نہ تھا، مکہ کے غیر مسلم رسول اللہؐ سے جنگ کرنے کے لیے بے تاب ہی تھے، یہ واقعہ ان کے لیے مزید بہانہ تھا، ابن حضرمی کے خون کا خون بہا ادا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ابوجہل نے حضرمی کے بھائی عامر کو اس پر رضامند ہونے نہیں دیا، غیر مسلم مدینہ کی طرف جارحانہ حملہ کے لیے بڑھے، رسول اللہؐ مدینہ سے نکل کر بدر کے میدان میں ان سے صف آرا ہوئے، آپ کے ساتھ تین سو دس آدمی تھے، دشمنوں کی تعداد تین گنی زیادہ تھی، ان کے ساتھ ایک ہزار آدمی تھے جن میں سو سواروں کا رسالہ بھی تھا، قریش کے تمام سردار حملہ آوروں کے ساتھ تھے، صرف ابولہب کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا، رسول اللہؐ کے لیے کھجور کی ایک جھونپڑی بنادی گئی

پ ... میں فروکش ہوئے (طبری جلد اول ص ۱۰۲، اردو ترجمہ) میدان جنگ میں
پانی کی کمی تھی، بارش ہوئی، تو پانی جمع کر لیا گیا، مگر دشمنوں کو کافی پانی نہ مل سکا رسول اللہ
نے ان کو اپنی سمت سے پانی پینے کی اجازت دیدی، (ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۶) لڑائی شروع
ہوئی تو آپ یہ دعا فرماتے رہے،

"خداوندا یہ قریش غرور اور نخوت کے ساتھ تجھ سے لڑنے اور تیرے رسول
کو جھٹلانے آگئے ہیں، تو نے جو مجھ سے نصرت کا وعدہ فرمایا ہے، اسے پورا کر اور
آج ہی ان کا خاتمہ کر دے، (طبری جلد اول اردو ترجمہ ۱۰۳، عربی ۱۳۰۰)

خداوندا اگر یہ مسلمانوں کی جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر آج کے بعد دنیا میں
کوئی تیرا پرستار نہ رہے گا۔

اے بارالہ! تو نے جو وعدہ مجھ سے کیا ہے اسے پورا کر اگر مسلمانوں کی یہ
جماعت ہلاک ہوگئی تو تیری عبادت موقوف ہو جائے گی، (طبری جلد اول
اردو ترجمہ ص ۱۰۹، عربی ص ۱۳۱۹)

آپ اسی طرح کی دعاؤں میں برابر مصروف رہے، کچھ اس الحاح وزاری میں
اب کی چادر آپ کے اوپر سے گر پڑی تو حضرت ابوبکرؓ نے اٹھا کر پھر آپ کے اوپر
رکھدی، اور بالکل قریب آکر عرض کیا یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر نثار
آپ نے دعا کا حق ادا کر دیا، اب آپ زیادہ نہ کہیں، بہت جلد اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ
پورا کرے گا، (طبری جلد اول اردو ترجمہ ص ۱۰۹، عربی ص ۲۰-۱۳۱۹)

ان دعاؤں کی نوعیت بتا رہی ہے کہ رسول اللہؐ محض مدافعانہ جنگ لڑنے کے لیے آمادہ
ہوئے تھے، یعنی اسلام کی طرف سے نہیں بلکہ اسلام کے خلاف تلوار اٹھی تھی۔ لڑائی میں

اسلام کی فتح ہوئی، آپ نے اس کی بشارت دینے کے لیے عبداللہ بن رواحہ کو اہل العالیہ اور زید بن حارثہ کو اہل السافلہ کے پاس روانہ کیا، اسامہ بن زید کا بیان ہے کہ ہم کو اس فتح کی خبر اس وقت ملی جب ہم رقیہ بنت رسول اللہ صلعم کو دفن کر رہے تھے، جو حضرت عثمان بن عفان کے نکاح میں تھیں، (طبری جلد اول اردو ترجمہ ص ۱۹۹ عربی ص ۱۳۴۴) اس لڑائی میں جو لوگ قیدی ہوئے، ان میں رسول اللہ کے داماد ابو العاص بن الربیع بھی تھے، جن کے نکاح میں حضرت زینب بھی تھیں، یہ حضرت خدیجہ کی خالہ کے بیٹے تھے، ان قیدیوں کے ساتھ رسول اللہ نے جو سلوک کیا وہ دنیا کے لیے ایک مثال ہے، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کی رہائی چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاجزادی حضرت زینب نے بھی اپنے شوہر کے فدیہ کے لیے کچھ مال بھیجا، اس میں وہ ہار بھی تھا، جو حضرت خدیجہ نے ان کو جہیز میں دیا تھا اس ہار کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہو گئے، آپ نے صحابہ سے فرمایا اگر مناسب سمجھو تو زینب کی خاطر اس کے اسیر شوہر کو رہا کر دو اور اس کے ہار کو بھی اس کو واپس دیدو، صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم خوشی سے اس کے لیے تیار ہیں، ابو العاص کو چھوڑ دیا گیا، اور حضرت زینب کا ہار ان کو واپس دیدیا گیا،

ابو العاص نے مکہ پہونچ کر حضرت زینب کو رسول اللہ کے پاس جانے کی اجازت دیدی، وہ ابو العاص کو مکہ میں چھوڑ کر مدینہ رسول اللہ کے پاس چلی آئیں اسلام نے دونوں کے درمیان تفریق کر دی تھی، فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے ابو العاص تجارت کے لیے شام گئے، ان کی دیانت مشہور تھی، اس لیے قریش کے اور لوگوں نے تجارت کے لیے اپنا مال ان کے ساتھ کر دیا تھا، جب وہ واپس آرہے تھے تو مدینہ کی ایک فوج نے ان کو

دشمن سمجھ کر ان کے مال پر قبضہ کر لیا، وہ کسی طرح چھپ کر رات کو مدینہ پہونچ گئے، اور حضرت زینبؓ سے پناہ مانگی، انھوں نے ان کو پناہ دیدی، اور ان کا مال واپس کرانے کا وعدہ کیا، فجر کی نماز میں حضرت زینبؓ نے عورتوں کی صف سے چلا کر کہا اے صاحبو! میں نے ابو العاص کو پناہ دیدی ہے، نماز کا سلام پھیر کر رسول اللہؐ نے صحابہ کو مخاطب کر کے کہا صاحبو! تم نے سنا جو میں نے سنا، انھوں نے کہا جی ہاں آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اس سے پہلے مجھے اس واقعہ کا علم نہ تھا، جب ایک ادنیٰ فرد نے تمام مسلمانوں کی طرف سے پناہ دیدی ہے تو اس کو پناہ ملنی چاہئے، اس کے بعد آپ اپنی صاحبزادی کے پاس آئے اور فرمایا، اے میری بچی، تم ابو العاص کی اچھی طرح خاطر داری کرو، مگر اپنے پاس نہ آنے دینا کیونکہ اب تم اس کے لیے حلال نہیں ہو، اس کے بعد ابو العاص کا تمام مال ان کو واپس کر دیا گیا، جب وہ مکہ آئے تو ایک ایک چیز ان لوگوں کے حوالہ کر دی جن سے وہ لے کر تجارت کرنے گئے تھے، اس کے بعد انھوں نے پوچھا اے جماعت قریش! تم میں سے اب کوئی ایسا شخص رہ گیا ہے، جس کا مال میرے پاس ہو، اور وہ اس کو اب تک وصول نہ ہوا ہو، انھوں نے کہا نہیں، کوئی اب ایسا نہیں ہے، سب کو ان کا مال پہونچ گیا ہے، ہم نے تم کو نہایت معتبر اور شریف پایا، اس کے بعد ابو العاص نے اَشْهَدُ ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ پڑھا پھر اہل قریش کو مخاطب کر کے بولے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا، اسی وقت ایمان لے آتا، مگر میں ڈرا کہ تم لوگ یہ بدگمانی کرو گے کہ اس طرح سے میں نے تمھارے مال کھانے کی ترکیب کی ہے، جب اللہ نے اسے تم کو پہونچا دیا، اور بار امانت سے فارغ ہوا، تو میں نے اسلام لے آیا، اس کے بعد وہ مکہ سے مدینہ آگئے، ان کے آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

نے حضرت زینبؓ کو ان کے نکاح میں دے دیا، (طبری اردو ترجمہ، ج ۱ ص ۲۱۲-۲۰۷ عربی ص ۱۳۵۱-۱۳۴۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے اور دوسرے اسیروں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا، اور ان کو مکہ واپس ہو جانے کی اجازت مل گئی، ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جا سکتی تھی، اور اگر وہ قبول نہ کرتے تو ان کو قتل کر دیا جا سکتا تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

بدر کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد غیر مسلموں میں انتقامی جذبات اور بھی ابھر گئے، ان کے سردار ابوسفیان نے عہد کیا کہ جب تک وہ اس کا انتقام نہ لے گا، سر میں تیل نہ ڈالیگا اس نے اپنے ہم مذہبوں کو برانگیختہ کرنے کے لیے عربی میں کچھ اشعار کہے تھے، جن کا مطلب یہ ہے کہ یثرب اور مسلمانوں کی جماعت پر پیش قدمی کرو، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ انھوں نے جمع کیا ہے، وہ تم کو مل جائے گا۔ اگر بدر میں انکو کامیابی ہوئی تو اب آیندہ تم کو کامیابی ہوگی، میں نے قسم کھائی ہے کہ نہ میں عورتوں کے پاس جاؤنگا، اور نہ اب نہاؤنگا جب تک کہ تم قبائل اوس اور خزرج کو فنا نہ کر دوگے، میرا دل آتش انتقام سے شعلہ زن ہے (تاریخ طبری اول حصہ سوم، اردو ترجمہ ص ۲۲۵-۲۲۴، عربی ص ۱۳۶۶) ابوسفیان دو سو سواروں کو لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوا، یہودی قبیلہ بنو نضیر کے ...... سردار سلام بن مشکم کو اپنا حلیف بنایا، اور مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر عریض میں آکر محاذ آرائی کی، ایک انصاری سعد بن عمرو کو قتل کیا، چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، تو آپ اس کے تعاقب میں نکلے، ابوسفیان بھاگ نکلا اور گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا، عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں، اسی لیے یہ لڑائی غزوۂ سویق کہلائی، (تاریخ طبری ج اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۲۲۵ عربی ص ۱۳۶۰)

یہ غزوہ جارحانہ کے بجائے بالکل مدافعانہ تھا۔

غیر مسلموں کا انتقامی جذبہ اور بھی بڑھا، ۳ھ میں وہ مدینہ پر پھر حملہ آور ہوئے، انکی فوج کی تعداد تین ہزار تھی، جن میں دو سو سوار تھے، اس کے مقابلہ میں رسول اللہ ؐ کے ساتھ صرف سات سو مسلمان تھے، یہ غیر مسلم اپنے ساتھ عورتیں بھی لائے تھے، جو خود جوش انتقام سے لبریز تھیں، انھوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گی، پہلے تو مہاجر صحابیوں کی یہ رائے ہوئی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیجدی جائیں، اور شہر میں پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے، لیکن نوخیز بہادر صحابیوں کا خیال ہوا کہ شہر سے نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے، احد میں طرفین کا اجتماع ہوا، غیر مسلموں کی فوجی کارروائی کا پلہ بھاری رہا، ان کی عورتیں دف بجا بجا کر ان کی ہمت بڑھاتی رہیں، وہ ان کو اشعار پڑھ پڑھ کر للکارتیں کہ ہم خاندانی بی بیاں ہیں، آگے بڑھوگے تو گلے ملیں گے، اور فرش بچھائیں گے، اگر منہ موڑوگے تو کسی خیال کے بغیر قطع تعلق کر لیں گے، اے بنی عبد الدار! اے پشت بچانے والو! شمشیر براں سے مارو، یہاں پر یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو دجانہؓ کو لڑنے کے لئے ایک تلوار دی تھی وہ لڑائی میں ایک غیر مسلم عورت کے پاس پہونچے جو اسی قسم کے اشعار پڑھ کر غیر مسلموں کو غیرت دلا رہی تھی، ابو دجانہؓ نے اسکو مارنے کے لیے تلوار اٹھائی، مگر پھر رک گئے جب ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے عورت پر تلوار اٹھا کر اپنی کارگذاری کیوں نہیں دکھائی تو بولے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کو اس سے برتر سمجھا کہ اس سے عورت کو قتل کروں، (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۲۴۹، عربی ص ۱۳۰۹)

مگر دوسری طرف سے یہ نمونہ پیش ہوا کہ لڑائی کے بعد غیر مسلم عورتوں نے مسلمان شہدا کے

کان ناک کاٹ لیے، ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے ان کا ہار بنا کر پہنا، اور حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی، آخر یہ غیر مسلم بھی کسی مذہب کے پابند تھے، یہ سفاکانہ سلوک ان کے مذہب کی کس تعلیم پر محمول کیا جائے؟ ...... یہ جنگ احد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے محض مدافعت میں لڑی گئی،

سنہ ۲ ہجری میں غزوۂ بنی قینقاع پیش آیا، یہ یہودیوں کا ایک بہادر قبیلہ تھا، بدر کی فتح کے بعد ان کو خیال ہوا کہ مسلمان طاقتور بنتے جا رہے ہیں، ان کو اپنے اقتدار کا خطرہ نظر آیا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ مدینہ میں تشریف لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے معاہدہ کر کے باہمی صلح و آشتی کر لی تھی، مگر جنگ بدر کے بعد انھوں نے اس معاہدہ کو توڑ ڈالا، اور بدر اور احد کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی، وہ مکہ کے غیر مسلموں کو خفیہ امداد بھی پہونچا کر ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے لگے، مدینہ میں ایک اتفاقی سبب یہ بھی پیش آیا کہ مدینہ کے بازار میں ایک یہودی دکاندار نے ایک انصاری عورت کی بے حرمتی کی، ایک مسلمان نے اس یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے پھر اس مسلمان کو ہلاک کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نقض امن کا حال معلوم ہوا تو آپ یہودیوں کے پاس تشریف لے گئے، اور ان کے بازار میں ان کو جمع کر کے کہا اے یہودیو! اللہ عزوجل سے ڈرو کہ کہیں وہ تم کو ایسی سزا نہ دے جیسی کہ اس نے قریش کو دی ہے، تم اسلام لے آؤ، تم جانتے ہو کہ میں مرسل ہوں، جس کا ذکر خود تمھاری کتابوں میں ہے، اور اس میثاق میں ہے، جو اللہ نے تم سے لیا تھا، یہ سن کر یہودیوں نے یہ جواب دیا، اے محمد! تم ہم کو بھی اپنی قوم ایسا سمجھتے ہو، تم ایسے لوگوں سے

لڑے جو لڑائی سے بالکل واقف نہ تھے، تم نے ان کو زیر کر لیا تو اپنی کامیابی سے دھوکہ
نہ کھاؤ، بخدا اگر تم ہم سے لڑے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم مرد اہل نبرد ہیں، اسی کے بعد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ إِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً — اگر تم کو کسی قوم کی خیانت کا اندیشہ
فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ (انفال) — ہو تو تم بھی ان کے ساتھ وہی کرو،

یہودیوں کی طرف سے نقض امن اور جنگ کا اعلان ہوا تو رسول اللہ نے ان کی تنبیہ
کے لیے اقدام کئے، یہودی قلعہ بند ہو گئے، پندرہ دن تک محصور رہنے کے بعد سپر ڈال دی، یہ
گویا یہودیوں کے خلاف محض پولیس ایکشن تھا، جب پورا قبیلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے قدموں پر گر پڑا تو اس زمانہ کا مشہور منافق عبداللہ بن ابی آپ کی خدمت میں
حاضر ہوا، اور بولا " اے محمد! آپ ان موالیوں پر احسان کریں، یہ
لوگ خزرج کے حلیف تھے" آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، تو
عبداللہ بن ابی پھر بولا" اے محمد! آپ میرے موالیوں پر احسان کریں" یہ سن کر آپ نے
منہ پھیر لیا، تو عبداللہ بن ابی نے بڑھ کر آپ کا گریبان پکڑ لیا، اس حرکت پر آپ کا چہرہ
متغیر ہو گیا، مگر عبداللہ بن ابی پھر بولا" بخدا، میں ہرگز اس وقت تک آپ کو نہیں چھوڑوں گا
جب تک آپ میرے موالیوں پر احسان نہ کریں گے، ان میں چار سو غیر مسلح اور تین سو زرہ
پوش ہیں، انھوں نے مجھے ہمیشہ حبشیوں اور ایرانیوں سے بچایا ہے، آپ ان کو ایک
وقت میں ختم کر دینا چاہتے ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا اچھا میں نے ان کو تمھاری خاطر
چھوڑا، مگر آپ نے ان کو جلا وطن کر دیا، جب وہ مدینہ سے باہر نکلے اور ذباب پہنچے
تو کہتے جاتے کہ انسانی شرافت ابھی اور دور رہے، اور دور رہے، (تاریخ طبری جلد اوّل

حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۱۰۱ - ۲۰۰ ، عربی ص ۱۳۶۱ - ۱۳۶۰)

یہودیوں کے ایک دوسرے قبیلہ بنونضیر نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی، ان کو مکہ کے غیر مسلموں کی طرف سے یہ پیام ملا تھا کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دیں ورنہ ان کا استیصال کر دیا جائے گا، وہ اسلام کے دشمن پہلے ہی سے تھے، اس دھمکی نے ان کو رسول اللہؐ کی شہادت کے لیے آمادہ کر دیا، عبداللہ بن ابی نے بھی انکی سازش میں ان کا ساتھ دیا، رسول اللہؐ کو اس کی سازش کی خبر ہوئی تو ان کے خلاف بھی پولس ایکشن کیا، وہ بھی قلعہ بند ہو گئے، مگر انھوں نے سپر ڈال کر صلح کر لی، اور شام کی طرف چلے جانے کی اجازت مانگی، ان کو اجازت دی گئی کہ اسلحہ کے علاوہ جتنا بار اونٹ پر لاد سکیں وہ لے جائیں، جس شان سے وہ گاتے بجاتے یہاں سے نکلے ہیں اسکا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ، (نیز دیکھو تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۲۹۰ - ۲۸۹ عربی ۱۴۴۸ - ۱۴۴۸)

سنہ ۵ھ میں غزوۂ بنی المصطلق پیش آیا، یہ قبیلہ مریسیع میں رہتا تھا، جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل پر ہے، اس کے سردار حارث بن ضرار نے مکہ کے غیر مسلموں کے اشارہ پر مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کی، یہ خبر پاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حفاظتی تدابیر کی خاطر ان کے خلاف صف آرائی کی جو معمولی لڑائی کے بعد پسپا ہوئے، اس لڑائی میں عبداللہ بن ابی نے جو منافقانہ رویہ اختیار کیا، اور اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رواداری دکھائی، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے، وہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، مگر اندرونی طور پر اسلام کے دشمنوں سے ملا رہا، اس غزوہ کی فتح کے بعد اس نے اپنی قوم کو مسلمانوں کے خلاف یہ کہہ کر ابھارا، بخدا ہمارے دشمنوں اور قریش کے

غلاموں کی وہی مثل ہے کہ اگر درندے کو تم پرورش کروگے تو وہ تم ہی کو کھا جائے گا،
مدینہ جاتے ہی وہاں کا جو سب سے معزز شخص ہے، وہ اس کو جو سب سے ذلیل ہے،
نکال دے، تم نے ان کو اپنے وطن میں اتارا، اپنی املاک میں شریک کیا، اگر تم ایسا
نہ کرتے تو وہ کسی اور جگہ جاتے، عبد اللہ بن ابی کی اس منافقت کی خبر زید بن ارقمؓ نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، اس وقت حضرت عمر فاروقؓ بھی وہاں موجود تھے،
وہ بول اٹھے کہ آپ عباد بن بشر بن وقش کو حکم دیں کہ وہ عبد اللہ بن ابی کو جا کر ہلاک
کر دیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عمر! یہ تو دیکھو کہ جب لوگوں میں اس بات کا
چرچا ہوگا کہ محمد خود اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیتے ہیں، تو اس کا کیا اثر پڑے گا، عبد اللہ
ابن ابی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ گئی
ہے، تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے حلف اٹھا کر ان باتوں سے انکار کیا، وہ اپنی
قوم میں بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا اسلیے صحابہ نے اس کو الزام سے بچانے کے لیے آپ سے عرض کیا کہ شاید زید بن
ارقم کے سننے میں غلطی ہوئی ہو، جب آپ مدینہ کی طرف تشریف لیجا رہے تھے، تو راستہ میں اسید بن
حضیر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا کہ تم کو اپنے آدمی کی یہ بات نہیں
معلوم ہوئی کہ وہ کہتا ہے، مدینہ جا کر جو سب سے معزز ہے، وہ سب سے ذلیل کو نکال
دے گا، اسیدؓ نے کہا آپ جائیں تو اسے فوراً نکال دیں، بخدا آپ ذی عزت ہیں،
اور وہ نہایت ذلیل ہے، مگر انھوں نے کہا یا رسول اللہ! مناسب ہے کہ اس وقت
آپ اس سے درگذر کریں، اس کی قوم اس کے لیے گھونگوں کا تاج بنا رہی ہے، مگر وہ
خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا، کہ اس کی حکومت کس طرح آپ کو حاصل ہوتی ہے،
عبد اللہ بن ابی کے لڑکے عبد اللہؓ رسول اللہ کے جاں نثاروں میں تھے، انکو اپنے باپ

کو ان باتوں کا علم ہوا، تو وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں نے سنا ہے کہ اس شکایت کی بنا پر جو آپ کو میرے باپ سے پہونچی ہے، آپ ان کو قتل کر دینا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ خود مجھے اس کا حکم دیں، خزرج کا تمام قبیلہ یہ جانتا ہے کہ میں اپنے باپ کا بہت ہی مطیع ہوں، اگر میرے علاوہ کسی اور کو آپ میرے باپ کے قتل کرنے کا حکم دیں گے تو یہ مناسب نہ ہوگا، کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو چلتا پھرتا دیکھوں پھر اس طرح ایک مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل کر کے ہمیشہ کے لیے دوزخ میں اپنا ٹھکانا بناؤں گا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم قتل کرنا نہیں چاہتے، جب تک وہ ہمارے ساتھ ہیں ہم ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں، اس واقعہ کے بعد جب عبد اللہ بن ابی اپنے قبیلہ والوں سے کوئی بات کہتا تو اس کی قوم اس کو برا کہتی اور سزا کی دھمکی دیتی، جب آپ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا، اگر میں تمہارے مشورے کے مطابق اس کو قتل کر دیتا تو ضرور اس کی قوم کی رگ حمیت اور حمایت جوش اور حرکت میں آتی، اور اگر آج میں اس کے قتل کا حکم دوں تو خود اس کی قوم بھی اس کا کام تمام کر دے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے محسوس ہوا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کارروائی میرے مشورے سے زیادہ موجب برکت تھی۔ بنی المصطلق کی لڑائی میں بہت سی عورتیں بھی گرفتار ہوئیں، جو مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں، ان میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہؓ سے خود نکاح کر لیا، اس کے بعد صحابہ نے کہا کہ بنی المصطلق تو اب رسول اللہؐ کے سسرالی رشتہ دار ہوگئے، اس لئے جو لونڈی اور غلام جس کے پاس ہو وہ اس کو آزاد کر دے، چنانچہ محض اس شادی کی وجہ سے سو سے زیادہ آدمی آزاد کر دیے گئے،

یہ بھی سیادت داری کی ایک عمدہ مثال ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لیے بابرکت بی بی کوئی اور نہیں دیکھی، (تاریخ طبری ج اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۴۸ - ۲۴۲ ، عربی ص ۱۵۱۴ - ۱۵۱۱)

اسی سال یہودیوں سے جنگ احزاب (خندق) ہوئی، یہ بھی دفاعی لڑائی تھی، بنی نضیر جلاوطن ہوئے تو انھوں نے مکہ کے قریش کو یہ لالچ دے کر ابھارا کہ خیبر کی نصف آمدنی ان کو ہمیشہ دی جائے گی، قریش کے قبیلوں میں بنی غطفان، بنو اسد اور بنو سلیم نے یہودیوں سے سازش کر کے چوبیس ہزار لشکریوں کے ساتھ مدینہ پر اس یقین کے ساتھ حملہ کیا کہ وہ اسلام کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے کر دیں گے، مسلمانوں پر اس لشکر جرار کا ہراس طاری ہو گیا، رسول اللہؐ مدینہ سے باہر نکل آئے اور خندق کھود کر مدافعانہ جنگ کی تیاری کی، آپ کی معیت میں تین ہزار صحابی تھے، مہاجرین اور انصار کے ساتھ مل کر آپ نے بھی خندق کھودی، جس کا عمق پانچ گز رکھا گیا، غیر مسلموں نے مدینہ کا محاصرہ ہر طرف سے کر لیا تو آپ نے کوہ سلع کو اپنے عقب میں رکھ کر وہاں پڑاؤ کیا، اور خندق کو اپنے اور دشمن کے مابین رکھا، بچوں اور عورتوں کو قلعوں میں بھیج دیا، یہودیوں کا قبیلہ بنی قریظہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن کا معاہدہ کر رکھا تھا، مگر وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسلام کے دشمنوں سے آملے، اور عہد وپیمان کا خیال کئے بغیر آپ کی شان میں گستاخی کے الفاظ استعمال کرنے لگے،

یہ محاصرہ ایک مہینہ تک رہا، صحابۂ کرام فاقہ کرنے لگے، ایک دن انھوں نے بے تاب ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں

لیکن آپ نے اپنا شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے، محاصرہ سے گھبرا کر صحابہ کے دلوں میں ہر قسم کے برے خیالات آنے لگے، بعض منافقین بھی ساتھ تھے، اس موقع پر انکا نفاق ظاہر ہوگیا، وہ کہتے کہ محمدؐ ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانوں کو اپنے تصرف میں لائیں گے، اس کے برخلاف اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ہم اپنی ضروریات سے فارغ ہونے کو بھی باہر نہیں جا سکتے، محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے، محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپ نے بنی غطفان سے مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث دے کر صلح کا معاہدہ کرنا چاہا، مگر صحابہ کرام کی غیرت وحمیت کچھ ایسی ابھری کہ آپ کو ان کے استقلال پر اطمینان ہوا، اس موقع پر حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ نے دشمنوں کے سرداروں سے لڑنے میں جو پامردی اور بہادری دکھائی اس سے صحابہ کرام کے حوصلے بڑھے، یہودیوں نے اس قلعہ پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی جہاں مستورات تھیں، مگر رسول اللہ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کی بہادری سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی، محاصرہ طول پکڑا تو محاصرین ہمت ہارنے لگے، چوبیس ہزار آدمیوں کے لیے رسد پہونچانا بھی ان کے لیے مشکل ہوگیا، پھر ایک روز ایسی آندھی آئی کہ ان کے لشکرگاہ میں بڑی تباہی آگئی یہودیوں اور قریش میں پھوٹ بھی پڑگئی، اور وہ مکہ کی طرف بے نیل مرام پلٹ گئے، اس غزوہ میں رسول اللہؐ کی چار نمازیں قضا ہوئیں، تیراندازی اور سنگ باری کی وجہ سے آپ اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے تھے، (تاریخ طبری ج اول حصہ سوم اردو ترجمہ ص ۳۱۹-۳۰۰، عربی ۱۴۶۵-۱۴۹۳) یہ جنگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مسلمانوں کی مدافعت میں لڑی، جیساکہ آپ کی اس دعا سے بھی ظاہر ہے، جو آپ نے اس محاصرے کے موقع پر اللہ تعالیٰ سے کی تھی، آپ مٹی اٹھاتے جاتے تھے، جس سے شکم مبارک غبارآلود

ہو جاتا، اور عزمانے جاتے۔

اے خدا تری مدد نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے [illegible]
نہ نماز پڑھتے، ہم پر سکون اور امن نازل فرما اور [illegible]
وقت ہم کو ثابت قدم رکھ، یقیناً ان کافروں نے ہم پر ظلم [illegible]
کسی برائی کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس کو دفع کرتے ہیں (بخاری
شریف باب الجہاد)

سنہ ہجری میں صلح حدیبیہ ہوئی، جو رسول اللہؐ کی رواداری، بردباری اور فراخدلی کی اعلیٰ مثال ہے، مسلمانوں کی قوت اور تعداد بڑھی تو آپ نے خانہ کعبہ میں جاکر عمرہ ادا کرنے کا ارادہ کیا، آپ کے ہمرکاب چودہ سو صحابہ ہوئے، آپؐ نے صحابہ کے ساتھ احرام باندھا تاکہ مکہ کے غیر مسلموں کو حملہ کا شبہہ نہ ہو، مگر ان غیر مسلموں نے اپنے تمام قبیلوں کو جمع کرکے ایک جمعیت عظیم سے آپؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا، رسول اللہؐ نے مدینہ سے نکل کر راستہ طے کرتے ہوئے مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنوئیں کے پاس قیام پذیر ہوئے، جس کا نام حدیبیہ ہے، یہاں پہونچ کر مکہ کے غیر مسلموں کو پیام دیا کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں، بلکہ عمرہ کرنے آئے ہیں، لڑائی سے پہلے ہی قریش کا کس بل نکل گیا ہے اگر وہ پسند کریں تو ہم ایک مدت کے لیے آپس میں سمجھوتہ کرلیں، اور باہمی مزاحمت سے باز آجائیں، تاکہ ہم اوروں سے نپٹ لیں، اگر ہم کو کامیابی ہو تو پھر ان کا جی چاہے تو اوروں کی طرح وہ بھی ہمارے ساتھ ہوجائیں، اور اگر مغلوب ہوجائیں تو اس اثنا میں ان کو پنپنے کا موقع مل جائے گا، ان کی تعداد میں اضافہ ہوجائے گا، اور اگر وہ ان باتوں کو نہ مانیں تو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں جس مقصد کے لیے آیا ہوں

اس کے [illegible] پیغام مکہ کے غیر مسلموں کے پاس پہونچا، تو پہلے انھوں نے اس کو منظور [illegible] کیا، لیکن ان ہی میں سے ایک معمر اور تجربہ کار شخص عروہ بن مسعود ثقفی کو [illegible] قابل قبول معلوم ہوئیں اسلیے وہ ان سے گفتگو کرنے کیلئے رسول اللہ ؐ کے پاس پہنچا، اس نے آپ کی [illegible] صحابہ کی عقیدت اور محبت دیکھی، اس سے متاثر ہوا مگر مکہ کے لوگوں کی عزت اور غرور کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ سے گفتگو کی کہ تم پہلے اپنی ہی قوم کا استیصال کرنا چاہتے ہو، کیا تم سے پہلے کسی عرب نے ایسا کیا ہے کہ اپنی جڑ کاٹی ہو، اور دوسری شکل جو تم نے پیش کی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے درمیان مزاحم نہ ہوں تو مجھے جو مختلف صورتیں تمہارے ساتھ نظر آرہی ہیں، ان میں ایسے ہی لوگ ہیں جن کی فطرت یہ ہے کہ وہ بھاگ جائیں گے، اور تم کو دشمن کے نرغے میں چھوڑ دیں گے، اس گفتگو کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ بھی تھے، ان کو یہ گفتگو بہت ہی ناگوار ہوئی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی رواداری سے عروہ کی باتیں سنتے رہے، وہ عرب کے قاعدہ کے مطابق بے تکلفانہ طریقہ سے باتیں کرتے ہوئے آپؐ کی ریش مبارک بار بار پکڑ لیتا، آپ کی حفاظت کے لیے مغیرہؓ بن شعبہ کھڑے تھے، ان کو یہ ناگوار ہوتا، مگر رسول اللہؐ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے، عروہ نے اس ملاقات کے دوران دیکھا کہ آپؐ اپنے صحابی کو جب کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں، جب وضو کرتے ہیں تو وہ اس کے پانی کو لینے کے لیے آپس میں لڑنے لگتے ہیں، جب وہ آپ کے پاس آکر باتیں کرتے ہیں تو نہایت آہستہ آہستہ بولتے ہیں، اور تعظیماً آپؐ کو گھور کر نہیں دیکھتے ہیں، عروہ جب مکہ واپس گیا تو اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ میں بادشاہوں کے دربار میں سفارت کے لیے گیا ہوں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے یہاں بھی گیا ہوں،

بخدا میں نے اپنوں میں کسی بادشاہ کی وہ عزت نہیں دیکھی جو محمد کے ساتھی محمد کی کرتے ہیں، پھر اس نے کہا انھوں نے بہت معقول شرطیں پیش کی ہیں، وہ مان لی جائیں، اس کے بعد بنی کنانہ کا ایک اور معزز شخص رسول اللہ کی خدمت میں بھیجا گیا، اس کے استقبال کے لیے آپ نے قربانی کے جانور بھی بھیجے، جس سے متاثر ہو کر اس نے کہا کہ یہ لوگ ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ ان کو بیت اللہ کی زیارت سے روکا جائے، اس کے بعد مکہ کے لوگوں نے حلیس بن علقمہ کو آپ کے پاس بھیجا، جو اس وقت حبوش کا سردار تھا، آپ نے اس کو آتا ہوا دیکھ کر فرمایا، یہ دیندار دوں کے خاندان کا آدمی ہے، اس کے سامنے نذر کے اونٹ پیش کئے جائیں، جب اس نے ان جانوروں کو دیکھا تو اس قدر متاثر ہوا کہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے کہ پلٹ گیا، وہاں پہونچ کر اس نے کہا اے قریش! میں نے خود نذر کے دو جانور دیکھے ہیں جن کے گلوں میں قلادے پڑے تھے، اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت دنوں سے پڑے ہوئے تھے، کیونکہ قلادے کی جگہ کے بال جھڑ گئے تھے، ان کو ان کے مقام تک پہونچنے سے روک دینا مناسب نہیں، اسکے بعد اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ ہم نے تم سے دوستی اور مدد کا معاہدہ اس لیے نہیں کیا ہے کہ ان لوگوں کو جو بیت اللہ کی عظمت کا اظہار کرنے آئیں، ان کو یہاں نہ آنے دیا جائے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یا تو تم محمد کو کعبہ آکر عمرہ ادا کرنے دو، ورنہ میں اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر حبوش چلا جاؤں گا، اور تمھارا ساتھ چھوڑ دونگا، اس کے بعد مکہ کے لوگوں کی طرف سے مکرز بن حفص آپ کی خدمت میں پہونچا، آپ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ یہ بدکردار اور بدکار آدمی ہے، پھر بھی آپ نے اس سے باتیں شروع کیں، اسی اثنا میں سہیل بن عمرو آپ کے پاس پہونچ گئے،

اس کو آتے دیکھ کر آپ نے صحابہ سے فرمایا، اب تمہارا کام آسان ہو گیا ہے اب یہ اپنے خاندانی تعلقات کی وجہ سے تم سے صلح کی درخواست کریں گے، تم قربانی کو جانور انکو دکھاؤ اور لبیک لبیک کے نعرے بلند کرو، شاید اس سے ان کے دل نرم پڑ جائیں، لیکن ابھی صلح کی بات شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ ابو سفیان نے اچانک ایک حملہ کر دیا، پوری وادی آدمیوں اور اسلحہ سے پر ہو گئی، کچھ مسلح حملہ آور گرفتار ہوئے تو آپؐ کی خدمت میں پیش کیے گئے، آپؐ نے نہ ان کے لباس اتروائے، اور نہ ان کے اسلحہ ضبط کیے، اور نہ ان کو قتل کر دینے کا حکم دیا، بلکہ عفو و درگذر سے کام لے کر ان کو چھوڑ دیا، طبری کی یہ بھی روایت ہے کہ ایک صحابی زنیم وادی حدیبیہ کے ایک بلند ٹیلے پر کھڑے تھے، کہ مکہ کے غیر مسلموں نے تیر کا نشانہ بناکر ان کو ہلاک کر ڈالا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے خلاف ایک رسالہ بھیجا، جو دشمن کے بارہ سواروں کو گرفتار کر کے آپؐ کے پاس لایا، آپؐ نے ان سے فرمایا، کیا میں نے تم سے کوئی عہد کیا ہے، جس کا ایفا لازم ہو، انھوں نے کہا نہیں آپؐ نے پھر اپنی شانِ رحمت دکھائی اور انکو چھوڑ دیا، اسی موقع پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

هُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ	اللہ وہ ہے جس نے مکہ میں ان کے
عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ	ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے
بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ	روکے، اس کے بعد تم کو ان پر
أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (فتح)	قابو دیدیا تھا،

صلح کی گفتگو ناتمام رہی، تو رسول اللہؐ نے خراش بن امیہ کو اپنے اونٹ پر مکہ بھیجا کہ وہاں اشراف کو آپ کے آنے کی غرض بتائیں، حضرت خراشؓ بن امیہ

مکہ پہونچے تو وہاں کے لوگوں نے انکے اونٹ کو مار ڈالا اور ان کو بھی قتل کر دینے کا ارادہ کیا، مگر حبشیوں کی حمایت سے بچ کر وہ رسول اللہ کے پاس چلے آئے، اس کے بعد مکہ کے لوگوں نے چالیس پچاس آدمیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرودگاہ تک بھیجا کہ آپ کے ساتھیوں کو قتل کریں، یہ سب گرفتار ہو کر آپؐ کے سامنے پیش کیے گئے، آپؐ کا دامنِ عفو پھر وسیع ہوا، اور ان کو بھی معاف کر کے رہا کر دیا،

اس کے بعد آپؐ نے صلح کا پیام دے کر حضرت عمر فاروقؓ کو بھیجنا چاہا، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میرے قبیلہ میں عدی والوں میں سے کوئی وہاں نہیں جو میری حمایت کر سکے، قریش کا میں سخت دشمن ہوں، اس لیے وہ میری بات ماننے کے بجائے میری جان کے درپے ہوں گے، میرے بجائے عثمانؓ بن عفان زیادہ بہتر ہوں گے، کیونکہ وہاں انکی عزت اور اثر ہے، چنانچہ آپؐ نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو یہ پیام دے کر بھیجا کہ لڑائی کرنا مقصد نہیں، بلکہ کعبہ کی زیارت مقصود ہے، حضرت عثمانؓ یہ پیام لے کر پہونچے تو مکہ کے غیر مسلموں نے ان سے کہا کہ ان کا جی چاہے تو کعبہ کا طواف کر سکتے ہیں، انھوں نے طواف کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ رسول اللہ کے بغیر طواف نہیں کر سکتے، اس پر ان کو مکہ کے لوگوں نے اپنے یہاں روک لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خبر پہونچی کہ وہ شہید کر دیے گئے، یہ سن کر فرمایا کہ اب جب تک دشمنوں سے فیصلہ کن لڑائی نہ لڑ لونگا یہاں سے واپس نہ جاؤنگا، یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ سے جان نثاری کی بیعت لی، اس کا نام بیعتِ رضوان ہے،

جب غلط فہمی دور ہوئی تو مکہ والوں نے سہیل بن عمرو کو یہ پیام دے کر بھیجا کہ صلح صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سال واپس چلے جائیں،

آپ نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلمبند کریں، سہیل بات بات پر اڑتا، مگر آپ اپنی رواداری میں اس کی ساری باتیں تسلیم کرتے گئے، حضرت علیؓ نے عنوان پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا، سہیل نے کہا کہ میں اس جملہ کو نہیں جانتا، اس کے بجائے، باسمک اللّٰہم لکھو، رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ سے کہا یہی لکھ دو، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ آگے لکھو یہ وہ معاہدہ ہے، جس پر محمدؐ رسول اللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے، اس پر سہیل نے کہا، اگر ہم اس بات کو مانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو پھر کیوں لڑتے، اس کے بجائے آپ اپنا محض نام اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے راضی ہو گئے، اور حضرت علیؓ سے کہا کہ لکھو کہ یہ وہ شرائط ہیں جس پر محمدؐ بن عبد اللہ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی ہے، اس کے بعد یہ شرائط قلمبند کی گئیں کہ دس سال تک ایک دوسرے سے لڑائی نہ ہوگی، اس مدت میں ہر شخص محفوظ رہے گا، کوئی کسی پر دست درازی نہیں کرے گا، قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ پہونچ جائے گا، تو وہ اس کے ولی کے پاس بھیجدیا جائے گا، اور اگر مدینہ سے کوئی قریش کے پاس چلا جائے گا، تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا، اب نہ تلوار نکلیگی، نہ تیراندازی اور نہ سنگ اندازی ہوگی، جس کا جی چاہے، فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہے معاہدہ میں شریک ہو جائے، ان شرائط کے ساتھ یہ شرطیں بھی رکھی گئیں کہ مسلمان اس سال مدینہ واپس چلے جائیں، مکہ کے اندر نہ آئیں، آیندہ سال وہ آئیں تین دن قیام کریں مگر ان کی تلواریں نیام میں رہیں۔

یہ شرطیں مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں، صحابہ کو بڑا دکھ ہوا، حضرت عمر فاروقؓ تو

ما وکہ میں رسول اللہ کے پاس پہونچے اور عرض کیا کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں آپ نے
فرمایا ہوں، حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں، آپ نے فرمایا "ہو" حضرت عمرؓ
نے کہا کیا اہل مکہ مشرک نہیں ہیں، آپ نے فرمایا "ہیں" حضرت عمرؓ نے کہا تو پھر ہم کیوں
دین کے معاملہ میں اپنی کمزوری تسلیم کریں، آپ نے فرمایا میں اللہ کا بندہ اور اس کا
رسول ہوں، ہرگز اس کے حکم کی مخالفت نہیں کرونگا، وہ کبھی میری بات نہیں بگاڑیگا،
حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ اس خوف سے کہ مجھے اپنی اس بات کا کوئی خمیازہ اٹھانا پڑے
میں اس روز سے برابر روزے رکھتا صدقہ دیتا، نمازیں پڑھتا، اور غلام آزاد
کرتا رہا یہاں تک کہ میرے قلب کو اطمینان ہو گیا، صلح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
نے قربانی کے اونٹ ذبح کئے بال ترشوائے، اور احرام کھولا اسی کے بعد سورہ انا فتحنا لک
فتحا مبینا نازل ہوئی، اور یہ فتح اس لحاظ سے ضرور تھی کہ صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک جتنی تعداد میں
غیر مسلم مسلمان ہوئے، پہلے کبھی نہیں ہوئے غیر مسلم مسلمانوں سے ملنے لگے تو رسول اللہ نے اپنی تعلیمات سے
انکے اخلاق کو جتنا پاکیزہ بنا دیا تھا، اسے دیکھ کر متاثر ہوتے اور اسلام قبول کرتے صلح حدیبیہ کا
اس لحاظ سے بھی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کس طرح ہر موقع پر
اپنی رواداری فراخدلی اور انسان دوستی کی مثال پیش کی جسکا نمونہ مشکل سے کسی اور تاریخ میں
مل سکتا ہے، بعض صحابہ کرام کی بیویاں مکہ میں رہ گئی تھیں انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ان کو
زور اور جبر ڈال کر انکو مسلمان کیا جا سکتا تھا، مگر صحابہ نے زبردستی کرنے کے بجائے انکو طلاق دے کر
علحدگی اختیار کرنے کو زیادہ پسند کیا، صلح حدیبیہ کی تفصیل کیلئے دیکھو بخاری شریف کتاب الشروط،
تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم ص ۳۰۲-۳۰۷-۲۴۶-۲۵۶ عربی ۵/۱۵۲۸-۱۵۲۰، نیز سیرۃ النبی جلد اول
ص ۶۱۰-۶۱۴، الفاروق ص ۴۰-۴۵، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج اول ص ۴۹-۵۰)

(باقی)

جدید عربی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

از ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی صدر شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی

(۲)

اس ذہنی اور تہذیبی اختلاف کا اصل مظہر مصر ایک جانب جامعۂ مصریہ ہے، جہاں اعلیٰ یورپی تعلیم ہوتی ہے، اور دوسری جانب جامعۂ ازہر ہے، جہاں ادبی و اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم دیجاتی ہے، زندگی کے یہی سوتے ہیں، جہاں سے عرب ذہنی غذا حاصل کرتے ہیں ان کیفیات کا اثر شاعری پر بھی مرتب ہوا ہے، شعراء بھی جدید و قدیم خیال کے حامل ہیں اور نثر نگار بھی۔

یہ مطالعہ صحیح ہے کہ اب ادب کو زندگی کا عکاس ہونا چاہئے، اور ملکی و سماجی مسائل بھی اس کے دائرہ میں شامل ہونے چاہئیں، اس لئے ضروری ہے کہ عربی شاعری میں عوام کے آلام و افکار کو جگہ ملے اور ایسے بلند آہنگ نغمے پیش کئے جائیں جو زندگی کو سوز و سرور، لذت و الم اور روشنی و تابندگی سے آشنا کر سکیں اگر معاشرہ پر غم کا سایہ ہو تو نغمے بھی غم انگیز ہوں اور معاشرہ مسرت سے ہمکنار ہے تو نغمے بھی مسرت افروز ہوں دلوں کو نشاط کی شبنم ملے تو کلیوں کو تبسم عطا ہو قدیم شاعری کا دامن اجتماعی رجحانات سے خالی ہے،

ڈاکٹر احمد امین لکھتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان جب عربی شاعری کا قدیم سرمایہ کھنگالتا ہے، تو اس کو بڑی مایوسی ہوتی ہے، اور جدید سرمایۂ شاعری میں بھی اس کو ذہنی سکون کا سامان خاطر خواہ نہیں ملتا، اس لیے وہ مغرب کے شعر و ادب اور افسانہ و روایت کے دامن میں پناہ لیتا ہے، وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے نقائص کو محسوس کریں، اپنے ادبی ذخیرہ کا جائزہ لیں اور اپنی شاعری کو اس قدر بلند اور وسیع کر دیں کہ وہ ہماری قومی زندگی کی

ہیں جائے، اس کے اندر جذبات فطرت، اسرار کائنات اور مناظر قدرت کی تفصیل کے ساتھ معاشرہ کی کمزوریوں کا بیان ہو۔ قوم کو اعلیٰ انسانی صفات اور بلند اخلاقی اقدار پ ایسے موثر اور پرزور انداز میں توجہ دلائی جائے کہ اعلیٰ مغربی تعلیم یافتہ نوجوں کے لک وملت کی محبت سے سرشار ہو جائیں ۔ جدید شاعر زندگی و مسائل زندگی کی شی، ایسی رنگینی ورعنائی کے ساتھ کرتا ہے، کہ لوگ اس کے اشعار پڑھکر جھومنے یں، عوام محسوس کرتے ہیں، مگر اپنے احساس کو فنی قالب عطا کرنے سے قاصر ہیں، مگر شاعر وفنکار احساس کو فن میں ڈھالنا اور مصور کرنا جانتا ہے،

حافظ کے متعلق مشہور ہے کہ ہوٹل چلے جاتے اور وہاں کسی واقعہ کے متعلق کے خیالات وافکار معلوم کرنے کی کوشش کرتے جب انھیں کسی سیاسی یا قومی یا اجتماعی کے بارے میں عوامی احساس کا صحیح اندازہ ہو جاتا تو اس کو نظم کے قلب میں ڈھال ممکن ہے، کسی کو ان کا یہ طرز عمل پسند نہ ہو مگر اس کے اندر عوام کے احساسات کا م ضرور محسوس ہوتا ہے،

دراصل دور جدید کی شاعری میں ایک بنیادی تغیر نظر آتا ہے، قدیم ادوار میں ی کا تعلق ایک خاص پڑھے لکھے طبقہ سے تھا، عوامی زندگی کے لذت والم اور حزن رکی عکاسی سے اسے سروکار نہ تھا، مثلاً اخطل، فرزدق، جریر، بشار، ابونواس، ابن رومی، متنبی، ابوتمام اور بحتری وغیرہ کا مطالعہ کیجئے تو مسائل حیات کے مرقعے نہیں آتے کہیں کہیں تجربات حکیمانہ نکات اور فلسفیانہ اشارات ضرور پائے جاتے لیکن ان سے عوامی زندگی کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا ہے، مگر جدید شعراء کے دواوین میں

نفس المصادر ص ۶۰

زندگی اچھلتی، مچلتی اور توانائیوں سے پُر نظر آتی ہے، جدید و قدیم شاعری میں شخصیات کا غلبہ ہے، اور طبقۂ اشرافیہ کے متعلق مواد فراہم کیا گیا ہے، مگر جدید شاعری میں عوامی و اجتماعی زندگی کا رنگ غالب ہے، اس کے اندر انسانی مسائل کے ساتھ حسن فطرت کی منظر کشی، آثار قدرت کی نقاشی اور جمال کائنات کی رنگ آرائی کا ایسا دل آویز بیان ملتا ہے کہ پرانے شاعروں کے یہاں اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، جدید شاعر زندگی کی خوابیدہ رعنائیوں کو بیدار کرتا ہے، اور اپنی شاعری کو نیا آب و رنگ بخشتا ہے، بلاشبہہ اس میدان میں یورپی شعرا نے زیادہ معنی خیز، وسیع اور دلکش اسالیب اختیار کیے ہیں، جو معانی کی گہرائی اور مشاہدات کی وسعت سے لبریز ہیں، اسی بنا پر ڈاکٹر احمد امین کا خیال ہے کہ جدید عربی شاعری ان موضوعات پر اپنے اندر وہ عظمت و کمال پیدا نہ کر سکی جس کی بنا پر وہ یورپی شاعری کا مقابلہ کر سکے، لیکن اس موقع پر انھوں نے یہ نہ سوچا کہ یورپ کی تہذیبی ترقی کو طویل عرصہ گذر چکا ہے، عربوں نے ان کے بہت بعد ترقی کی راہ پر قدم رکھا، یہ سچ ہے کہ یورپ سے صدیوں پہلے عربوں نے زندگی کو نئے آفاق دکھائے تھے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے بعد وہ اتنے گہرے گڑھے میں گر گئے کہ ابتک اس سے نہ نکل سکے۔

مصر میں جو تحریک تجدید اٹھی، اس میں زندگی تھی، اس کے روح رواں عقاد مازنی اور عبدالرحمن شکری تھے، لیکن یہ لوگ اس خیال پر قائم نہیں رہے مازنی نے جدید شاعری کو چھوڑ کر نثر نگاری اختیار کر لی، عقاد البتہ بڑی حد تک اس راہ میں آگے بڑھتے رہے، تجدید کی ایک دوسری تحریک امریکہ میں تارک وطن عرب شاعروں نے چلائی میخائیل نعیمہ نے "غربال" لکھکر جدید خیالات کی تائید کی، ان لوگوں کا

مقصد وہی تھا، جو "الدیوان" کے مصنفین عباس محمود عقاد، ابراہیم عبدالقادر مازنی کا تھا، ادب کے تمام اہم تقلیدی عناصر پر تنقید کر کے تقلید کے عیوب واضح کیے جائیں، "الدیوان" دس جلدوں میں شائع ہونے والی تھی مگر دو ہی جلدیں منظر عام پر آسکیں اگرچہ تجدید کے داعیوں نے اپنے خیالات کی ترتیب، اشاعت اور فکر کا کوئی مرکز قائم نہیں کیا، مگر چونکہ یہ وقت کی آواز تھی، اس لیے کامیاب ہوئی۔[۱]

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ تجدید کی دعوت کی کامیابی سے عربی شاعری کا قدیم مدرسۂ فکر ختم نہیں ہوا، گو اس کے اہم ارکان ختم ہو گئے، لیکن اب بھی عربی شاعری میں قدامت کے عناصر موجود ہیں، اس وقت بارودی شوقی، حافظ، عبدالمطلب اور جارم موجود نہیں ہیں مگر ان کے نغمے اب بھی جدید شاعری کی روح ہیں، اور ان کے اثرات محمد اسمر، محمود غنیم، علی الجندی، اور عزیز اباظہ وغیرہ کی شاعری میں آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں، بات یہ ہے کہ معنوی اشیاء میں تقلید کی عمر بہت طویل ہوتی ہے، اور اس کی جڑیں کافی مضبوط ہوتی ہیں۔[۲]

بہرحال جدید عربی شاعری کے ہر طبقۂ فکر میں چند ایسے بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں، جو مشترک ہیں، مثلاً حریت پسندی، وطن دوستی، وحدت ملت عربیہ، یہ جدید عربی شاعری کے وہ بنیادی عناصر ہیں جن کا وجود ہمیں قدیم شاعری میں نہیں ملتا، عربوں کا خیال ہے کہ انھوں نے آزادی کے لیے صدیوں سے جد و جہد جاری رکھی ترکوں کے دور کو وہ غلامی کا دور سمجھتے ہیں،[۳]

---

[۱] الشعر المصری بعد شوقی تالیف محمد مندور، ۱۹۵۵ء ص ۱۱، ۲، ۳۔ [۲] الشعر المصری بعد شوقی ص ۵،۰۵۔ [۳] دراسات ادبیۃ تالیف عمر الدسوقی ج ۲، ص ۱۲۰

مصر و شام آزادی کی جد و جہد میں بہت آگے رہے ہیں، یہاں کے شعراء و ادبا نے وطنیت کے جذبات کی بڑی درد انگیز ترجمانی کی ہے، شامی شعراء نے بھی اس وطنی شاعری میں نمایاں حصہ لیا، اور مغرب کی سیاسی مکاریوں کو واضح کیا،

تقسیم فلسطین کے سلسلہ میں نوجوان عرب شاعروں کے قومی و ملی احساسات کو ان اشعار میں ملاحظہ کیجئے، باکثیر کہتا ہے۔[۱]

قد بدأنا الكفاح وشحذنا السلاح

ہم نے جد و جہد شروع کر دی ہے، اور اپنے نیزوں کو تیز کر دیا ہے،

جب جمہوریہ عربیہ مصر و شام سے مل کر وجود میں آئی تو عرب شعراء کے جذباتِ وحدت ابھر آئے، عبد الغنی حسن کے چند اشعار اس سلسلہ میں ملاحظہ ہوں،

ايا ارض الكنانة قد تجلت لك الآفاق وانقشع القتام

اے ارض کنانہ، تیرے لیے آفاق روشن ہو گئے، اور اندھیرا چھٹ گیا۔

ولاحت في السماء خيوط فجر له في مطلع الشرق ابتسام

آسمان پر سحر کے آثار نمایاں ہیں مطلع مشرق اس سحر سے متبسم نظر آرہا ہے،

متحدہ عرب جمہوریہ نے جب زرعی اصلاح کے قوانین نافذ کئے اور کسانوں کے ساتھ مراعات روا رکھیں، اور انھیں زمینیں عطا کیں تو مصری شعراء نے اس تحریک اصلاح میں پورا حصہ لیا، چند اشعار ملاحظہ ہوں، احمد عبد الحمید الغزالی کہتا ہے[۲]

ايها النادمون في ظلمة الكوخ افيقوا على ائتلاق الصباح

اے جھونپڑی کی تاریکیوں کے پریشاں حال، بیدار ہو جاؤ، صبح نمایاں ہو گئی،

---

[۱] دراسات ادبیہ ص ۱۲۰ [۲] ایضاً ص ۱۳۲

طال فینا انتظاره ثم وافی — بعد مشرق علی مصر ضاحی

جس کا انتظار بہت طویل ہو چکا تھا پھر وہ صبح روشن مصر پر روشن دن لیکر آئی

عربوں کی عملی زندگی میں تو بہت اختلافات ہیں، باہمی اتحاد ہنوز ایک خواب ہی ہے، مگر جذبات خاص طور سے عرب شعرا کے یہاں ہر جگہ یکساں نظر آتے ہیں، وحدت ملت عربیہ ہر جگہ نمایاں ہے، مثلاً ایک مشہور شامی شاعر خیر الدین زرکلی مصر کی تعریف کرتا ہے کہ وہاں کے لوگوں نے شامیوں کی مدد کی اور ان کی آزادی کی جد وجہد میں وہ بھی برابر شریک رہے،[۵]

غضبت فتیة لسوریة الشهیدة — فی مصر تطفی غلة الامصار

مصر میں ایک جماعت "شام شہید" کے لیے غضب ناک ہوئی جو ممالک عربیہ کی پیاس بجھا رہی ہے یعنی مصر میں ایک جماعت نے شام پر مظالم کے خلاف آواز اٹھائی،

رعت لهاذم الوفاءلم یضع — عهد تسلسل فی ذمم الاعصار

وفا کے عہد کی اس نے رعایت کی اور خون کے زمانوں میں اپنے عہد پر قائم رہی،

جدید شعراء میں مصر سب سے آگے ہے پھر لبنان، شام اور عراق سامنے آتے ہیں عراق نے زہاوی ورصافی جیسے شاعروں کو جنم دیا، شام ولبنان نے ہجری شاعری کو پروان چڑھایا، مذکورہ تمام مباحث پر نظر ڈالنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ جدید عربی شاعری قدیم شاعری سے بہت مختلف ہے،

موضوعات شاعری بالکل بدل گئے ہیں، جدید شاعری کے بنیادی عناصر قومیت عربیت اور اسلامیت ہیں، مختلف ممالک کے عرب شعراء اپنے اپنے قومی ووطنی جذبات رکھتے ہیں، مگر تمام عربوں کو بھی مخاطب کرتے ہیں، اسلام کا ذکر بھی تقریباً

---

[۵] دراسات الادبیہ ص ۲۰۹

تمام شعراء کے یہاں ہے، مگر اس کے تصور میں کہیں کہیں مغربی خیالات کا عکس بھی نظر آتا ہے، بعض شعراء اسلام کو بحیثیت مذہب ایک ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں، عربوں کے اتحاد کی بنیاد عربیت کو قرار دیتے ہیں، اس سلسلہ میں وحدت جنس، وحدت زبان وحدت عقیدہ کا نام لیتے ہیں[1]

جدید تہذیب میں شام کا حصہ کچھ کم نہیں رہا، شام میں جدید عربی ادب نے غیر معمولی ترقی کی اور کئی ایسی اعلیٰ قسم کی علمی و ادبی انجمنیں وجود میں آئیں جنھوں نے سارے عالم عربی میں امتیاز پیدا کر دیا، جیسے شام کی "المجمع العلمی العربی" ان انجمنوں نے اور اشخاص نے انفرادی طور پر بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے، جدید رجحانات نے شام میں تین عناصر کو جنم دیا ایک قومی دوسرا وطنی اور تیسرا انسانی[2]

قومیت کے اثر سے شامی شعراء اور عام عرب شعراء نے اصلاح کا پیغام عام کیا اور اس سلسلہ میں تاریخ سے مدد لیکر آباء و اجداد کے کارناموں کو سامنے لائے، اور عربوں کا عہد زریں انھیں یاد دلایا، شیخ ناصف الیازجی کہتے ہیں،

لعمرک نحن مصدر کل فضل وعن آثارنا اخذ الانام

تیری عمر کی قسم ہم ہر فضیلت کا مرجع ہیں اور دوسروں نے ہمارے کارناموں سے سبق حاصل کیا ہے،

ونحن اولو المآثر من قدیم وان جحدت مآثرنا اللئام

اور ہم قدیم زمانہ سے صاحب آثار ہیں، اگرچہ کم ظرف لوگ ہمارے کارناموں کا انکار کیوں نہ کریں۔

---

[1] دراسات ادبیۃ ص ۱۰۲، ۱۱۱، ۱۱۰، [2] محاضرات فی الاتجاہات الفکریۃ فی بلاد الشام واثرہا فی الادب الحدیث، تالیف ڈاکٹر جمیل صلیبا ص ۲۰۔

عبدالرحمن ... کہتا ہے،

علیہ آثار ہم تذکارہا   یھب الضمائر قوۃ الایمان

اون کے ایسے آثار ہیں جنکا ذکر ضمیر کو قوت ایمانی بخشتا ہے۔

تاخر الاجیال فی اخبارہم   والشمس لا یحتاج الی برہان

ایسے کارنامے ہیں، جن کا ذکر کر کے قومیں فخر کرتی ہیں اور سورج کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا،

سلیمان تاجی فاروقی کہتا ہے،

انہضوا واحیوا حیاۃ عزیزۃ   حیاۃ تعید المجد للعرب ثانیا

اے بیٹو (اہل عرب) اٹھو اور ایسی با عزت و دستوں زندگی حاصل کرو جو عربوں کی عزت و حشمت کو دوبارہ واپس لے آئے،

خلیل مردم بک شام کی غلامی کا ذکر کر کے کہتا ہے،

اذا کانت حیاۃ المرء اسرا   فان الموت بالاحرار احری

جب انسان کی زندگی مقید ہو جائے تو پھر آزاد انسانوں کیلئے موت ہی بہتر ہے،

شفیق جبری اہل یورپ کے نعرۂ امن کا مذاق اڑاتا ہے اور کہتا ہے،

قالوا السلام وما اری   للسلم من ظل ممدد

لوگ کہتے ہیں امن لیکن میں امن کے سایہ کو لمبا نہیں پاتا۔

اخلاقی و انسانی قدریں بھی ان جدید شامی شعراء کے یہاں موجود ہیں، مثلاً

عبدالمطلب کہتا ہے،

کن رحیماً وانما الانسان   ذو القلب الرحیم

رحم دل بنو اس لیے کہ انسان وہی ہے، جو رقیق القلب ہو،

جدید شامی شعرا میں بعض تو اس قدر تجدد پسند ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کو من وعن اختیار کر لینے کو قوم کی ترقی کا راز سمجھتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ اگر کچھ جدید اور کچھ قدیم کو ملا کر کوئی تہذیب بنی تو وہ ناقص ہوگی۔ لیکن اس کے برعکس اعتدال پسند طبقہ کا خیال ہے کہ جدید و قدیم کی حسین آمیزش ہی ہماری عربیت و اسلامیت کو باقی رکھتے ہوئے ہمیں جدید مادی ترقی تک پہونچا سکتی ہے۔[1]

شام میں ایسے شعرا کا بھی ایک طبقہ موجود ہے، جو موروثی تقالید پر اعتقاد کامل رکھتا ہے۔ ان لوگوں کو "المحافظون" کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں، پہلا طبقہ تو وہ ہے جو قدیم اقدار حیات میں کسی تغیر کو ممکن نہیں سمجھتا، اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو مغرب کی غلط و صحیح ہر قسم کی تقلید کے انجام سے ڈرتا ہے۔[2] یعنی محتاط ہے، ادیب التقی کہتا ہے،[3]

یا ایھا الشبان احرقتم شبابکم بالامل المحترق

اے نوجوانو! تم نے اپنی جوانی کو ایک آتشین امید سے جلا ڈالا

ان قومی و ملی جذبات کے علاوہ دینی رجحان بھی شامی شعرا میں موجود ہے چنانچہ خلیل مردم بک عمر ابوریشہ اور انور عطا کے یہاں دینی جذبات بڑی وضاحت سے ہم کو ملتے ہیں، خیر الدین زرکلی، عدنان مردم بک وغیرہ نے بھی دین کو بنیادی اہمیت دی ہے، ایسے شعرا کے بہت قصائد خدا اور حضور انور صلعم کی شان میں موجود ہیں۔[4]

خلیل مردم بک کہتا ہے،

---

[1] الاتجاہات الفکریۃ فی بلاد الشام ص ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، [2] الاتجاہات الفکریۃ فی بلاد الشام ص ۱۲۹ [3] ایضاً ص ۱۲۷، ۱۲۸

سبحانک اللّھم انت اکبر　　　من ان یحیط بکنھک المتفکر

تو پاک ہے اے خدا، تو اس سے بہت بلند ہے کہ کوئی مفکر تیری کنہ کو پہونچ جائے

حار اللبیب وزاغ عنک المبصر　　　ونأى خاطئاً شھدہ المتدبر

عاقل حیرت زدہ ہے اور صاحب بصارت سے تو اوجھل ہے اور غور کرنے والے کی رسائی سے تو پرے ہے،

اقصى مدى فیک تحیر

آخری حد تیرے بارے میں تحیر ہے،

شفیق جبری حضورؐ کو مخاطب کر کے کہتا ہے،

بعثت الصفا فی عالم الارواح　　　وجنبتھا القلی والخصاما

آپ نے روحوں کو پاکی بخشی اور ان کو ناراضگی اور جھگڑے سے محفوظ کر دیا،

شعرائے عراق نے بھی عربی شاعری کے جدید رجحانات کو پوری طرح اپنایا، اور نئے خیالات کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا۔ ان شعراء میں دو شاعروں کو خاص امتیاز حاصل ہے، یعنی جمیل صدقی زہاوی اور معروف رصافی کو

جمیل صدقی زہاوی نے عربی شاعری کو اپنے بلند پایہ خیالات اور حریت پسندی سے مالا مال کر دیا۔ سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کے ہر ہر پہلو کو اس نے اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا، آزادی خیالی اور اصلاح امت عربی اس کی شاعری کے اہم پیغامات ہیں، غور و فکر کی دولت قدرت نے اس کو جی بھر کر عطا کی تھی، انھیں خیالات کی بلندی و پاکیزگی کی بنا پر عرب اسکو "فیلسوف" کہنے لگے[1] اگرچہ لوگ شوقی کو عصر جدید کا متنبی

---

[1] ملاحظہ ہو: الادب العصری فی العراق العربی قسم المنظوم المطبعۃ السلفیۃ بمصر ۱۹۲۳ء تصنیف [illegible]

کہتے ہیں لیکن فکری، نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو زہادی عصرِ جدید کا تبتنی تھا، اور اس کے یہاں فلسفیانہ افکار پائے جاتے ہیں۔ اس نے جو کتابیں نثر میں لکھی ہیں، وہ خاص طور سے غور و فکر کے لائق ہیں ان کتابوں میں زہادی نے طبیعیات کے بہت سے مسائل پر غور کیا ہے، اور نتائج اخذ کئے ہیں،

زہادی اس طرزِ شاعری کو پسند کیا کرتا ہے، جو عصرِ عباسی کی ترجمان تھی، طرزِ قدیم کو چھوڑ کر زہادی نے معاشرہ کی غلط روی، بے عملی و بے حسی، اور انحطاط پذیر سماج کی کمزوریوں کی نشان دہی کو اپنی شاعری کا مرکز قرار دیا، عورت جو سوسائٹی میں بہت مظلوم تھی، اس کے حقوق کے لیے زہادی نے اپنے کلام میں پرزور وکالت کی، اور اس سلسلہ میں بہت سی نظمیں لکھیں[1]

اس طرز کا دوسرا عراقی شاعر معروف الرصافی بھی قابلِ ذکر ہے، شاعرانہ صلاحیت کے اعتبار سے وہ زہادی سے بہت آگے تھا، لیکن وہ جدید علوم سے واقف نہ تھا ورنہ وہ دورِ جدید کے تمام شعراء پر سبقت لے جاتا[2]

وہ دورِ جدید کا ایسا شاعر ہے، جس کے کلام میں کسک ہے، درد ہے، اور امتِ اسلامیہ کا نوحہ ہے، عبدالحمید کے مظالم کے خلاف جو آواز رصافی نے اٹھائی ہے، وہ درد انگیز بھی ہے، اور جرأتِ رندانہ کی آئینہ دار بھی[3]

ٹریجڈی کے نقطۂ نظر سے رصافی کو دورِ جدید کے تمام شعرائے عرب پر امتیاز حاصل ہے، غم انگیز نظموں نے اس کی شاعری کو دل دوز و جگر سوز بنا دیا ہے، اسکے کلام میں محض اجتماعی زندگی کی عکاسی نہیں ہے، بلکہ معاشرہ کے نقائص کی نشاندہی

---

[1] الادب العصری ص ۹ [2] الادب العصری ص ۷۹ [3] الادب العصری ص ۶۰

کے ساتھ ایک خاص مصلحانہ شان بھی ہے، رصافی کی حقیقی شاعری بھی قابلِ ذکر ہے، اس میں انھوں نے بڑے اعلیٰ اور دقیق خیالات پیش کیے ہیں،

"ام الیتیم"، "الیتیم فی العید" اور "المطلقۃ" وغیرہ ان کی نظمیں حقیقی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں،[1]

دورِ جدید کا ایک اور عراقی شاعر شیخ عبد المحسن الکاظمی کی شاعری میں بھی بلندی، حریت اور صداقت نمایاں ہے، ترنم ان کی شاعری کا خاص امتیاز ہے، حافظ نے درحقیقت ترنم کاظمی ہی سے لیا ہے،[2] کاظمی کی شاعری کا اصل مرکز آزادیٔ ملّت اسلامیہ ہے، سید جمال الدین افغانی جب ایران سے جلاوطن ہو کر بغداد پہونچے تو کاظمی انکے خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور بعد میں محمد عبدہ کا بھی اثر پڑتا رہا، اس تاثر نے انکی شاعری کو ایک خاص آب و رنگ عطا کیا،[3]

ان تینوں کے علاوہ محمد حبیب العبیدی، رضا الشبیبی، خیری الہنداوی، کاظم الدجیلی، علی الشرقی، محمد الہاشمی، عبد الحسین الازدی، مہدی البصیر ابو المحاسن اور محمد السماوی وغیرہ بھی مشہور رہے، اگرچہ ان کا شمار درجۂ اوّل کے شعراء میں نہیں ہے،

عربی شاعری کے دورِ جدید میں شعراء دو مدرسہ ہائے فکر میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں، فکر کے یہ دونوں مدرسے پہلو بہ پہلو ہر جگہ عربی شاعری کے دورِ جدید میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں نظریہ ہائے فکر میں اصل فرق تجدید اور روشن خیال تقلید کا ہے بارودی، شوقی، حافظ اور اسمٰعیل صبری وغیرہ اگرچہ قدماء کے مقلد نظر آتے ہیں مگر یہ تقلید روشن خیالی پر مبنی ہے، اور بڑی حد تک یہ لوگ آزاد خیال ہیں اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عربی شاعری کی جدید روایتوں کو ان لوگوں نے توڑ کر

---

[1] الادب العصری ص ۶۹ [2] ایضاً ص ۹۰ [3] ایضاً ص ۹۰، ۹۱

سماج کی ترجمانی کی ہے زبان اور معانی دونوں لحاظ سے۔

دوسرا طرزِ فکر خالص مغربی ہے، جو اجتہاد و تجدد پر اپنے فکر کی بنیاد رکھتا ہے، اس مدرسۂ فکر میں بھی کئی گروہ ہیں۔

۱۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے، جنھوں نے عربی زبان و ادب کو پہلے خوب محنت سے حاصل کیا پھر مغربی علوم کا گہرا مطالعہ کیا اور زندگی کے ہر افکار و نظریات میں ان سے روشنی حاصل کی، اس طرز کے شعرا رنے خالص عربی اسلوب میں جدید خیالات کی ترجمانی کی جس میں عربیت کی شان اور عربوں کی بلاغت پوری طرح پائی جاتی ہے، عقاد، مازنی، شکری اور عبدالرحمٰن صدقی وغیرہ اس فکر کے حامل اور اس مدرسہ خیال کے ترجمان ہیں، یہ لوگ دو چیزوں میں ممتاز ہیں،

ایک تو یہ کہ ان کے افکار نے عربی شعر و ادب میں نفسیاتی نقطۂ نظر پیش کیا اور ادب کے متشابہ قالب کا خاتمہ کر دیا۔

دوسرا امتیاز ان شعراء کو یہ حاصل ہے کہ انھوں نے شاعری کو ایک پیغام بنا کر پیش کیا ہے، اور شعر و ادب کے اس طرز اسلوب پر ضرب کاری لگائی جس کا محور اشخاص ہوتے تھے، اور جس میں وہ شاعر سے زیادہ ندیم معلوم ہوتا تھا،

اس طبقہ نے مروجہ اصنافِ سخن کے علاوہ شاعری کو عام انسانی قدروں سے ہم آہنگ کیا، اگرچہ بعض شعراء پر فکر کا ایسا غلبہ ہو گیا کہ انکے کلام میں جذباتیت اور رقت باقی نہیں رہ گئی[1]

مجددین میں دوسری فکر کے شعرا وہ ہیں جن کے اندر عربیت مفقود ہے، وہ

---

[1] التجدید فی الادب المصری الحدیث ص ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵،

عربی اوزان اسالیب بیان اور صحت زبان سے بہت کم واقف ہیں، یہ دراصل نوجوانوں کا وہ طبقہ ہے، جس کی فکر کا سرچشمہ مغرب ہے، ان لوگوں کے یہاں زبان و بیان کی بہت سی خامیاں ہیں، بحور و اوزان سے تو بالکل ہی ناواقف ہیں۔[1]

جدید عربی شاعری کا یہ تغیر دراصل نظام حیات کی تبدیلی کا مظہر ہے، قدیم شاعری استقراطی انداز فکر کی علمبردار ہے، مگر جدید شاعری میں جمہوری روح جلوہ گر ہے نئی شاعری میں انسانیت، غم گساری، دبے ہوئے طبقہ کی حمایت اور اعلیٰ اقدار حیات کی ترجمانی ملتی ہے، اس میں دعوت حریت و استقلال پورے آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے، اسکے اندر مظالم کے خلاف صدائے احتجاج اور معاصی کے خلاف اعلان جہاد ہے، جدید عرب شعراء نے مغربی استعمار کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، اس کی تعداد ہزاروں صفحات سے زیادہ ہے، اس کے مظالم کے بیان سے دواوین کے دواوین پڑے ہیں، انھوں نے استعماری طاقتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے ساتھ مغرب کی جمہوری اقدار کو اپنانے کی تلقین بھی کی، اس طرح عربی شاعری رفتہ رفتہ امیروں کی بارگاہ سے نکل کر غریبوں کی جھونپڑی تک پہونچنے لگی۔ شوقی زندگی کے پہلے مرحلہ میں شاہی شاعر تھے، مگر بعد میں قومی شاعر بنے۔ طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ کاش شوقی کو قصر کی ملازمت نہ ملی ہوتی تو ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ ضائع نہ جاتا، حافظ نے اتنی فنی بلندی تو حاصل نہ کی مگر ان کے یہاں عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے غیر معمولی تعلق محسوس ہوتا ہے،

جدید عربی شاعری میں آزاد نظمیں کثرت سے لکھی گئیں مگر ان کے اندر اعلیٰ افکار پیش نہ کئے جا سکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جانب زکی ابوشادی کے بعد کوئی دوسرا شاعر

---

[1] التجدید فی الادب المصری الحدیث طبقہ اولیٰ دار الفکر العربی تالیف عبد الوہاب حمودہ ص ۱۳۷،

متوجہ نہ ہوا اگر کوئی صاحب فن اور عظیم المرتبت شاعر اس جانب توجہ کرتا تو یقیناً شاعری کا یہ پہلو بھی ترقی کرتا، ہاں شعرائے مہجر اور شعرائے لبنان نے اس جانب کسی قدر توجہ کی، آزاد نظموں کا خاصا ذخیرہ تیار ہو گیا، مگر اس میں بلندی کی کمی ہے، ایک ناقد نے صحیح لکھا ہے کہ عربی شاعری غنائیت پر مبنی ہے، آزاد و مرسل شاعری میں غنائیت بہت کم پائی جاتی ہے، اس لئے عربوں کے ذوق سخن کو اس سے تسکین نہیں ہوتی، وہ شعر کی تعریف الکلام الموزون المقفع سے کرتے ہیں، بقول مصطفیٰ لطفی منفلوطی بے وزن شاعری عاجزی کی دلیل ہے، بہرحال عربی شاعری میں یہ صنف زیادہ مقبول نہیں ہے، لیکن بہت سے جدید شعراء اس پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں،

محمود گاواں

بہمنی دور کا ایک عظیم وزیر

از ڈاکٹر محمد ظفر الہدیٰ سابق استاذ ڈھاکہ یونیورسٹی

"ڈاکٹر محمد ظفر الہدیٰ کے ایک انگریزی مقالہ کا ترجمہ جناب سلطان احمد صاحب ڈھاکہ نے کیا ہے" (معارف)

محمود گاواں کی ہجرابتدائی زندگی

خواجہ امام الدین محمود بن جلال الدین محمد بن، خواجہ کمال الگیلانی[1] معروف بہ محمود گاواں بحیرۂ قلزم کے جنوبی ساحل پہ واقع حکومت گیلان کے شہر گاواں[2] میں تقریباً ۸۱۳ھ ۱۴۱۱ء میں پیدا ہوا، اس کا خاندان گیلان کے سربرآوردہ خاندانوں میں تھا، اس کے اسلاف گاواں کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ لفظ گاواں اس کے نام کا جزو بن گیا۔ خود اس کا بیان[3] ہے کہ اس کے اسلاف اعلیٰ عہدوں پہ فائز تھے، حکمراں خاندان سے اسکی قرابت داری بھی تھی[4]

---

[1] مورخ فرشتہ نے امام الدین نام لکھا ہے، (جلد اول صفحہ ۳۵۸) اس کے باپ کا نام مطلع سعدین میں جلال الدین لکھا ہے (دیکھئے رسالہ "اسلامک کلچر" جلد سیزدہم جولائی ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۰۰، ہارون خان شیروانی کا مقالہ "محمود گاواں کی ابتدائی زندگی اور گیلان سے اس کا رشتہ")

صاحب برہان آثر نے اس کا نام نجم الدین لکھا ہے (صفحہ ۹۸) مناظر الانشاء ورق ایک ب) میں اپنا نام محمود بن شیخ محمد گیلانی بتایا ہے، [2] قاواں کی جگہ گاواں زیادہ مروج اور مستعمل ہے (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۸) [3] سخاوی کی تصنیف جلد دہم صفحہ ۱۴۴ تاریخ فرشتہ

(بقیہ حاشیہ آگے ص پر)

علاوہ ازیں ان میں سے کچھ ملک کے وزیر بھی رہ چکے تھے، اس کا یہ بھی بیان ہے کہ ایام جوانی ہی میں اسے اعلیٰ عہدے پر پہنچنے کی تمنا تھی،[۵۱]

اس کو اپنے ہی ملک میں امتیازی مقام حاصل کرنے کے مواقع تھے، لیکن اسکا دوش نازک اعلیٰ عہدے کا بار نہ برداشت کر سکا[۵۲] اور اپنے خلاف چند بدنامیوں اور سازشوں سے بددل ہوکر اس نے خود ہی جلاوطنی اختیار کرلی اور اپنے اسلاف کا ملک چھوڑ دیا۔

اس نے اپنی اس بیچارگی کا اظہار ایک قصیدہ میں کیا ہے جسے اس نے بہمنی خاندان کے حکمران ہمایوں شاہ کی مدح میں لکھا تھا،

بندہ را حالیست کان از حضرت نتوان نہفت	از سر لطف کرم یک لحظہ حالم گوش دار
علت غائی زہندم نیست الا خاک پات	ورنہ بے آب بقا در ظلمت آدم چہ کار
شد بجائے خود مرا ساکن شدن درہند ازانکہ	مردم دیدہ بنا شد ساکن الاجائے تار
ایں زمانہ یک مرادست از تو اے کان کرم	گرنشد آں حاصل از تو جان کند از تن فرار
گوشۂ خواہم کہ گردم منزوی از کل کون	واں گہے آرم بخاک کوئے وحدت افتخار
غیر ازیں گر باشدم مقصود اصلی در جہاں	چشم دل از کثرت موہوم بادا پُر غبار

(بقیہ ص ۴۴۴) (جلد اول ص ۵۰۳) کے مطابق اس کا سال پیدائش ۸۱۳ھ ہونا چاہئے اسکی وفات ۷۰ برس کی عمر میں ۵ رصفر ۸۸۶ھ مطابق ۵ راپریل ۱۴۸۱ء میں ہوئی۔ اس سلسلے میں سخاوی کا قول زیادہ معتبر ہے کیونکہ محمود گاواں کا ہم عصر ہے علاوہ ازیں مورخ فرشتہ نے سید عبدالکریم ہمدانی کا قول نقل کر دیا ہے جسکی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔

[۵۱] ریاض الانشاء ص ۹

[۵۲] ریاض الانشاء دوش عرش این ضعیف از احتمال ثقال وزارت مجتنب بود

محمود گاواں ملک التجار | محمود گاواں نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء[۱] میں وہ دابل آیا، یہاں سے دکن کے عروس البلاد محمد آباد بیدر روانہ ہوا۔ ایک غیر ملک میں سفر کے دوران اس نے اپنے آپ کو عزم محکم اور زبردست قوت ارادی کا حامل ثابت کیا۔ بیدر میں وہ شاہ نعمت اللہ کرمانی[۲] کے خلف شاہ حبیب اللہ کے قدموں میں رہنے کا خواہشمند تھا، لیکن اس کے اندازہ کے برخلاف دکن کے بادشاہ علاء الدین احمد دوئم (۸۳۹-۶۲ھ/۱۴۳۶-۵۸ء) نے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہاں اسے ایک ہزار سوار کی کمان سونپی گئی، اور دربار میں ایک عہدیدار کی حیثیت[۳] سے افسر مقرر کیا گیا۔ پھر اسے جلال خان کی بغاوت فرو کرنے کے لیے تلنگانہ بھیجا گیا، اس مہم کی کامیابی سے اس کے لیے عزت و شہرت کے دروازے کھل گئے۔ اس کا شمار اونچے طبقہ کے امراء میں ہونے لگا۔ احمد شاہ دوئم کی وفات کے بعد اس کے جانشین ہمایوں شاہ (۸۶۲-۶۵ھ/۱۴۵۷-۶۲ء) نے ۸۶۲ھ میں[۴] ملک التجار کے خطاب سے نوازا۔

محمود گاواں۔ خواجہ جہاں | محمود گاواں کے دل میں ان دونوں بادشاہوں کی محبت و تعظیم کا جذبہ موجزن تھا، گیلان کے سلطان کے نام ایک خط میں اس نے علاء الدین کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: "مرحوم بادشاہ کی خوبیوں کے مرہم[۵] نے وطن سے ہجرت کے زخم بھر دیئے" اسی خط میں اس نے ہمایوں شاہ[۶] کی بھی خوب خوب تعریف کی ہے، جس نے گاوان کی

۱؎ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰۔ گاوان جب ہندوستان آیا اسوقت اس کی عمر ۴۳ سال تھی، ۲؎ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰۔ ۳؎ ریاض الانشاء صفحہ ۱۲۱ مکتوب نمبر ۲۹ میں لکھا ہے: "محمود المخاطب من حضرت الخلافہ بہ ملک التجار"۔ ۴؎ ریاض الانشاء صفحہ ۱۰۲۔ ۵؎ ہمایوں شاہ کی مدح میں لکھے گئے قصیدے کا پہلا شعر بھی ملاحظہ فرمائیے:

عین عمرم کز غبار غربت و غم بود تار   شد کنوں روشن ز کحل خاک پائے شہریار

سپہ سالاری اور ملکی انتظام کی صلاحیت کا معترف ہو کر اسے ذمہ دارانہ اور حاکمانہ عہدے پر مامور کیا، ہمایوں شاہ نے وصیت کی تھی کہ اس کے لڑکے نظام الدین[1] احمد سوئم (۸۶۵-۸۶۶ھ / ۱۴۶۱-۶۲ء) کی صغر سنی میں اسکی قائم مقامی کرے گاواں نے ایک دوسرے قائم مقام ملک شاہ ترک کے ساتھ مل کر نابالغ بادشاہ کی والدہ مخدومۂ جہاں نرگس بیگم کی براہ راست نگرانی میں حکومت کے کام انجام دیئے، ملک شاہ ترک کی خود پسندی اور اسکے دوسرے عزائم کی وجہ سے ملکہ کے دل میں شکوک پیدا ہوئے، انجام کار اسے قتل کر دیا گیا، بعد میں ملکہ خود بھی نگرانی کے فرائض سے سبکدوش ہو گئی، اس کے بعد محمود گاواں اب خواجۂ جہان بن گیا۔[2]

ہم وطنوں کی تلخ یادوں کے باوجود اسے اپنے وطن سے محبت تھی، اور وہ اس سرزمین سے کسی نہ کسی طرح تعلقات قائم رکھنے کا خواہشمند تھا، لیکن جب سلطان گیلان نے اسے وطن واپس آنے کی دعوت دی تو اس نے بڑے احترام سے جواب دیا "بہمنی دور کے حکمرانوں کی عنایات سے وہ اسقدر زیر بار ہو گیا ہے کہ وہ ہندوستان چھوڑنے کی خواہش بھی نہیں، کر سکتا، اسکی فرض شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے آخری دنوں تک ان کی خدمت کرتا رہے"[3]،

محمود گاواں بہمنی سلطنت کا عملاً حاکم بن گیا،

بہمنی سلطنت میں محمود گاواں نے قابل رشک حیثیت حاصل کر لی، وہ عملاً حاکم بن گیا، یہی چیز اس کی المناک موت کا باعث بنی۔ ریاست میں اسکی اعلیٰ حیثیت، اسکی ملکی اور فوجی اصلاحات کا اثر دوسرے امراء کے

---

[1] ریاض الانشاء صفحہ ۱۰۲۔ [2] بہمنی دور کا یہ سب سے بڑا خطاب تھا،

[3] ریاض الانشاء صفحہ ۱۰۳۔

وفاداری مرتبہ پر پڑا جس کے باعث اس کے بہت سے دشمن پیدا ہوگئے تھے وہ بذات خود جماعتی سیاست[1] سے بلند تھا۔ وہ حکمران خاندان اور اپنے نئے وطن کی خدمت پوری وفاداری سے کرتا رہا لیکن اس کے دشمنوں نے اسے بدنام کرنے کی مہم چلائی، محمود گاواں اس سے بے خبر نہ تھا۔ ایک خط میں وہ لکھتا ہے، اس کے مخالفین[2] نے اس کے خلاف حاسدانہ مہم چلا رکھی ہے، اور وہ دشمنی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں کہ خود بادشاہ[3] کے کان بھرنے لگے ہیں، لیکن وہ اپنی وفاداری اور خلوص کی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ اور سلطنت کا وفادار رہا،

محمود گاواں کی المناک موت

محمود گاواں نے جو مرتبہ اور قوت حاصل کر لی تھی اس سے خود بادشاہ خوف زدہ تھا[4]۔ دشمنوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اور اس کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا کہ محمود گاواں خود بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے[5]۔

ایک دن جب کہ بادشاہ نشہ میں چور تھا، دشمنوں نے اس کے سامنے اڑیسہ کے رائے کے نام گاواں کا ایک جعلی خط پیش کر دیا۔ اس خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ گاواں نے اسے بہمنی سلطنت پر حملہ کرنے کی دعوت دی ہے، نشہ میں مخمور بادشاہ نے اسی وقت گاواں کو طلب کیا، اور کسی تحقیق کے بغیر اس کی موت کا حکم صادر کر دیا، اسطرح ۵ صفر ۸۸۶ھ مطابق ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو اس عظیم مدبر اور عالم[6] کی تابناک زندگی کا

---

[1] ریاض الانشا، ص ۲۹۸، [2] ایضاً ص ۲۷، [3] تصنیف سخاوی جلد دہم صفحہ ۱۴۵ برہان مآثر ص ۱۲۶ [4] محمود گاواں کے ایک قصیدہ کے یہ اشعار ملاحظہ کریں

[5] رخسارہ عالیم روشن چو خور بود لیک | اعمی است چشم حاسدانہ دیدن دلائل

اما بہ پیش یارب جز چاکری و اخلاص | چیزے دگر نہ دارد ایں بندہ را وسائل

[6] سخاوی جلد دہم، ص ۱۴۵، برہان مآثر ص ۱۲۵-۱۳۲، تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۵۰، مرات سکندری ص ۱۱۵۔

خاتمہ ہوگیا۔ اس کی زندگی کا یہ المناک انجام اس کے قصیدہ کے مندرجۂ ذیل اشعار کی یاد دلاتا ہے۔ یہ قصیدہ اس نے دس برس پہلے محمد شاہ کی شان میں لکھا تھا

شدہ تشکل[له] ضرب تیغت بر دوش دل حائل	ہیکل زحرز سیفی دانگہ ہراس اے دل
تیغ تو آب حیواں مردم زحسرت آں	آرے بعہد من شد آب حیات قاتل

گاواں کی موت پر بادشاہ خود سوگ مناتا ہے،

گاواں کے قتل کی دل خراش خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، اس کی موت پر سارے ملک میں سوگ منایا گیا۔ صاحبؔ الضوء اللامع سخاوی لکھتا ہے، کہ اس نے یہ خبر مکہ میں سنی جہاں تعزیتی جلسہ کیا گیا، اور اس المناک واقعہ پر غم و ہمدردی[۵۲] کا اظہار کیا گیا، خود سلطان محمد شاہ کو اپنی اس غیر دانشمندانہ حرکت پر ندامت تھی، جس کی وجہ سے اسے ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ مورخ فرشتہ کہتا ہے کہ بالآخر اسی صدمہ نے بادشاہ کی جان لے لی۔[۵۳] گاواں کی موت سے عوام میں اس قدر ہیجان پیدا ہوگیا تھا کہ اسے سرد کرنے کے لیے بادشاہ کو ایک جھوٹا اعلان جاری کرنا پڑا جس میں عوام کے اطمینان کے لیے ان اسباب کا تفصیلی ذکر تھا، جو گاواں کی موت کا باعث[۵۴] بنے، یہ اعلان گاواں کی تعریف و توصیف سے بھرا ہوا ہے،

گاواں کے اخلاق و عادات

گاواں سچا مسلمان، اپنے بادشاہ کا وفادار، شائستہ مزاج اور نرم خو تھا

---

[۵۱] برہان مآثر صفحہ ۱۲۹۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰ ریاض الانشا صفحہ ۵۰-۱۴۶
یہ قصیدہ اس نے خلاق معنی کمال اسمٰعیل کے اس قصیدہ کے نمونہ پر لکھا ہے جس کے دو شعر مندرجہ ذیل ہیں

شد تشکل ضرب تیغت بر دوش دل حائل	ہیکل زحرز سیفی دانگہ ہراس اے دل
برگردنم ز تیغت طوقیست پر جواہر	زیں طوق گردن جاں ہرگز عباد عاطل

[۵۲] سخاوی جلد دہم صفحہ ۱۴۵ [۵۳] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۱ برہان مآثر صفحہ ۱۳۲
[۵۴] ایضاً صفحہ ۳۲-۱۳۰

اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچنے کے باوجود اس نے سادہ اور پاکیزہ زندگی گذاری۔ طاقت یا دولت کا حصول اس کی زندگی کا مقصد نہ تھا، وہ امیر، غریب، بادشاہ، درویش سب کا یکساں دوست تھا، اس نے ایک خط میں لکھا ہے، اس کا ایمان تھا کہ "مقاصد کے حصول کا انحصار فہم و فراست پر، اعلیٰ مرتبہ کے حصول کا انحصار علم پر اور کردار کی پاکیزگی کا انحصار طرز زندگی پر ہے[1]

گاواں اپنے عہد کی ممتاز شخصیت

مورخین اس کی فیض رسانی فنون لطیفہ اور ادب کی سرپرستی کے رطب اللسان ہیں، اس کی شخصیت اپنے عہد کی نمایاں شخصیت تھی، اس کے ہم عصروں پر اس کا اثر گہرا اور دیرپا تھا، اس کے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ساری دنیا اس کی عزت کرتی تھی۔ اس کی نرم خوئی۔ خاکساری، خلوص، تقدس اور پاکیزگی نے سبھوں سے خراج تحسین وصول کیا۔

علماء سے گاواں کے تعلقات

ہمعصر علماء سے اس نے یا تو خود ملاقات کی یا خط و کتابت کے ذریعہ شناسائی پیدا کی، سخاوی لکھتا ہے کہ "محمود گاواں نے شیخ بخاری (محمد بن محمد بن محمود شمس الحنفی) سے قاہرہ میں ملاقات کی اور ان سے کچھ ہدایات حاصل کیں۔ اس نے زین الزرکشی سے صحیح مسلم سنا۔ اس نے شام کے کچھ ایسے علماء سے ملاقات کی جو علم کی کسی نہ کسی شاخ کے ماہر تھے[2]، اسے خواجہ خواجگان عبید اللہ، شیخ بایزید امام صدر الدین رواسی اور مولانا جامی سے بڑی عقیدت تھی[3] ان کا ذکر اس نے اپنی کتاب ریاض الانشاء میں بھی کیا ہے، اس نے مولانا جامی کو ہندوستان آنے کی بار بار دعوت دی، جو قبول نہیں کی گئی، ناامید ہو کر اسنے

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۰۔ ریاض الانشاء صفحہ ۲۴۳ مکتوب نمبر ۵

[2] ایضاً جلد اول صفحہ ۳۵۵ [3] سخاوی دہم ص ۱۴۲ [4] ریاض الانشاء ص ۲۳، ۸۰، [5] ایضاً

یہ شعر کہا۔[۵]

لن ترانی می رسد از طور موسیٰ را جواب — ایں ہمہ فریاد مشتاقان ز استغنائے اوست

کچھ ممتاز عالموں کو اس نے اپنے مدرسہ میں درس و تدریس کے لیے بیدر بلایا تھا، جلال الدین[۶] دوانی، اور ابو بکر تہرانی کو بھی[۷] اس نے دعوت دی تھی، لیکن وہ ہندوستان نہ آسکے۔

علماء بھی اس کی بڑی تعظیم کرتے تھے، جلال الدین دوانی نے شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور کتاب ہیاکل النور[۸] کی شرح شواکل الحور کو اظہار تعظیم کے طور پر گاوان کے نام سے معنون کیا ہے، مولانا جامی نے اپنی کتاب شرح فصوص الحکم کی ایک کاپی اسے تحفۃً ارسال کی تھی، محمود گاوان اور مولانا جامی کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی، ان خطوط کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے کس قدر عزت تھی،[۹] مولانا جامی نے گاوان سے اپنے تعلق کا اظہار اشعار میں بھی کیا ہے، انھوں نے ایک قصیدہ گاواں کی مدح میں لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے:[۱۰]

مرحبا اے قاصد ملک معانی مرحبا — الصلا کز جان و دل منزل تو کردم الصلا

مزید وہ کہتے ہیں[۱۱]

ہم جہاں را خواجۂ او ہم فقر را دیباچہ او — ملت سر الفقر لکن تحت استار الغنا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۳) [۵] ریاض الانشاء ص ۲۳۱ [۶] ایضاً ص ۲، ۸، ۱۰، ۲۰، ۱۰۲، ۳، ۴۰۵ اور ۳۹۵ مزید دیکھیے ص ۲۳۱

مردم چشمی و بے مردم نہ دارد خانہ نور — مردمی فرمائے و روشن کن سرائے چشم من

[۱] ایضاً ص ۳۰۳، مکتوب نمبر ۱۰۲ [۲] ایضاً ص ۱۲، ۱۷۲، ۱۰ [۳] ایضاً ص ۹، ۱۰۵، ۱۷

[۴] کشف الظنون جلد چہارم ص ۵۰۵ [۵] ریاض الانشاء ص ۴۷۵ [۶] تاریخ فرشتہ ج اول ص ۳۵۰ [۷] تاریخ فرشتہ ج اول ص ۳۵۰، کلیات جامی ص ۵۳ (سال طبع ۱۹۱۲ء) [۸] کلیات جامی ص ۵، مطبوعہ نولکشور پریس سال طبع ۱۹۱۲ء "الفقر تحت استار الغنا" مورخ فرشتہ (ج اول ص ۳۵۰) نے دوسرا مصرع لکھا ہے،

اس کے علاوہ انھوں نے ایک قطعہ بھی اس کی تعریف میں کہا ہے[۱]

جامی اشعار دل آویز تو جنسے است لطیف	بود شاں از حسن بود لطف معانی تارش
ہمرہ قافلہ ہند روان کن کہ رسد	شرف و عز و قبول از ملک التجارش

محمود گاواں کا علم و فضل گاواں نہ صرف ایک عظیم مدبر، بہادر سپاہی اور کامیاب حکمراں تھا، بلکہ دنیائے علم و ادب میں بھی اس کا مرتبہ قابل رشک تھا، وہ بڑا عالم بھی تھا، علم ریاضی اور طب[۲] میں اسے خاص دسترس حاصل تھی، صاحب برہان مآثر اسکی دانشمندی کا معترف ہے، گاواں کے کام اور صلاحیت کی مبالغہ آمیز تعریف اسے یوں کی ہے:

"وہ دنیا کے تمام عالموں اور دانشوروں سے افضل تھا"[۳]

محمود کو نظم و نثر دونوں پر مہارت حاصل تھی، علم ریاضی اور خطوط نویسی میں اس کا جواب نہیں تھا۔[۴] وہ مختلف علم و فن کے ماہروں کا مرکز نگاہ تھا، ملا الکریم ہمدانی کو اس سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے اس کی سوانح حیات لکھکر اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے،[۵] ملا شمس الدین[۶] اس کے ہم نشینوں میں تھے، شاعر سامی کو بھی اس کی سرپرستی حاصل تھی، ان عالموں کے علاوہ، علماء و فضلاء کی ایک جماعت اس کے زیر سایہ تھی، محمود گاواں نے اپنے ایک خط[۷] میں لکھا ہے "سلطنت دکن آسمان میں آفتاب کی طرح ہے"[۸] اور ملک کا جو حصہ بہمنی سلطنت کے زیر اثر آیا وہ "خدا شناسوں کا مسکن اور علماء کی پناہ گاہ بن گیا"[۹] ۸۷۷ھ میں اس نے بیدر میں ایک مدرسہ کی بنا ڈالی تھی، اور اسکے تحت

---

[۱] کلیات جامی ص ۵۰ [۲] تاریخ فرشتہ ج اص ۳۵۵ [۳] تاریخ فرشتہ ج اول ۳۵۵ کلیات جامی مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۱۲ء ص ۲۶۳
[۴] برہان مآثر ص ۱۳۲ [۵] ایضاً ۱۳۲ [۶] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۵۹ [۷] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۵۸ [۸] ریاض الانشار ص ۱۲۱، ۱۲۰ مکتوب نمبر ۲۰ [۹] ایضاً الانشار ص ۹۲ [۱۰] ایضاً [۱۱] ایضاً ص ۱۶

ایک کتب خانہ بھی قائم کیا تھا، کتب خانہ میں کتابیں ہزاروں[1] کی تعداد میں تھیں۔ درس وتدریس کے لئے منفرد اوصاف کے حامل معلمین کا انتظام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ فرصت کے اوقات وہ خود بھی مدرسہ میں پڑھایا کرتا تھا[2]۔ اس تعلیمی ادارے نے بعد میں بڑی شہرت حاصل کی۔

ادب میں محمود گاواں کا حصہ | محمود گاواں نے نہ صرف خوبصورت عمارتیں تعمیر کرائیں، تعلیمی ادارے قائم کئے، فوجی اور تمدنی نظام میں انقلاب لایا، عظیم بہمنی سلطنت کو استحکام بخشا بلکہ اس نے ایسے ادبی شہ پارے بھی چھوڑے ہیں جو ابد تک اس کا نام زندہ رکھیں گے، یہ درج ذیل ہیں۔

(الف) مناظر الانشاء :- یہ کتاب خطوط نویسی اور انشاپردازی پر لکھی گئی ہے، اس میں علم فصاحت، علم عروض اور علم صنائع کا خاص طور سے تذکرہ کیا گیا ہے،

(ب) ریاض الانشاء :- یہ اس کے ۱۴۸ خطوط کا مجموعہ ہے، اس نے اسے خود ہی ترتیب دیا ہے، خود اسکا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی کتاب میں شامل ہے۔

ڈاکٹر غلام یزدانی نے اسے ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد دکن سے شائع کر دیا ہے۔

(ج) دیوان :- اس کے قصائد اور غزلوں کا مجموعہ ہے، اس دیوان کا اب سراغ نہیں ملتا مگر معلوم ہوتا ہے کہ مورخ فرشتہ[3] نے اسے ۱۰۲۳ھ سے پہلے دیکھا تھا،

(الف) مناظر الانشاء :- یہ ایک مقالہ ہے اور فن انشاء پردازی پر لکھا گیا ہے؛

---

[1] برہان مآثر صفحہ ۱۳۲، تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰، آثار خیر مصنف ابوسعید احمد صفحہ ۲۶ تا ۲۷، سیرت محمود صفحہ ۱۱۵، ۱۲۰ اور ۱۲۲ [2] سیرت محمود صفحہ ۴، [3] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰

یہ مقالہ ایک مقدمہ[۱]، دو مقامہ[۲] اور ایک خاتمہ[۳] پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں انشاء پردازی کی اہمیت اور موضوع پر بحث ہے۔

پہلے مقامہ میں فن انشاپردازی کے لحاظ سے کلام کے اقسام، الفاظ کے انتخاب اور اصول سے بحث ہے، دوسرا مقامہ مکتوباتی انشاء پردازی کے مختلف اسلوب اور ان سے متعلق قواعد پر مشتمل ہے۔ مناظر الانشاء کا اختتام علم ہجا کے باب پر ہوتا ہے۔

یہ کتاب عربی کی متعدد تصنیفوں کی مدد سے لکھی گئی ہے۔ محمود گاواں نے فارسی زبان کے مطابق مواد ڈھال لیے ہیں اور مثالیں بھی فارسی ہی کی پیش کی ہیں۔

محمود گاواں نے انشاء پردازی کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ "وہ فن ہے جو تراکیب منثورہ اور خطب و رسائل[۴] کے حسن و قبح کو پرکھتا ہے"۔ اس نے حسن کلام، فصاحت اور اس کے لوازم پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ وہ صنائع و بدائع پر بحث کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ کب اور کس ساخت کا کلمہ یا فقرہ فصیح ہوتا ہے۔ اس نے اپنے نقطۂ نظر کے ثبوت میں مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ مثالوں میں کبھی وہ اپنی ہی تحریر سے حوالے دیتا ہے، اور کبھی عربی اور فارسی کے بلند مقام شاعروں کے حوالے لاتا ہے۔ اس نے کتاب میں بادشاہوں کی حکایات اور لطائف و ظرائف کو بھی جگہ دی ہے۔

اس کتاب سے اس زمانہ کی انشاء پردازی پر روشنی پڑتی ہے۔ محمود کے قول کے مطابق انشاء پردازی کے چودہ[۵] ارکان اور پندرہ شرائط ہیں[۶]، جن کا عام خط لکھتے وقت بھی

۱؎ مناظر الانشاء، شبلی اکیڈمی خطوطہ نمبر ۴۰۔ ورق ایک اور دو الف ۲؎ ایضاً ورق ۲ الف تا ۳۲ الف اور ۳۲ الف تا ۳۱ الف، ۳؎ ایضاً ورق ۳۱ الف تا ۴۰ الف ۴؎ مناظر الانشاء شبلی اکیڈمی مخطوطہ نمبر ۴۰ ورق ۱۱ ب ۵؎ ایضاً ورق ۳۲ ب تا ۴۲ الف ۶؎ ایضاً ورق ۴۰ الف تا ۴۹ ب

برتنا ضروری ہے،

ان حد بندیوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تحریر فطری باقی نہیں رہتی۔ پھر بھی یہ وہ حد بندیاں ہیں، جن کے بغیر تحریر میں دلکشی نہیں آتی۔ مسلمانوں نے اس فن میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ ایک عام قاری بھی مرصع نثر کو اس کے تمام غیر فطری عناصر کے باوجود فطری ہی سمجھتا تھا، زمانہ قبل اسلام میں عربوں کا فطری رجحان مرصع اور مسجع نثر نگاری کی طرف تھا۔ اس زمانہ کے مشہور مقرروں کی تقریروں کے نمونے آج بھی محفوظ ہیں، جو مرصع اور مسجع ہیں۔ عباسیوں نے اس فن کو اور بھی پروان چڑھایا تھا، ان کے زمانہ میں اس فن میں استعداد رکھنا کامیابی اور اعلیٰ مقامی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ کے وزرا اور معتمد (سکریٹری) اس فن کے ماہر ہوتے تھے۔ ان میں چند ممتاز شخصیتوں کے نام یہ ہیں، الخصیبی، ابن مقلہ، المہلبی، ابن العمید، صاحب بن عباد، الاسکافی۔ ان کے خطوط کے مجموعوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہے، ان کے علاوہ ابوبکر الخوارزمی، ابن المعتز، الہمدانی اور ابن الحمید چند دوسری ممتاز شخصیتیں ہیں جو اس فن کے ماہر تھے یہ مقولہ مشہور ہے کہ اس فن کی ابتدا العمید نے کی اور اختتام ابن الحمید پر ہوا "بدات با بن العمید وختمت با بن الحمید"

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں یہ فن اپنے عروج پر تھا، اس زمانہ میں خود اس فن پر کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے ایک کتاب "التوسل فی صناعۃ الترسل" جامع اور مشہور کتاب ہے، نویں صدی ہجری میں القلقشندی نے "صبح الاعشیٰ فی معرفۃ الانشاء" لکھی جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے، اسی کتاب کو اس فن کا انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا ہے اسی زمانہ میں محمود گاواں (۸۱۳ھ تا ۸۸۶ھ) نے ہندوستان میں

خطوط نویسی کی طرف توجہ دی اور اپنے خطوط کا مجموعہ "ریاض الانشاء" شائع کیا، جس کا ذکر آگے آتا ہے، اس نے مناظر الانشاء میں اس فن کے اصول و قواعد منضبط کئے جو ہندوستان کے فارسی ادب کا قابل قدر حصہ ہے، یہ کتاب اگرچہ ریاض الانشاء کے بعد لکھی گئی ہے، مگر اس مقالہ میں اس پر ریاض الانشاء سے پہلے بحث کی گئی، کیونکہ خود مصنف نے اسے ریاض الانشاء کا مقدمہ کہا ہے۔ اس نے لکھا ہے[1] کہ اگر زندگی نے مہلت دی تو وہ ریاض الانشاء کے مقدمہ کی شکل میں فن انشاء پردازی پر ایک کتاب لکھے گا، اور اس میں ان نکتوں سے بھی بحث کرے گا جن کا تعارف بلغاء پہلے بھی کرا چکے ہیں، اور وہ کتاب علم و فن کی نئی راہیں نکالے گی،

(ب) ریاض الانشاء[2] یہ محمود گاواں کے خطوط کا مجموعہ ہے، اس میں اس کے ذاتی خطوط کے علاوہ چند وہ خطوط بھی شامل ہیں جو اس نے بہمنی سلطنت کی طرف سے لکھے تھے، یہ کتاب اس نے خود ترتیب دی ہے، مورخ فرشتہ نے اس کا نام روضۃ الانشاء لکھا ہے، جو غلط ہے[3]، ریاض الانشاء ڈاکٹر غلام یزدانی حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۸ء میں شائع کر چکے ہیں، اس میں شیخ چاند بن حسین بی۔ لٹ (آکسن) کی تصحیح اور حواشی شامل ہیں اس کتاب میں ایک سو اڑتالیس خطوط ہیں، اور خود مصنف کا لکھا ہوا مقدمہ ہے، مقدمہ میں مصنف نے لکھا ہے "اگرچہ یہ خطوط منتشر خیالات اور ریاستی انتظامات کی پریشانیوں کے درمیاں لکھے گئے ہیں پھر بھی ان کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ اور دوستوں کی فرمائشوں سے

---

[1] ریاض الانشاء صفحہ ۱۴، [2] ایضاً مطبوعہ حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۴۸ء اور کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ مخطوطہ نمبر ۱۳ ورق ایک تا ۱۸۱۔

[3] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۵

مجبور ہو کر کچھ ایسے خطوط جن کے مسودے محفوظ تھے، اکٹھا کر دیئے گئے ہیں[41]

مناظر الانشاء[42] سے پتہ چلتا ہے، کہ محمود گاواں کو فن خطوط نویسی کی نہ صرف پوری پوری واقفیت تھی، بلکہ اس پر اسے مہارت حاصل تھی، وہ بڑا ذہین اور بلند خیال تھا، وہ حافظ قرآن بھی تھا، رسول اللہ کی حدیثیں منتخب اشعار اور ضرب الامثال کا استعمال بھی برمحل اور برجستہ کرتا تھا، اس نے ممتاز شاعروں کا گہرا مطالعہ کیا تھا، سے الفاظ کے صحیح استعمال کا پورا پورا علم تھا۔

محمود گاواں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے چنچے تلے اور پرمحل الفاظ کا استعمال کرتا تھا وہ بعض اوقات مقفیٰ عبارت بھی لکھ جاتا تھا، وہ عربی کے ادق الفاظ بھی استعمال کرتا تھا، جس سے کبھی کبھی عبارت گنجلک ہو جاتی تھی[43] اس زمانہ کا یہی اسلوب تھا محمود گاواں کا یہ بھی کمال ہے کہ عربی الفاظ کی کثرت استعمال کے باوجود وہ فارسی اسلوب نگارش کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اس کی مقفیٰ نثروں میں بھی مشکل الفاظ ملتے ہیں۔ تشبیہوں، استعاروں اور حوالوں کی کثرت استعمال کی وجہ سے اکثر اس کی تحریر غیر دلچسپ ہو جاتی ہے، اس کی تحریریں شوکت الفاظ کے لحاظ سے نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں، محمود گاواں کو اپنی انشا پردازی کی قدر و قیمت کا علم تھا، وہ ریاض الانشاء کے مقدمہ میں دعوی کرتا ہے اس کی تحریریں مقبول عام تھیں[44]، وہ کہتا ہے کہ اس کے مضامین اس کی ذہنی کاوش اور ادبی

---

[41] ریاض الانشاء، صفحہ ۱ تا ۲۔ بنابریں مکتوبے چند کہ مسودۂ آں از عوارض حوادث مجردہ زبان محفوظ ماندہ بود و مظنہ آں می شد کہ بعین رضائے اہل دانش ملحوظ گردد در سلک تالیف انتظام دادہ و آں کتاب ریاض الانشاء نام نہادہ۔ [42] مناظر الانشاء، ورق ۲۲ب تا ۲۳ الف [43] ریاض الانشاء دیکھیے خصوصاً مکتوبات نمبر ۹ تا ۱۰، ص ۲۰۸ تا ۲۰۹ [44] ایضاً ص ۱۱

رجحان کا نتیجہ ہیں، اس نے کسی دوسرے کے علم سے استفادہ نہیں کیا، بقول خود وہ علم وفضل میں ابن العمید اور صاحب بن عباد سے اور انشا پردازی میں ابن العزات سے کسی طرح کم نہیں[۱]،

چندیں وزیر کامل بودند نزد شاہاں	لیکن وجود فضلم بر جملہ ہست فاضل
ابن العزات طبعم در معرض عبارات	زابن العمید وصاحب گم نیست در فضائل

مولانا جامی نے بحیثیت مصنف اس کی عظمت کا اس طرح اعتراف کیا ہے:[۲]

نقرہائے نثر او نوبت دہ پشت ہنر

اس کا ہر خط ایک تمہید سے شروع ہوتا ہے، اس کی تمہید میں قرآن اور حدیث کے جواہر پاروں اور علم یا طبعیات یا فلسفہ، نجوم، تاریخ، جغرافیہ، علم تمدن اور شاعری کے حوالوں سے بھری پڑی ہیں، اس کے خطوط تاریخی معلومات کے قابل قدر ذریعہ ہیں، ان سے اس کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی بہمنی حکومت کا ہندوستان کی دوسری ریاستوں اور بیرون ہند کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات کیسے تھے، اس کے خطوط سے اس کی دیانتداری، پاکبازی، علم دوستی، عالموں اور درویشوں سے محبت، نسبی تفاخر، بادشاہوں کے ساتھ قرابت داری، میدانِ جنگ میں ثابت قدمی، اولوالعزمی اور عزیز واقربا سے محبت کا سراغ ملتا ہے، اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل وزیروں اور بادشاہوں کے نام لکھے گئے خطوط شامل ہیں،

---

[۱] ریاض الانشا، ص ۱۲ تا ۱۳ [۲] ایضاً ص ۴۶، سلطان محمود شاہ کی مدح میں لکھے گئے قصیدہ کا شعر نمبر ۴۴ اور ۴۷ (ص ۱۴۳ تا ۱۵۰)

[۳] ریاض الانشا ص ۵۴،

[۴] مکتوب نمبر ۱۳، (صفحہ ۷۵ تا ۷۷) بنام شاہ مصر عربی میں ہے،

(۱) شرف الملک وزیر مالوہ صدر بن کبیر (۲) صدر الدین شرف جہاں (۳) امیر جان شاہ اللاری (۴) وزیر سلطان روم محمود شاہ رومی (۵) سلطان روم سلطان محمد (۶) گیلان کے سلطان علاء الدین (۷) گیلان کے سلطان محمد بن سلطان ناصر (۸) گرگان کے سلطان ابوسعید (۹) عراق کے سلطان حسین بیگ (۱۰) جونپور کے سلطان حسین شاہ (۱۱) گجرات کے سلطان محمود (۱۲) مالوہ کے سلطان محمود خلجی،

خطوط میں علما کے مندرجہ ذیل نام ملتے ہیں۔

(۱) مولانا شرف الدین علی یزدی (۲) شمس الدین محمد لاری، (۳) مولانا ابوسعید (۴) صدر جہاں قاضی شرف الدین، (۵) مولانا عبدالرحمن جامی، (۶) مولانا ابوبکر تہرانی (۷) شیخ محمود منداوی (۸) مولانا کمال الدین رومی (۹) مولانا اسمٰعیل (۱۰) علامہ نورالدین عبداللہ،

کچھ خطوط مندرجہ ذیل درویشوں کے نام بھی ہیں،

(۱) خواجہ عبید اللہ (۲) مولانا نعمت اللہ (۳) شیخ صدرالدین الرواسی

مولانا عبدالرحمن جامی کے نام لکھے گئے ہیں، خطوط بہت دلچسپ ہیں،

ان خطوط سے اس نے مولانا کو ہندوستان آنے کی رغبت دلائی ہے، اور ان کے پاس تحفے بھیجے ہیں، (باقی)

بزم تیموریہ

کیثیت اضافوں کے ساتھ دوسرا ضخیم ایڈیشن، قیمت ۳۵-۱۲

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن

"منیجر"

تلخیص وتبصرہ

اصحابِ کہف

از

مولوی محمد عمیر الصدیق صاحب ندوی

اصحابِ کہف کا واقعہ اپنے ابہام و اجمال کی وجہ سے مفسرین کے لئے ہمیشہ سے تحقیق و تشریح کا موضوع رہا ہے، اصحابِ کہف کون تھے؟ ان کا واقعہ کب اور کیسے پیش آیا؟ اور اس کہف (غار) کی جائے وقوع کہاں ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین نے مختلف روایتیں نقل کی ہیں، اسرائیلیات سے قطع نظر بعض اہلِ تفسیر نے تاریخ اور قیاس کی مدد سے بھی اس عقدہ کی گرہ کشائی کی کوشش کی ہے، صاحبِ روح المعانی نے محلِ وقوع کی نشاندہی کی بھی کچھ سعی کی ہے لیکن پھر بھی بات واضح نہیں ہو سکی ہے، بعض یورپین مورخین نے ایک سریانی ماخذ کا بھی ذکر کیا ہے، اور زمانہ حال کے بعض مفسرین نے پرانی تفسیری روایت سے اس کی مشابہت ثابت کی ہے، مگر وہ سریانی ماخذ خود محلِ نظر ہے،

اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ کہف کی تفسیر میں اس پہلو پر بھی توجہ کی ہے، اُن کی رائے یہ ہے کہ رقیم اصحابِ کہف کی وہ بستی ہے جو ایلہ (عقبہ) اور فلسطین کے درمیان واقع ہے اور جو بعد کو پٹیرا (بطیرا) کے نام سے مشہور ہوئی، پہلی جنگِ عظیم کے بعد آثارِ قدیمہ کے سلسلہ میں جو تحقیقات ہوئیں، ان کی روشنی میں انھوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ اگر

جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں، اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے، یہ علاقہ کبھی نبطی قبائل کے زیر اقتدار تھا اسی علاقہ کی ایک پہاڑی سطح پر رقیم شہر آباد تھا دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کرلیا، تو رقیم کی حیثیت بھی ایک رومی آبادی کی ہوگئی، اسی زمانہ کے جب پیٹرا کے نام سے اس کے عظیم الشان معبدوں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی ۶۳۶ء میں جب مسلمانوں نے اس علاقہ کو فتح کیا تو رقیم کا نام زبانوں پر کم اور بطرا کا نام زیادہ مشہور تھا، جنگ عظیم کے بعد از سر نو اثری پیمایش سے نئی نئی باتیں روشنی میں آرہی ہیں، از انجملہ اس علاقہ کے عجیب غریب غار ہیں جو دور تک چلے گئے ہیں، اور نہایت وسیع ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ دن کی روشنی کسی طرح ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی،

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا، اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام الرقیم بتا دیا ہے، اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کئے جائیں، اس کے علاوہ مولانا نے دوسرے قرائن بھی اپنے دعوی کے اثبات میں پیش کئے ہیں، ترجمان القرآن کی اشاعت کو چالیس برس سے زیادہ ہوگئے ہیں، اس اثنا میں تحقیق کا قدم آگے بڑھتا رہا، نومبر ۱۹۶۱ء کے رسالہ العربی نے لکھا ہے کہ اردن کے محکمہ آثار قدیمہ نے چند برس پیشتر عمان سے سات کیلو میٹر جنوب میں رکیب نامی ایک گاؤں میں تحقیقات کا آغاز کیا، رکیب رقیم کی ہم آہنگی خود ظاہر کرتی ہے کہ یہ آج کا رکیب قدیم رقیم ہو سکتا ہے رابطۃ العلوم الاسلامیہ کے صدر استاذ رفیق مطابق ۱۹۶۲ء میں بطرا کے علاقہ میں ایک غار کا پتہ چلا، فوراً ایک ٹیم وہاں پہنچی، اور ایک طویل تلاش و جستجو کے بعد مندرجہ ذیل حقائق کا انکشاف ہوا،

۱۔ غار کے اندر بازنطینی زمانہ کے نقوش، زیورات، اور سکے ملے، یہ بازنطینی عہد تیسری صدی عیسوی کا ہے، جو بازنطینی زمانۂ سلطنت ہے۔ ان سکوں سے (جو چاندی کے ہیں) قرآن مجید کی آیت فابعثوا احدکم بورقکم ھذہٖ الی المدینۃ (اچھا ایک آدمی کو (چاندی کا) سکہ دیکر شہر بھیجو) کا مفہوم بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔

۲۔ غار میں، قبریں اور کتے کی بھی قبر ملی، (ویقولون سبعۃ وثامنھم کلبھم لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے، اور آٹھواں ان کا کتا تھا،

۳۔ قبروں کی موجودگی کے علاوہ سات انسانی سر ملے، اور ان کے ساتھ ایک ایسا سر بھی ہے جو کتے کا معلوم ہوتا ہے،

۴۔ قریب ہی ایک معبد بھی موجود ہے، خیال ہے کہ یہ وہی معبد ہے جسے قرآن مجید نے مسجد کے نام سے تعبیر کیا ہے، قال الذین غلبوا علیٰ امرھم لنتخذن علیھم مسجداً (جو لوگ ان کے معاملات پر غالب آگئے انھوں نے کہا ہم ضرور ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے) اس معبد کے آثار میں چند ستون ہیں، جو بالکل صحیح حالت میں موجود ہیں،

استاذ طبیان نے یہ بھی تبلایا کہ پتھروں اور مٹی کے ہٹائے جانے اور صاف کرنے کے بعد ایک سوراخ دار پتھر کا بڑا سا ڈھکن نظر آیا، اسے ہٹانے کے بعد غار کا اندرونی حصہ صاف طور سے سامنے آگیا، یہ تقریباً ۳×۴ میٹر کشادہ جگہ تھی، یہاں قرآن حکیم کی حقانیت پھر واضح ہوکر رہی، جس نے صدیوں پہلے وھم فی فجوۃ منہ (اور وہ غار کے اندر ایک کشادہ جگہ میں ہیں) کہکر خبر دی تھی،

استاذ طبیان کے قول کے مطابق قرآن کی بیان کردہ تمام صفات اس جگہ منطبق ہوتی نظر آتی ہیں، آج بھی وہاں آفتاب طلوع کے وقت غار سے اس طرح گزرتا ہے کہ

دھوپ غار کے اندر نہیں پہونچتی، غروب کے وقت بھی اُس کی شعاعیں غار کے اندر نہیں جا پاتیں اس طرح قرآن کی یہ صداقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے واذا طلعت تزاور عن کھفھم ذات الیمین واذا غربت تقرضھم ذات الشمال، (سورج) جب نکلتا ہے تو اُن کے داہنے جانب سے ہٹا رہتا ہے، اور جب ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کترا کر نکل جاتا ہے،

یہ انکشاف عقلی اور تاریخی بیانات کے اعتبار سے قابلِ قبول ہو سکتا ہے لیکن ابھی اسے حرفِ آخر نہ سمجھنا چاہئے، آثار قدیمہ کی مزید تحقیقات سے ممکن ہے کچھ گوشے اور واضح ہوں،

ارض القرآن

حصہ اول

قرآن مجید کی عرب سے متعلق آیات کی تفسیر، سرزمین قرآن کا جغرافیہ، اور جن عرب قوموں اور قبیلوں کا قرآن مجید میں ذکر ہے، اُن کی تاریخی و اثری تحقیق،

قیمت:- ۱۰-۰-۰

ارض القرآن

حصہ دوم

بنو ابراہیم کی تاریخ، قبل از اسلام، عربوں کی تجارت، زبان اور مذہب برحسب بیان قرآن مجید و تورات، تاریخ یونان و روم، تحقیقات و مباحث،

قیمت:- ۶-۹-۰

"منیجر"

شاہ عز الدین پھلواروی ندوی

شاہ عز الدین پھلواروی علمی اور دینی حلقوں کے لئے محتاج تعارف نہیں، اپنے مواعظ اور تصانیف کی وجہ سے خاصے معروف ہیں، ابھی چند ہی مہینہ کی تو بات ہے جب انھیں عربی زبان اور اسلامی علوم میں مہارت کی بنا پر حکومت ہند نے اعزاز عطا کیا تھا، اور معارف نے اس سلسلہ میں انھیں مبارکباد دی تھی، کسے معلوم تھا کہ وہ اتنی جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے،

ادھر کچھ عرصہ سے ان کی صحت مضمحل رہنے لگی تھی، اس لیے انھوں نے سفر ترک کر دیئے تھے لیکن پورنیہ کے کچھ لوگ اُن کے بید معتقد تھے، ان کی آرزو تھی کہ وہ اپنی تشریف آوری سے انھیں عزت بخشیں، اور انھیں اپنے مواعظ سے مستفید فرمائیں، شاہ صاحب نے ناسازی مزاج کا عذر کیا، مگر جب معتقدین کا اصرار جاری رہا تو آمادہ ہو گئے تاکہ ان کے دلوں کو ٹھیس نہ پہونچے، مومن کے دل کو خوش کرنا بڑے ثواب کا باعث ہے، انھیں اس سلسلہ میں آقائے دوجہاں کی ہدایات یاد تھیں، اس لئے اپنی تکلیف کو نظر انداز کر کے آمادۂ سفر ہو گئے، راستہ بخیر گذرا، پورنیہ پہونچ کر بھی ایک آدھ دن طبیعت ٹھیک رہی لیکن پھر ضعف کیساتھ درد سینہ کی شکایت محسوس ہوئی جو برابر بڑھتی رہی، جب مقامی دوا دارو سے طبیعت قابو میں نہ آئی تو لوگ کسی بڑے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے شہر گئے، مگر ساری تگ و دو بیکار ثابت ہوئی اور

بالآخر وطن سے دوری اور عزیزوں سے مجبوری کے عالم میں جان جان آفریں کے سپرد کردی، نعش پھلواری لائی گئی، اور خاندانی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے، وہ مجھ سے عمر میں چند سال بڑے تھے تعلیم میں بھی دو تین درجے آگے تھے لیکن طلبائے ندوہ کی انجمن الاصلاح میں میرا ان کا عرصہ تک ساتھ رہا، اور ایک سال ان کے دور نظامت میں اُن کی نیابت کا موقع بھی ملا، اس طرح عمر اور درجہ کے فرق کے باوجود اکثر نشست و برخاست اور تبادلۂ خیالات میں ساتھ رہتا، وہ مزاج کے نرم تھے، اور اپنے دوستوں کے ساتھ نباہ کرنے کا اچھا سلیقہ تھا، زود حس بہت تھے، اس لئے بعض اوقات معمولی بات بھی گرانی طبع کا باعث ہو جاتی، مگر حتی الامکان ظاہری برتاؤ میں فرق نہ آنے دیتے، مزاج میں رواداری اور دوست نوازی بہت تھی، طالب علمی کے بعد جب انھیں تعلیم و تدریس کی خدمت سپرد ہوئی، تو اس زمانہ میں کئی برس میرا ان کا ساتھ رہا، مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی شکر رنجی کی نوبت آئی ہو، میرے ان کے خیالات میں خاصہ فرق تھا، بسا اوقات اختلافی مسائل زیر بحث بھی آجاتے لیکن یاد نہیں پڑتا، کہ کبھی تکدّر یا ملال خاطر کی نوبت آئی ہو،

وہ پھلواری کے اس مشہور دینی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلہ مخدوم شاہ مجیب اللہ سے ملتا ہے، آخری زمانہ میں اس سلسلہ کے دو نامور بزرگ حضرت شاہ بدرالدین، اور مولانا شاہ سلیمان بہت مشہور ہوئے ہیں، شاہ بدرالدین بہار کے پہلے امیر شریعت تھے، جن کے اثر سے امارت شرعیہ کو استحکام حاصل ہوا، شاہ سلیمان اپنی جادو بیانی کے لئے سارے ملک میں مشہور تھے، اُن کے مواعظ عوام و خواص دونوں میں مقبول تھے، شاہ عزالدین ان دونوں سلسلوں سے تعلق رکھتے تھے، وہ شاہ سلیمان کے نواسے اور شاہ بدرالدین کے صاحبزادے شاہ محی الدین امیر شریعت دوم کے داماد تھے

ان دونوں بزرگوں سے انھوں نے اکتساب فیض کیا، اور دونوں سے اجازت حاصل کی، سلسلہ کے اذکار و اشغال سے عملی واقفیت کے علاوہ تصوف میں ان کی علمی نظر بھی بہت گہری تھی، وہ اس کی تاریخ، اکابر صوفیہ کے حالات، اصحاب سلاسل کے واقعات، اور اُن کے معمولات و مختارات سے بخوبی آگاہ تھے، ان مسائل پر جب اُن سے گفتگو ہوئی تو نہیں بہت باخبر پایا،

یوں تو سب ہی سلسلوں سے ان کا تعلق تھا، مگر نسبتِ قادریہ کا غلبہ تھا، خاندانی اعراس و مراسم میں شریک ہوتے تھے، اس بارہ میں ان کا ایک خاص ذوق تھا لیکن سکر پر صحو ہمیشہ غالب رہا، محفل سماع میں شرکت اور وجد و حال کی کیفیت کے باوجود صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے،

میں کبھی کبھی اُن کے اس وجد و حال پر کچھ کہتا تو مسکرا کر کہتے، ؎

ع : ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

انھیں طالب علمی ہی کے زمانہ سے عربی ادب کا خاص ذوق تھا، اور بے تکلفی سے عربی بولتے اور لکھتے تھے، اُن کے عربی مضامین شائع بھی ہوتے تھے، یاد آتا ہے کہ ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں اُن کا ایک تحقیقی مضمون مصر کے مشہور رسالہ "الزہراء" میں شائع ہوا تھا، ندوہ میں عربی ادب کی اہم کتابیں پڑھاتے تھے، لیکن اس کے ساتھ دینی علوم سے بھی تعلق تھا، اور حدیث و تفسیر کے کچھ اسباق بھی پڑھاتے تھے، اسی ذوق نے اُن سے حدیث کی تاریخ، اور حیات امام احمد بن حنبلؒ لکھوائی، کچھ اور کتابیں بھی انھوں نے لکھیں جن میں سے بعض چھپ گئی ہیں، اور بعض کے مسودے اُن کے ہاں موجود ہوں گے، ندوہ میں کئی برس تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد پھر وہ مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کے استاد مقرر ہوئے، اس کے علاوہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقی

کام بھی کیا، ندوہ سے جانے کے بعد کئی بار لکھنؤ، دہلی، اور اعظم گڈھ میں اُن سے ملاقات ہوئی جب ملتے تو طالب علمی اور ندوہ کی مدرسی کے زمانہ کی بے تکلف صحبتیں یاد آجاتیں کبھی کبھار پرخلوص خط بھی لکھتے، گذشتہ سال جب حکومت ہند کے ایوارڈ پر میں نے انھیں مبارکباد کا خط بھیجا، اور پھر معارف میں ایک نوٹ لکھا تو بہت خوش ہوئے، لکھا تھا کہ اعظم گڈھ آنے کا ارادہ ہے لیکن اجل نے اس کا موقع نہ دیا، اللہ سے دعا ہے کہ وہ اُن کے اعمال صالحہ کو قبول فرمائے، اور اپنی رحمت سے انھیں شاد فرمائے، خدا ان کی اہلیہ صاحبزادیوں اور اعزہ و احباب کو صبر عطا فرمائے، اور توفیق دے کہ وہ اُن کے نیک کام کو نہ صرف باقی رکھیں، بلکہ انھیں اور چار چاند لگائیں۔ (ع۔ ق)

مولانا مفتی محمد عتیق فرنگی محلی

مولانا مفتی محمد عتیق کا سانحۂ وفات بھی مذہبی اور علمی حلقوں کے لئے باعثِ رنج و افسوس ہے ہرچند کہ وہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، اور عرصہ سے بیمار رہتے تھے لیکن اس قحط الرجال کے زمانہ میں ان کا دم بسا غنیمت تھا، وہ فرنگی محل کے اُس خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جس نے کئی سو برس تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت کی شمع روشن رکھی ہے، اس خاندان کے فیوض و برکات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی مستفید ہوتے رہے ہیں مُلّا نظام الدین کا مجوزہ نصاب تعلیم ایسا مقبول ہوا کہ سینکڑوں برس سے عربی مدارس میں رائج ہے، اور درس نظامی کی تکمیل دستار فضیلت کے حصول کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے، اس دو ڈھائی سو برس میں ساری دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا، اور تعلیمی نصاب میں غیر معمولی ردّ و بدل ہوا، لیکن ہندوستان میں عربی مدارس کی بڑی تعداد

اب بھی درسِ نظامی پڑھی ہوتی ہے، یہ ملا نظام الدین اور اُن کے جانشینوں کے خلوص اور
کمالِ علم و عمل کا اثر ہے کہ عوام و خواص سب اس خاندان کی حلقہ بگوشی کو باعثِ فخر
سمجھتے رہے، ملا بحر العلوم نے جب جنوبی ہند کا رُخ کیا تو نواب ارکاٹ استقبال کے لئے
آگے بڑھے، اور اُن کی پالکی کو کاندھا دیا،

مولانا محمد عتیق صاحب اسی خاندان عالی کے ایک ممتاز فرد تھے، اس خاندان میں
علم و عمل کا ایسا اجتماع رہا کہ فرنگی محل دار العلم والعمل کہلایا، ملا نظام الدین علمی کمال
کے ساتھ شاہ عبد الرزاق بانسوی سے ارادت رکھتے تھے اسی طرح اس خاندان میں علم و معرفت
معقول و منقول اور فقر و درویشی کا ہمیشہ اجتماع رہا۔ مغربی علوم و فنون کی
چمک دمک سے بھی متاثر ہوئے، زمانہ کے حالات اور معاشی ضروریات نے بہتوں کو
جدید یونیورسٹیوں میں پہنچا دیا، فرنگی محل بھی اس سے محفوظ نہیں رہا، اور یہاں کے بھی
بہت سے افراد کالجوں اور یونیورسٹیوں کی زینت بن گئے، لیکن اب بھی پرانے بزرگوں
کے کچھ نام لیوا موجود ہیں، ان ثابت قدم اصحاب میں مولانا محمد عتیق صاحب خاص طور
سے قابلِ ذکر ہیں، انھوں نے بزرگوں کے نام کو حرزِ جاں بنائے رکھا، ان کے نقشِ قدم
کو دلیلِ راہ سمجھتے رہے، اور بادِ مخالف کے تیز جھونکوں میں تعلیم و ارشاد کی اس شمع کو
روشن رکھنے کی کوشش کی جو بزرگوں نے جلائی تھی، اور اللہ کا نام لے کر ساری زندگی
اسی راہ میں بسر کر دی، وہ پرانے بزرگوں کی آخری نشانی تھے، ان کو دیکھ کر اور ان
سے مل کر فرنگی محل کی پرانی محفلیں یاد آجاتی تھیں، اگرچہ پیرانہ سالی کی بنا پر عرصہ سے
گوشہ نشین تھے، مگر پھر بھی اُن کے ساتھ لوگوں کی محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ شرعی
معاملات میں سارے اودھ کو اُن کے فتویٰ کا انتظار رہتا تھا، اور جب تک ان کی طرف

علان نہ ہوجاتا لوگوں کو اطمینان نہ ہوتا، اسی اعتماد و اعتقاد کا اثر تھا کہ جب اُن کی وفات کا اعلان ہوا تو لکھنؤ میں دوکانیں بند ہوگئیں، اور لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر نمازِ جنازہ میں شرکت کے لئے دوڑ پڑے، مستند اخبار نویسوں کا اندازہ ہے کہ جنازہ کے ساتھ تقریباً دو لاکھ اشخاص تھے،

حکومت نے بھی انکے اسی ہمہ گیر اثر کا اعتراف کیا، اور گورنر کی طرف سے تربت پر پھول چڑھائے گئے، لکھنؤ سے باہر کے علمی اور دینی حلقوں نے تعزیتی جلسے کئے، اور قرآن خوانی کے ذریعہ اُن کی روح کو ثواب پہنچایا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی علمی و دینی خدمات قبول فرمائے انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے، ان کے مراتب بلند فرمائے، ان کے صاجزادگان اور متعلقین کو صبر عطا فرمائے، اور اُن کے اعمال جلیلہ کو نصب العین بنانے کی توفیق نصیب فرمائے،

(ع - ق)

آہ پروفیسر اختر اورینوی

گذشتہ اپریل میں بہار کے پروفیسر ڈاکٹر اختر اورینوی کی وفات کی خبر بہت دکھ اور غم کے ساتھ سنی، ہم دونوں ہم درس اور ہم جماعت تو نہیں رہے، لیکن ہماری طالب علمی کا زمانہ ایک ہی تھا، وہ شروع میں سائنس کے طالب علم تھے، آئی ایس سی کرکے پٹنہ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے، مگر وہاں ان کی صحت خراب ہوئی تو انکی اور رانچی کے سینی ٹوریم میں رہ کر صحت یاب ہوئے، میڈیکل کالج چھوڑ کر پٹنہ کالج میں آرٹس کی تعلیم حاصل کرنے لگے، ہم دونوں ۳۶ء میں ایم اے اردو کے امتحان میں ساتھ شریک تھے، اس کے نتیجہ میں ان کا نام سرفہرست تھا، میرا نام اُن کے بعد تھا، وہ ایم اے کرنے کے بعد پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرار ہوئے، اس زمانہ میں ڈاکٹر سید محمود مرحوم بہار کے وزیر تعلیم تھے

وہ کالج میں اردو کے ایک لائق استاد کے تقرر کے خواہش مند تھے، اسلئے انھوں نے امیدواروں کا انٹرویو خود لیا، درجہ میں باضابطہ سبق پڑھانے کو بھی کہا، اختر اورینوی صاحب اُن کے معیار پر پورے اُترے، وہ ایک استاد کی حیثیت سے طلبہ میں بہت مقبول رہے۔ جو نہ صرف اُن کی صلاحیت اور قابلیت، بلکہ ان کے ذاتی اوصاف کی بھی قدر کرتے، آخر میں وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر ہو گئے تھے انھوں نے اردو زبان و ادب کے ارتقا پر ایک مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی، بہار کے جن شاعروں، مصنفوں اور نقادوں پر اس وقت تک سیر حاصل بحث نہیں ہوئی ہے، اس کی تلافی ان کے مقالہ سے ہو گئی، اور وہ بھی ایک اچھے مصنف کی صف میں داخل ہو گئے، اس کے بعد سے جب ان کا کوئی مقالہ کہیں شائع ہوتا، تو اردو کے ادبی حلقہ میں شوق سے پڑھا جاتا، انھوں نے اپنے مقالات کے مجموعے تنقید جدید، قدر و نظر اور تحقیق و تنقید کے نام سے شائع کئے، اس طرح اردو کے اچھے نقاد بھی شمار کئے جانے لگے،

وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے، ان کی بیوی شکیلہ اختر نے بھی اُن کے ساتھ افسانے لکھنے شروع کئے، دونوں نے رومانی دنیا کے دلوں کی دھڑکنوں کی اچھی عکاسی کی، انھوں نے کچھ ڈرامے اور ناولٹ بھی لکھے، وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، ان کی بعض نظمیں مثلاً جگنو، ایک مجاہد فلسطین کے افکار، ارمغانِ شباب اور نغمے مقبول ہیں،

بہار میں اس وقت ایک اچھا علمی و ادبی ماحول پیدا ہو گیا ہے جمیل مظہری صاحب شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے، جناب قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی علمی تحقیق و تدقیق سے بڑی ناموری حاصل کی، پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی تحریروں سے اردو کی ادبی دنیا میں بڑی ہلچل پیدا کر دی ہے، پروفیسر حسن عسکری نے تذکرہ نویسی میں

منوالیا ہے، پروفیسر سید حسن نے اپنی سنجیدہ مقالہ نگاری سے علمی حلقہ کو اپنی طرف مائل کر لیا ہے، پروفیسر عطا کاکوی اپنے ذوق شعر و ادب کی وجہ سے مقبول ہیں،
کلیم عاجز صاحب کی شاعری بھی مقبول ہو رہی ہے، اسی بزم کے ایک ممتاز رکن پروفیسر اختر اورینوی بھی تھے، پٹنہ میں رہ کر ہندوستان کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کو اپنی طرف کھینچتے رہے، جعفر علی خاں اثر جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری حفیظ جالندھری اور ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ ان کے مہمان رہے، طبیعت میں سادگی تھی، ان کو اپنے مہمانوں کو مٹی کے برتنوں میں زمین پر چٹائی بچھا کر کھانا کھلانے میں کوئی عذر نہ ہوتا، مگر ان کی بیوی مہمانوں کی خاطر تواضع پوری شان سے کرنا پسند کرتیں، اختر صاحب ان سے یہ کہکر اختلاف کرتے، "میں کوئی نواب کا ناتی تھوڑے ہی ہوں جو اپنی شان دکھاؤں، بس میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا"

ان کی زندگی کے کچھ واقعات یاد رکھنے کے لائق ہیں، ایک غریب لڑکی کی تجہیز و تکفین کا سامان نہ تھا، تو انھوں نے اپنی بیوی کے سونے کے کڑے بیچ کر یہ سامان کردیا اسی طرح ان کے ایک عزیز دوست کو اپنے والد کے لئے مقدمے کی فیس جمع کرنے کو کچھ روپے کی ضرورت تھی، اس کا ذکر ان سے اس وقت آیا، جب ان کی جیب خالی تھی، اُن کو اپنے امتحانات میں سونے کے جتنے مڈل ملے تھے، ان کو اونے پونے فروخت کرکے روپے اپنے دوست کے حوالے کر دئے،

وہ وہاں جا چکے جہاں سب کو جانا ہے، مگر بہار کے علمی و ادبی حلقہ میں ایک قابل قدر مصنف، نقاد، شاعر، افسانہ نگار، اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے برابر یاد کئے جائیں گے،
وہ بہار کے ضلع مونگیر کے ایک گاؤں اورین کے رہنے والے تھے ان کا خوشحال خاندان

جا جنرل زیدی سادات سے تھا جو مرزا غلام احمد کا پیرو ہو گیا، اس حیثیت سے وہ احمدی تھے، اپنے مسلک کی تبلیغ بڑی سرگرمی سے کرتے رہتے، پاکستان میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو ان کے قریبی دوستوں کا بیان ہے کہ ان کو بڑا دکھ ہوا، ان کی افسانہ نگار بیوی نے ان کی زندگی میں لکھا تھا کہ وہ ابھی زندگی سے کوسوں دور رہے، سمجھ میں نہ آنے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے والے شوہر ہیں، مگر اسی کے ساتھ اس کا بھی اعتراف کیا تھا، کہ جب اُن کے ساتھ گھر کے سارے لوگ ایک ہی ساتھ کھانا کھایا کرتے، تو ایسی مزیدار باتوں کا سلسلہ چلتا کہ گیارہ بارہ بجے تک محفل جمی رہتی، جو ٹھے ہاتھ سوکھ کر جھڑ جاتے پھر بھی کسی کا جی پلنگ پر جانے کو نہیں چاہتا"۔ اُن کے احباب بھی ان کی گفتگو کی بذلہ سنجی، زندہ دلی، اور خوش مذاقی کے قائل تھے، ان کی صحت ہمیشہ خراب رہی، آخر میں اُن کی قوت گویائی بھی ختم ہو گئی تھی، اُن کی بیوی کو اُن کی ضد اور چڑچڑاہٹ سے شکایت رہی، مگر انھوں نے ان کے ساتھ جس وفاداری سے زندگی بسر کی، وہ ایک افسانہ کا موضوع بن سکتا ہے، اُن کے کوئی اولاد نہ تھی، مگر وہ اپنی سوگوار بیوی کے دل و دماغ پر اپنی یادیں اس طرح چھوڑ گئے ہیں، کہ ع :- (ص ۔ ع)

مخملیں سبزے پہ جیسے برگِ گل کی ہو بچھاڑ

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہدِ مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی دلچسپ اور دلکش کن داستان تاریخ کے مستند ماخذوں اور حوالوں سے پیش کی گئی ہے،

قیمت ۱-۰۰ ۵

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

بیاضِ مریم:۔ از سکندر علی وجد ضخامت ۱۳۰ صفحے، کاغذ و طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی قیمت: بارہ روپے،

جناب سکندر علی وجد اردو کے مشہور اور مایۂ ناز شاعر ہیں، جو کسی تعارف کے محتاج نہیں، اس وقت اُن کی عمر تقریباً ۷۴ سال کی ہوگی، پہلے حیدرآبادی تھے، اب مہاراشٹری ہیں، ۱۹۱۴ء میں بیجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، جو اس وقت نظام حیدرآباد کی ریاست میں شامل تھا، اب یہ مہاراشٹر میں ہے، عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی سشن جج کے عہدہ پر فائز رہے، پنشن پانے کے بعد کسی حال میں اپنے کو معمر اور بوڑھا سمجھنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے، عروس سخن سے ہمکنار رہ کر اپنے طوفان جوانی کی موجوں کو یاد کرتے رہے، اسی لئے اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں،

دہ نقشِ حسین غزل سراپا   ہر خط میں رواں رواں لہو ہے

اپنی شاعری پر یہ کہکر تبصرہ کیا ہے،

وجد کرتا ہے کچھ ایسی باتیں   پیکر صدق و صفا ہو جیسے

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں:۔

وجد ہر شعر حسن کا پیکر   شاعری ہے کہ حسن کاری ہے

اپنی خاکساری میں یہ بھی کہہ گئے ہیں، ع

ع :- تیں حسن سخن وجد کس شمار میں ہے،

مگر اب تو ان کا یہ درجہ ہے کہ کسی کو اپنی صف میں شمار کریں، تو اس کے لئے باعثِ فخر ہو

ان کے خیال میں شاعری کا یہ معیار ہے،

فکر کی آگ میں بنتا ہے سخن　　　حرفِ پرسوز دعا ہو جیسے،

شاعری وہ ہے کہ دریاؤں کے نام　　　کوہساروں کی صدا ہو جیسے،

غزل کی یہ تعریف کی ہے،

تخیل کو تکلم دینے والے،　　　غزل، عکسِ رُخِ جانانہ ہو جائے،

اسی کو دوسرے انداز میں کہتے ہیں،

اے وجد یہی ایک ہے تعریفِ غزل کی　　　تصویرِ دل آویزیِ اندازِ محبت

یہی کہتے ہیں :-

ہر غزل بنتی ہے شمشیرِ دو دم　　　حسن اور گلزاروں کے بیچ

ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں :

وہی دراصل غزل ہے جس میں　　　تیغ و پازیب کی جھنکار ملے

یعنی ان کو غزل میں لہو ترنگ اور جل ترنگ دونوں کی تلاش ہے، اس کو یہ درجہ دیا ہے،

وجد اردو کی آبرو ہے غزل　　　یہ نوازش ترے وطن کی ہے،

زیرِ نظر مجموعۂ کلام سے پہلے اُن کے تین مجموعے لہو ترنگ (سنہ ۱۹۴۳ء) آفتابِ تازہ (سنہ ۵۲) اور اوراقِ مصور (سنہ ۱۹۶۲ء) میں نکل چکے ہیں۔ ان کا چوتھا مجموعہ بیاضِ مریم کے نام سے سنہ ۱۹۰ء میں شائع ہوا، اس کے متعلق خود ہی کہتے ہیں،

کہکشاں ہے کہ بیاضِ مریم جگمگاتے ہوئے اشعار ملے،

اس میں اُن کی غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی، اور کچھ ایسے اشعار بھی ہیں، جو قوافی اور ردیف کی پابندی سے آزاد ہو کر لکھے گئے ہیں،

اُن کی غزلیں سہل ممتنع کی بہت اچھی مثالیں ہیں، ایسے آسان لیکن پر کیف اشعار ایک قادر الکلام شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔

کانٹوں میں جو ہنس رہا ہے پیہم وہ پھول چمن کی آبرو ہے،
آئینہ رُخوں کی بے نیازی اے وجہِ حجاب آرزو ہے،
یوں تجھے یاد کیا کرتا ہوں تو مجھے بھول گیا ہو جیسے

باخبر ہو کے کیا ہوا حاصل کام آئی یہاں تو بے خبری
ہجر میں اور کچھ تو کر نہ سکے ہم نے تاروں سے شب کی مانگ بھری
آنسو ہی نہیں پردہ در رازِ محبت خاموش تبسم بھی ہے غمازِ محبت
حسن اک پھول کھلا ہوا جیسے عشق خاموش چتا ہو جیسے
جو مروّت میں مرنے کو تیار ہے کیا کرے گا محبت اگر ہو گئی

کچھ غزلیں قدیم اساتذہ کے رنگ میں بھی ہیں، سودا کے رنگ کی جو غزل ہے اس کا ایک شعر یہ ہے،

عمر بھر ہر زخمی تیرِ نظر بے خطر پھرتا ہے تلواروں کے بیچ

غالب کے انداز میں جو غزل کہنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا ایک شعر یہ ہے :-

موت سے ہم نے جیت کی بازی — زندگی دوستی میں ہاری ہے

ان غزلوں میں کہیں کہیں سیاسی خلش کا بھی اظہار ہو گیا ہے، مثلاً

انھیں اب ستا کے کریگا کیا انھیں اب مٹا کے کرے گا کیا،
وہ جو کل تلک تھے جہاں پناہ تری پناہ میں آگئے

کوئی کچھ تو کہہ نہ سکا مگر ہوئی عام جبر کی ہر خبر
ترے ظلم و جور کے حادثے مری ایک آہ میں آگئے

کہیں کہیں عارفانہ رنگ کے بھی اشعار ملتے ہیں،

ترے جلووں میں جو گم ہو گیا ہے — خبر ہے کچھ تجھے اس بے خبر کی،

اپنی دنیا سے الگ اپنے زمانے سے جدا — حیرت انگیز مکاں اور زماں اور بھی ہیں
علم نے یوں تو بہت عقدۂ مشکل کھولے — راز گنجینۂ فطرت کے نہاں اور بھی ہیں

تیری دوری سے ہے خالی خالی — وقت بے برگ و نوا ہو جیسے

اس مجموعہ میں مارلن منرو، پھلواری، مہاتما گاندھی، اندرا گاندھی، اور صبح شالامار،
وغیرہ پر نظمیں ہیں، صبح شالامار اُن کی قادر الکلامی کا بڑا عمدہ نمونہ ہے، اس میں محاکات کی
بڑی اچھی مثال ملتی ہے، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:-

موجِ صبا نے صحنِ چمن میں — لہرائے پھولوں کے پرچم
ہلکی ہلکی نرم ہوائیں — ہلکے بادل، بارش کم کم
ساقی مدہوش جوشِ طرب میں — بخش رہا ہے، دولتِ بے غم
لرزاں ہے جاں بخش لبوں پر — حرفِ تمنّا، مبہم مبہم،
شوق نہیں محفل میں تنہا — حسن و جوانی مونس و ہمدم

اہلِ جنوں فردوس بداماں اہلِ خرد فی نارِ جہنم

وہ غزل خوانی اور نظم گوئی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ راہ زندگی سے گذر کر آوارہ لمحوں کو بھی ڈھونڈتے ہیں، اس لئے کبھی کبھی اپنے رنگ سے ہٹ کر کچھ ایسے اشعار اور نظمیں بھی کہہ جاتے ہیں جن میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی، اسی کا ایک نمونہ "امن کا پھول" ہے،

اس مجموعہ کی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے اس کی کتابت خود کی ہے جس طرح نجی طور پر لکھتے ہیں، اسی طرح پورے مجموعہ کی کتابت کر دی ہے، جہاں ان کی شاعری سے ان کے خیالات وجذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہاں اُن کی شان خط سے بھی اُن کی طبیعت کا مطالعہ ہو سکتا ہے، خط بہت ہی صاف ستھرا اور پاکیزہ ہے جس سے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اُن کی طبیعت میں صفائی ستھرائی اور پاکیزگی ضرور ہوگی،

مجموعہ میں حسین آرٹسٹ نے اُن کے بعض اشعار کو اپنے آرٹ کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کی ہے، اس کی خوبی آرٹسٹ ہی کی نظر میں دکھائی دے گی، عام ناظرین کو اُن کے سمجھنے میں اپنی بصارت اور بصیرت دونوں کو آزمائش میں مبتلا کرنا پڑتا ہے،

وجدؔ صاحب کا ایک مقطع ہے،

جنونِ وجدؔ کی دلکش حقیقت

بہت ممکن ہے اک افسانہ ہو جائے

یہاں جنون سے مراد اُن کی شاعری ہے، امید کہ اُن کی شاعری اک افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت بن کر رہے گی،

......ہ......

مطبوعاتِ جدیدہ

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء - مرتبہ جناب محمد ایوب صاحب قادری متوسط تقطیع
کاغذ اچھا، کتابت و طباعت بہتر صفحات: ۴۶۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۳۶ روپے
پتہ - پاک اکیڈمی ۱۴۱ وحید آباد، کراچی ۱۸

جناب محمد ایوب قادری، پاکستان کے بہت مشہور اہل قلم اور مصنف ہیں، ہندوستان کی تاریخ اور گذشتہ علما سے متعلق مستقل تصنیفات لکھ کر اور فارسی میں ہندوستان کی بعض اہم تاریخوں کے ترجمے اور کچھ نایاب مخطوطات کو ایڈٹ کر کے علمی حلقوں میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی ہے، ان کا قلم بڑا رواں دواں ہے، اس لیے بہت جلد کسی کتاب کے مصنف یا مترجم ہو جاتے ہیں، زیر نظر کتاب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے احوال و کوائف نو ابواب میں بیان کیے گئے ہیں انگریزوں نے اس جنگ کو غدر کے نام سے موسوم کیا، اور ان کے زمانہ میں اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں مصلحت کی بنا پر محبان وطن کی سیرت و کردار کو مسخ اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا، آزادی کے بعد صحیح نقطۂ نظر سے کتابیں لکھنے کا رجحان پیدا ہوا تو اردو اور انگریزی میں متعدد اہم کتابیں شائع ہوئیں مگر ابھی مزید کام کی ضرورت ہے ۱۸۵۷ء سے متعلق قدیم تحریریں اور دستاویزیں برابر ملتی جا رہی ہیں، اور ان سے نئے حقائق معلوم ہو رہے ہیں اس کتاب کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ اس میں اس طرح کے دستاویزوں اور تحریروں سے بڑی مدد لیگئی ہے، اور بعض کو بعینہ مع ترجمہ نقل بھی کیا گیا ہے، ابھی تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں

ان میں سے اکثر کا تعلق کسی خاص خطے اور شخص سے تھا، مگر اس کتاب میں مختلف علاقوں اور اشخاص کی سرگرمیوں اور جد و جہد کی سرگزشت بیان کی گئی ہے، پہلے باب میں بطور تمہید ۱۸۵۷ء میں ہونے والے واقعات کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس میں پہلے مفتی محمد عوض کے مختصر حالات اور بریلی میں برطانوی استبداد کے خلاف جہاد کا ذکر ہے، پھر سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین اور اس کے نامور اشخاص نیز وہابی تحریک اور رہنومان گڑھی (اجودھیا) کے واقعات درج ہیں، دوسرے باب میں روہیل کھنڈ کے اضلاع کے حوادث اور پانچویں باب میں وہاں کے آخری معرکوں کی داستان بیان کی گئی ہے، تیسرے باب میں دوآبہ گنگ وجمن کے اور چوتھے میں اودھ و کانپور کے واقعات قلمبند کئے ہیں، چھٹے اور ساتویں باب میں دہلی مرحوم کی تباہی کے المناک حالات وغیرہ ہیں، آٹھواں باب ۵۷ء سے متعلق نادر تحریروں اور قیمتی دستاویزوں اور نواں باب ١٦ اہم مجاہدین کے ولولہ انگیز حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، ہر باب میں قلمی کتابوں کے اقتباسات ترجمے کے ساتھ شامل ہیں، آزادی کے متعدد سورماؤں کے فوٹو اور بعض قلمی تحریروں کے عکس بھی دئے گئے ہیں، اس سے ۱۸۵۷ء کے واقعات و اشخاص کے علاوہ اس زمانہ کی علمی و ادبی کاوشوں کا پتہ بھی چلتا ہے، لائق مصنف نے جزائر انڈمان و نکوبار کے بعض جلا وطنوں کی علمی خدمات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، مگر اسکو ساتویں باب "سقوط دہلی، (۲)" میں خلط ملط کر دیا ہے، حالانکہ اس کا ایک علحدہ باب میں اور زیادہ تفصیل سے تذکرہ کرنا چاہئے تھا، بعض واقعات و اشخاص کے ذکر میں تکرار بھی ہو گیا ہے، ایک جگہ تعصبات کی طرح شہرات (ص ۲۰۰) لکھ گئے ہیں، اس سے قطع نظر کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، امید کہ یہ شوق سے پڑھی جائے گی۔

چند تحقیقی مقالے مرتبہ پروفیسر سید حسن صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، قیمت عہ، ناشر کتاب خانہ بانکی پور، پٹنہ

پروفیسر سید حسن سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کے مندرجہ ذیل تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے (۱) لکھنؤ سوا سو برس پہلے (۲) لکھنؤ کے چند نامور شعرا ایک پرانے روزنامچہ کی روشنی میں (۳) آتش سے نجات حسین خان صاحب کی ملاقات (۴) ماہنامہ مشتاق (۵) بہار کا ایک گمنام مصنف مولوی حسن علی (۶) اردو ادب میں کرشن بھگتی کی روایت (۷) اخبار پنچ بانکی پور کا پہلا سال، یہ مضامین پہلے مختلف رسالوں میں چھپ چکے تھے، اول الذکر تین مضامین پٹنہ کے ایک صاحب ذوق ادیب و شاعر نجات حسین خاں کے ایک قلمی روزنامچہ "سوانح لکھنؤ" کی مدد سے لکھے گئے ہیں، وہ گذشتہ صدی کے وسط میں امجد علی شاہ کے دور میں چہلم دیکھنے کے لیے عظیم آباد سے لکھنؤ آئے، یہ روزنامچہ اسی سفر کے مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے، پروفیسر سید حسن نے پہلے مضمون میں اس کی مدد سے لکھنؤ کی رنگارنگ زندگی کا مرقع پیش کیا ہے، اس میں وہاں کے بازاروں، دوکانوں، میلوں اور چہلم کے جلوس، اس زمانہ کے سیاسی و معاشرتی حالات اور اشیائے خوردنی کے نرخ وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرے میں خانصاحب نے اس زمانہ کے معروف شعرا آتش، دبیر، انیس، ضمیر، اور برق وغیرہ سے اپنی ملاقات کے علاوہ انکے حالات و کمالات بھی اجمالاً تحریر کئے ہیں، تیسرے میں آتش سے ملاقات کا مفصل ذکر ہے، اس میں آتش کے بارہ میں بعض ایسے معلومات بیان کئے ہیں جو عام تذکروں میں نہیں ملتے، چوتھے میں انیسویں صدی میں پٹنہ سے شائع ہونے والے ایک ماہنامہ اور ساتویں میں وہیں کے اخبار "پنچ" کے خصوصیات دکھائے ہیں اور مضمون نگاروں کے نام بھی تحریر کئے ہیں، ان سے گذشتہ صدی میں عظیم آباد کی ادبی و صحافتی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، پانچویں مضمون میں مولوی حسن علی کے حالات اور ادبی کارناموں پر بحث کی گئی ہے، چھٹا مضمون زیادہ اہم ہے اس میں بھگتی تحریک کا مختصر جائزہ لیکر اسکے اردو ادب پر اثرات کا مفصل ذکر ہے، یہ مضامین مصنف کے پختہ اور ستھرے ذوق کا ثبوت اور دلکش طرز تحریر کا نمونہ ہیں جو ارباب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

غالباً کتابت کی غلطی سے ایک جگہ اجراء (ص ۲۶) مونث اور "رود و روز" کے بجائے "دار و رود" (ص ۹۲) لکھ گیا ہے، ان کی ماہرانہ تحریر میں رسم کی جمع "رسومات" (ص ۶۳) بھی تعجب خیز ہے،

"ض"

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی، تحقیقی و ادبی، تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت، تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات [illegible] اہم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

مہاجرین جلد دوم قیمت: ۹-۱۲

سیر الصحابہ جلد ۶ " ۴-۹

امام حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں واقعۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل۔

سیر الصحابہ جلد ۷،

تابعین: ۹۹ اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۵۰-۱۲

تاریخ اسلام اول (عہد رسالت، خلافت راشدہ)

قیمت: ۵۰-۱۲

تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰۰-۱۱

تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول)

قیمت: ۰۰-۱۳

تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)

قیمت: ۰۰-۱۵

۹۔ اسلام اور عربی تمدن قیمت ۶۵-۱۵

۱۰۔ عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱۔ ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲۔ دین رحمت قیمت ۰۰-۱۰

۱۳۔ خریطۂ جواہر ۷۵-۴

زندگی کی آخری کتاب

۱۴۔ حیات سلیمان، یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات، واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا مثنی، دلکش، دلچسپ، قابل مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت ۵۰-۲۶

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف
اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ
اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چار دیواری
سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہونچ گیا ہے، مستشرقین کے جن جن
فضلار نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب و ان کی نگرانی
میں دار المصنفین کے رفقار محققین نے اُن کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دیئے ہیں، متفرق
پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں،

مکمل فائلوں کی تفصیل

۱۹۳۴ء   ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء

۱۹۶۱ء

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں،   "منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ"

.....٥٥✲٥٥.....